جھلستے جنگل
انور عظیم

جھلستے جنگل

(ناول)

(ناول)

انور عظیم

زیر اہتمام

تخلیق کار پبلشرز

104/B ـ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ـ ۱۱۰۰۹۲

ناول : جھلستے جنگل
مصنف : انور عظیم
پتہ : 104/A- پیراڈائز سوسائٹی، آئی۔پی۔ایکسٹنشن، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

ناشر : انیس امروہوی
○ تخلیق کار پبلشرز
104/B- یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲
سرورق : نسیم امروہوی
کمپوزنگ : رچناکار پروڈکشنز، نئی دہلی۔
مطبع : بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، تراہا بہرام خاں، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے

○ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
○ اہلووالیہ بک ڈپو، ۵/۹۹۸۸۔ نیو روہتک روڈ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۵
○ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

T.P.:087 ISBN-81-87231-11-4
JHULASTE JUNGAL (Novel) 1999
By ANWAR AZEEM Rs. 100.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B-YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR,DELHI-110092

اُن اَن گنت کرداروں کے نام
جنہوں نے زندگی کے جنگل کو
اپنے غم، سوز و درد،
نارسائیوں
اور ناسوروں کے شعلوں سے
روشن کیا
اور جو آگ کے کانٹوں پر
چل کر
اپنے سفرِ ناتمام
کے قصے سلگنے اور جلنے کے لیے
وقت کے سیل میں چھوڑ گئے
○○

انور عظیم کی تصنیفات

۱۔	پرچھائیوں کی وادی	(ناول)	۱۹۷۰ء
۲۔	قصہ رات کا	(افسانوی مجموعہ)	۱۹۷۲ء
۳۔	زوال کا عروج	(ڈراما/ترجمہ)	۱۹۸۶ء
۴۔	اجنبی فاصلے	(افسانوی مجموعہ)	۱۹۹۴ء
۵۔	جھلستے جنگل	(ناول)	۱۹۹۸ء
۶۔	مُردہ گھوڑے کی آنکھیں	(افسانوی مجموعہ)	زیر طبع
۷۔	لابوہیم	(افسانوی مجموعہ)	زیر طبع
۸۔	دھان کٹنے کے بعد	(افسانوی مجموعہ)	زیر طبع
۹۔	رات کے راہی	(ڈرامے)	زیر طبع

انور عظیم: افسانوی جمالیات کا فنکار

انور عظیم اس صدی کی تیسری دہائی میں بہار کے ایک دور دراز گاؤں پوکسی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم اپنی ماتر بھومی بہار ہی میں ہوئی۔ اس صدی کی پر آشوب پانچویں دہائی کے آخری برسوں میں کلکتہ کے روزنامے استقلال کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال کر انور عظیم نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ لیکن جلد ہی جامعہ ملیہ کی کشش انہیں دہلی لے آئی۔ موصوف نے کچھ عرصے مکتبہ جامعہ میں بھی کام کیا۔

اس دور میں جب افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے انور عظیم کا نام چمکا۔ انہوں نے متعدد اشاعتی اداروں کے لئے عالمی کلاسیکی ادب کے شہکاروں کو اردو کے قالب میں بھی ڈھالا ہے۔

انور عظیم کے متعدد افسانے اردو افسانوں کے مختلف انتخابات کا حصہ ہیں۔ تین ناولوں اور افسانوں کے دو مجموعوں کے علاوہ موصوف نے متعدد ڈرامے بھی لکھے ہیں، جنہیں ہندوستان کے مختلف ڈراما گروپس نے اسٹیج پر پیش کیا ہے۔ جن میں ہندوستان کا مایۂ ناز 'نیشنل اسکول آف ڈراما' بھی شامل ہے۔ دہلی ٹی وی کی پیش کردہ پہلی ٹیلی فلم "فخرو میاں" کی اسکرپٹ بھی انور عظیم کے قلم کی دین ہے۔ عظیم صاحب نے متعدد دوسرے غیر ملکی ڈراموں کے علاوہ برتولت برخت کے سب سے اہم اینٹی فاشسٹ ڈرامے ارتورو لوئی کو 'زوال کا عروج' کے نام سے اردو کے قالب میں ڈھالا،

جسے نیشنل اسکول آف ڈراما اور دوسرے ڈراما گروپس نے اسٹیج پر پیش کیا۔

۱۹۵۶ء میں ہند سرکار نے ماسکو کے غیر ملکی زبانوں کے مترجم کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے انور عظیم کا انتخاب کیا اور اس طرح وہ ماسکو گئے، اور ۱۹۶۰ء کے آخر تک وہاں قیام رہا۔ ۱۹۶۹ء میں 'سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ' جیسے اہم اعزاز سے ان کو نوازا گیا اور اس سلسلے میں ۱۹۷۷ء میں حکومت روس کے اہم مہمان بن کر سوویت یونین کا سفر کیا۔ اس دوران موصوف نے روسی کلاسیکی ادب کے متعدد شاہکاروں کو اردو میں منتقل کیا اور ساتھ ہی سوویت یونین اور مغربی یوروپ کی سیاحت بھی کرتے رہے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد موصوف نے کئی سال بمبئی میں اردو بلٹز کے اولین ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ چار سال بعد دہلی واپس آکر انہوں نے سوویت لینڈ کے تمام ایڈیشنوں کے مدیر کی حیثیت سے مختلف ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آخر میں اسٹائل ایڈیٹر اور تجزیہ کار کی حیثیت سے ۱۹۹۰ء میں اپنی آخری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد ان کی ادبی اور صحافتی مصروفیات بڑھ گئیں۔ ان کا ہشت پہلو قلم رواں رہا اور آج بھی' جبکہ وہ ایک مہلک مرض سے جہد آزما ہیں' تسخیر و تخلیق ادب کا سلسلہ جاری ہے۔

فکشن ان کا خاص میدان ہے۔ جمالیات کا طلسم ان کی حسیت کی سانس!

—— انیس امروہوی

1

پُو پھٹنے سے پہلے، یعنی

لُوس کی ٹھٹھری ہوئی رات کا چل چلاؤ تھا۔

سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپیں تالیوں کی طرح گونج رہی تھیں۔ ستاروں کا غبار خاموش ندی میں پھیکا پھیکا رنگ گھول رہا تھا۔ پانی افشاں بھری مانگ کی طرح جھلملا رہا تھا۔ ندی کے کنارے بڑے سے پیپل کے بوڑھے گھنے درخت کے نیچے سوار نے لگام کھینچی اور گھوڑے کی گرم گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پچکارا۔ گھوڑا فوراً رُک گیا جیسے سوار کے ہاتھ کے ہلکے سے لمس نے اس پر، اس اتھاہ خاموشی میں ایک انسان کے دھڑکتے ہوئے دل کا سارا راز کھول دیا ہو۔ گھوڑا لگام کی زنجیر کو چباتے ہوئے پیپل والے ٹیلے پر دو تین چکر لگانے کے بعد چپکا کھڑا ہو گیا۔

سوار دیر تک سوئی ہوئی ندی، سوئے ہوئے کھیت اور سرسراتے ہوئے جنگل پر جھکے ہوئے ملگجے آسمان کو گھورتا رہا۔ اس نے دو تین بار پلٹ کر اس راستے کی طرف دیکھا جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا، پھر سامنے کی طرف، جہاں اس کی منزل انتظار کر رہی تھی۔ پیچھے چھٹتا ہوا راستہ خود اس کے ماضی کی طرح گرد و غبار اور صبح کے دھندلکے میں کہیں کھو کر رہ گیا تھا۔

اس نے آہستہ سے لگام کو جنبش دی، ایک ٹھنڈی سانس لی اور برق رفتار گھوڑے کا رُخ ندی کی طرف پھیر دیا۔

یہ ندی کتنی پُرسکون ہے، لیکن اس کی تہہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے کون جانے۔ خود میرے دل کے طوفان کو کوئی کیا جانے؟

پَو پھٹ چکی تھی، فضا کی پُراسرار دھند پگھل رہی تھی اور اُفق پر روشنیوں کے سرخ

پھول کھلنے لگے تھے۔ ان کے رنگین عکس سے گھاس اور پودوں پر جمے ہوئے شبنم کے موتی بھی جھلملانے لگے۔

مانگ سے افشاں جھڑ گئی اور ندی کے پیچ و خم میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ روشنیوں نے ایک ایک گھاس کو گدگدایا، ایک ایک ذرے کو جگایا۔ جنگل کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کے تازہ جھونکے آئے اور ہرے پتوں اور پودوں کی خوشبو اس کی سانس میں بس گئی۔ دور سے گیتوں کی تان سنائی دی۔ ساتھ ہی ھانک اور پکار کی آواز آئی۔ مویشیوں کے گلّے نئی نویلی دھوپ کا لطف اٹھاتے ہوئے چراگاہ کی طرف چلے اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ایک چھوکرے نے گایوں اور بھینسوں کو ہانکتے ہوئے آنکھ پر ہاتھ سے اوٹ کر کے گھوڑ سوار مسافر کو دیکھا، اور ندی کے کنارے اتر کر برف جیسے پانی سے منہ دھونے لگا۔ ندی سے نکل کر گڈریے نے ایک بار پھر اس اجنبی کو دیکھا۔ اس کے اجنبی لباس کو دیکھا اور ہوا میں ڈنڈا لہراتا ہوا مویشیوں کی طرف بھاگا جو گنے کی فصل کو چھیڑ رہے تھے۔

"ہت تیری ماں کی..........."

سوار مسکرایا۔ اس کے گھنگریالے لمبے بال ہوا میں لہرائے۔ اس نے بندوق اور کارتوس کی پیٹی کو چھو کر دیکھا اور سیدھے ہاتھ کی طرف گھوڑے کا رخ پھیرتے ہوئے اتنی زور سے ایڑ لگائی کہ گھوڑا بھی بھونچکا سا رہ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو "اپنے وفادار پر یہ دھونس کیوں؟"۔ پھر اس نے اپنی دونوں ٹانگیں ہوا میں لہرائیں جیسے کسی درخت کی اونچی شاخ سے پھل توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ٹیلے سے اترتے اترتے ایک بار پھر سوار نے ندی کی طرف دیکھا۔ چمچماتے پانی کی تہ میں اسے سنگریزے بھی چمکتے نظر آئے۔

رات کے اندھیرے میں ہر چیز کتنی پُراسرار معلوم ہوتی ہے۔ ایک دل ہے جس کی تھاہ نہ روشنی میں ملتی ہے نہ اندھیروں میں۔

گھوڑا ٹیلے سے اتر کر ندی کے کنارے کنارے اس گاؤں کی طرف سرپٹ دوڑا جا رہا تھا جو پہاڑیوں کی سرمئی آغوش میں ایک کھلے ہوئے پھول کی طرح چمک رہا تھا۔

2

سوار اُسی طرح ہوا سے باتیں کرتا ہوا گاؤں کی سب سے چوڑی گلی میں گھسا اور مسجد تک دوڑاتا چلا گیا جہاں مکتب کے صحن میں ہر عمر کے بچے اپنے جزدانوں اور بستوں میں کتابیں اٹھائے ہاتھوں میں قلم اور پنسل سنبھالے چاؤں چاؤں کر رہے تھے۔ جیسے اس صحن میں گوریوں کی برات ٹھہری ہوئی ہو۔

بچوں کی فوج چاردیواری کے پاس اکٹھی ہوگئی اور سوار کو دیکھنے لگی۔ سوار بھی بچوں کو دیکھتا رہا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گھوڑے کا رخ چاردیواری کی طرف موڑا اور بڑی بڑی کالی آنکھوں والے ایک شریر لڑکے کو پکارتے ہوئے پوچھا۔

"دوست بتاؤ، ہسپتال کدھر ہے؟"

لڑکا کچھ نہ بولا اور اشارے سے اپنے ساتھیوں کو پاس بلانے لگا۔

"نالائقو! کہاں مر رہے ہو، اپنی اپنی چٹائی بچھاؤ دھوپ میں اور آموختہ شروع کرو۔"

ایک پاٹ دار آواز آئی اور اس کے ساتھ مکتب کے محرابی دروازے سے ایک سفید پوش نورانی چہرہ طلوع ہوا۔

"اوہو..." سوار کو دیکھ کر اس کے منہ سے نکلا۔ وہ اپنی کھڑاویں کھٹکھٹاتا ہوا چاردیواری کے پاس آیا اور لڑکے پھرّ سے بھاگ گئے جیسے چڑیوں سے بھرے پھڑپھڑاتے ہوئے درخت پر کسی نے ڈھیلا مارا ہو۔

"کیوں جناب کیا پوچھتے ہیں آپ" نورانی چہرے پر داڑھی پورے تجسس کے ساتھ ملی۔

"یہاں کا ہسپتال کس طرف ہے؟"

"جی کیا کہا، ہسپتال۔ جناب عالی بڑی مشکل میں ڈال دیا آپ نے۔ اب تک تو ہسپتال بیچ گاؤں میں تھا۔ لیکن نئی عمارت بن کر تیار ہو گئی ہے اور کل سے سامان پرانے ہسپتال سے نئے ہسپتال میں جا رہا ہے۔ اب میں کیا جانوں کہ آپ ......"

"مولوی صاحب! آپ نے ہسپتال کا راستہ بتا دیجئے بڑی مہربانی ہوگی"۔

"تو پھر میں راستہ کیا بتاؤں۔ آپ راستے ہی پر ہیں .... میرا مطلب ہے یہی گلی گھومتی گھامتی گاؤں کے دوسرے سرے پر ختم ہوتی ہے۔ وہیں پرائمری اسکول ہے۔ اس سے آگے ریلوے گمٹی ...."

سوار نے پوری بات نہ سنی اور گلی میں غائب ہو گیا۔ مولوی صاحب نے سر ہلایا، ہوا میں انگلیاں نچائیں اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "گھوڑے کی پیٹھ پر کیا بیٹھ گئے سمجھے تخت طاؤس پر ... جہاں ہیں۔ سبحان اللہ!"

ابھی ہسپتال کے سامان کی پہلی ہی کھیپ بیل گاڑی سے اتر رہی تھی کہ اس نے ہسپتال کے عملے کو چونکا دیا۔

وہ بڑی چستی سے جست لگا کر کودا اور بڑے جوش کے ساتھ اعلان کیا "میں ڈاکٹر جاوید ہوں۔" کمپونڈر درگا پرشاد نے اپنی چھوٹی اور گول گول شیشوں والی عینک سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور منہ سے بھاپ چھوڑتا ہوا فوراً لپکا اور بیک وقت عزت و احترام اور تسلیم و نیاز کے ساتھ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا "او، بہت انتظار کرایا ڈاکٹر صاحب آپ نے۔" وہ ہکلاتے بولا۔

ایک طرف سے بھنگی ڈومنا نے جھک کر سلام کیا اور دوسری طرف سے چپراسی چمارن نے۔

یہ تھا ہسپتال کا کل عملہ۔ ڈومنا نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور ایک طرف چل دیا۔

چپراسی نے بندوق اور کارتوس کی پیٹی سنبھالی اور ڈاکٹر کے نئے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔

ڈاکٹر جاوید اکیلا کھڑا چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ شال میں لپٹا لپٹایا کمپونڈر درگا پرشاد لپک کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا تاکہ اپنی پانچ بچوں والی بے زبان بیوی کو ڈاکٹر کے آنے کی خوش خبری یا بدخبری سنائے اور اس سے ناشتہ پکانے کو کہے۔ "آگیا ڈاکٹر۔ دیکھنا دال والی پوریاں پکاؤ مزیدار"۔ اس نے اپنی سب سے چھوٹی بچی کو گود میں اٹھایا اور اس کی ناک صاف کرتے ہوئے بولا۔ "شریمتی جی دھیان رہے کہ آج سے میں کمپونڈر ہوگیا۔ ذرا ہاتھ روک کر خرچ کرنا۔ چادر چھوٹی ہو جائے تو پاؤں سمیٹ کر سوتے ہیں۔" اس نے بچوں کو پیار کیا اور اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو تیس پینتیس سال کی گندمی رنگ کی نازک سی عورت تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی سی آنکھوں سے اپنے پتی کو دیکھا اور آہستہ سے بڑبڑاتی ہوئی چولھے پر جھک گئی جس میں کچی لکڑیاں سلگنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔ وہ جھکی تو لمبے لمبے بال شانوں پر پھیل گئے ...... بال جو اشنان کے بعد، اب تک نم تھے۔ وہ چولھے میں پھونک مارتی ہوئی بولی۔ "ہاں ہاں۔ ذرا للو کو جوتے پہنا کر اسکول تو چلتا کر دو۔ بھگوان جانے کہاں سے چھوٹا جوتا اٹھا لائے ہو تم۔"

کمپونڈر نے اپنی عینک کے اوپر سے دیکھا اور کندھے جھٹکتے ہوئے بولا۔ "آج ہوا سے لڑ رہی ہو۔ کیا بات ہے۔ چھٹے کی خبر تو نہیں آئی"۔

بیوی نے آنسو بھری آنکھوں سے جل کر اس کی طرف دیکھا۔

اس اثنا میں ڈاکٹر جاوید نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی۔ ہسپتال کی نئی عمارت کے چکر لگائے جس کے سامنے پتھر پر یہ عبارت ابھری ہوئی تھی۔ "بیادگار عبدالستار مرحوم" ریت اور سیمنٹ کے ڈھیر اور اینٹ کے ٹکڑے افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بڑے سے کولتار کے پیپے میں چونا بھیگا پڑا تھا۔

مضبوط بدن ہاتھ والی دو تین کالی کالی جوان عورتیں آنچل سے چنے نکال کر پھانک رہی تھیں۔

وہ چکر لگانے کے بعد ایک ٹیلے پر کھڑا ہو کر دھوپ کھانے لگا۔ اس کی جُنی گھنی بھویں

تنی ہوئی تھیں۔ ناک ستواں تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر ابھری ابھری سی تھیں اور ان میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے جیسے چڑھا رکھی ہو۔ اس کا قد کافی لمبا تھا اور کوٹ پینٹ نے چھریرے بدن میں بڑی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ اس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ اس کی انگلیاں بہت لمبی لمبی اور خوبصورت ہیں۔ ایسی انگلیاں صرف اچھے مصوروں اور بت تراشوں کی ہوتی ہیں۔ اس کے موٹے ہونٹ خاموشی میں بھی کچھ کہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دور جاڑے کی دھوپ میں ریل کی پٹریاں تلوار کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہسپتال سے اسٹیشن کا فاصلہ کوئی پون میل ہوگا۔ "یہاں ریل ہے۔ یہ جنگل نہیں ہے۔" اس خیال سے اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ ہسپتال کا احاطہ تاڑ کے لمبے لمبے پیڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک خشک نالہ تھا جسے یہاں کے لوگ پین کہتے تھے۔ اس پین کے کنارے ڈاکٹر کا کوارٹر تھا۔

ناشتے کے دوران درگا پرشاد نے ڈاکٹر جاوید سے طوفان میل کی رفتار سے بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔ اور ڈاکٹر اپنے کمپونڈر کی چاپلوسی کا بھی قائل ہو گیا اور اس کی معصومیت اور شرافت کا بھی۔ اس نے باتوں باتوں میں جاوید کو بتا دیا کہ یہاں کا لکھپتی زمیندار عبدالجبار بڑا زور دار، ضدی اور بد دماغ آدمی ہے .... "ویسے اوپر سے ریشم ہے ریشم۔ لیکن آپ جانتے ہیں جاوید صاحب ریشم اصلی بھی ہوتا ہے اور نقلی بھی۔ بہر حال عبدالجبار صاحب اس ہسپتال کو اپنی زمینداری کا حصہ اور ڈاکٹر، کمپونڈر کو اپنا پٹواری اور براہیل سمجھتے ہیں۔ پوریاں پسند نہیں آپ کو۔ جی جب میں آپ کی طرح جوان تھا دس دس پوریاں تو یوں گلوریاں بنائیں اور رکھ لیں منہ میں اور کیا مجال جو ڈکار بھی آجائے!"

جاوید نے کمپونڈر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اس جوتے کی طرح سوکھا ہوا تھا جو دیر تک پانی میں بھیگنے کے بعد دھوپ میں پڑا رہا ہو۔ اس کے ہاتھ کی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور کنپٹیوں کی ہڈیاں چمک رہی تھیں۔

"کمپونڈر صاحب، اگر ایسا ہے تو کہاوت بدل دینی چاہئے۔ اونٹ کے منہ میں زیرہ نہیں بلکہ زیرے کے پیٹ میں اونٹ!" جاوید نے یہ کہہ کر زور سے قہقہہ لگایا۔

درگا پرشاد کھسیا گیا اور بوکھلا کر اس نے پوری کا اتنا بڑا سا گرم گرم نوالا منہ میں رکھ لیا کہ بولنا تو خیر بولنا چبانا بھی مشکل ہوگیا ...... اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آج تو آپ آرام کریں گے نا۔ بہت تھک گئے ہوں گے۔ اپنے گاؤں سے لاری یا گاڑی سے آسکتے تھے۔ گھوڑے کی سواری تو........"

"نہیں میں تو قریب کے گاؤں سلطان پور کل ہی آگیا تھا۔ وہاں میرے دوست رگھوناتھ رہتے ہیں۔ کھاتے پیتے کاشتکار ہیں۔ جی نہیں آرام نہیں کروں گا تھکا ہوا نہیں ہوں۔ ہاں البتہ آج مریضوں کو نہیں دیکھوں گا"۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر نئے ہسپتال میں داخل ہوا۔ سامان بکھرا پڑا تھا۔ درگا پرشاد مریضوں سے نمٹنے کے لئے پرانے ہسپتال چلا گیا تھا۔ جاوید ایک کمرے میں سے دوسرے میں گھومتا رہا اور چپراسی اور بھنگی کو ہدایت کرتا رہا کہ کون سی میز کہاں، کون سی بنچ کہاں، کون سے آلے کا بکس کہاں ہوگا۔

بیچ والے مربع کمرے میں ایک بڑا سا کپڑے والا پنکھا لٹک رہا تھا اور اس کی ڈور ایک سوراخ میں سے گذرتی ہوئی برآمدے میں لٹک رہی تھی۔

ہسپتال کا معائنہ کرنے کے بعد جاوید احاطے کے دوسرے سرے پر گیا جہاں بھنگی اور چپراسی کا کوارٹر تھا۔ چھپر ایک ہی تھا۔ برآمدہ بھی ایک تھا۔ البتہ دونوں کے کمرے الگ الگ تھے۔ ڈومنا کی جورو دھوپ میں زمین پر بیٹھی بانس کی کھپچیوں سے ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ اور اس کا سوا سال کا موٹا مشٹنڈا بچہ اینڈتا ہوا اس کی بھری بھری چھاتی سے دودھ پی رہا تھا اور چٹخارے مار رہا تھا۔ جوتے کی چھچاہٹ سنکر وہ چونکی اور مڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے لمبا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ "سلام حجور" ایک چھچھاتی ہوئی فریادی آواز ابھری اور اس کے ہاتھ اور زیادہ مشاقی اور پھرتی کے ساتھ کھپچیوں سے کھیلنے لگے۔

"سلام" جاوید نے گنّے کے کھیت کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جہاں دن کے وقت بھی گیدڑ جھانکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ لڑکپن میں اس نے گیدڑوں کی مکاری کے کیسے کیسے قصے سن رکھے تھے۔ مزے مزے کی یادوں سے کھیلتا ہوا وہ

اپنے کوارٹر میں واپس آیا۔ کوارٹر میں ایک بڑی سی بیٹھک تھی جس کے آگے برآمدہ تھا۔ اندر والے دونوں کمرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور دو طرف ملا ہوا سائبان تھا۔ جس کے آخری سرے پر باورچی خانہ، بھنڈار اور غسلخانہ تھا۔ وہ دیر تک پختہ آنگن میں کھڑا نئے کھپروں کے چھپر کو دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں ان کے دہکتے ہوئے رنگ، چمک اور خوبصورت دھاریوں کی داد دیتا رہا۔

"معلوم ہوتا ہے یہاں کے کاریگر بڑے ہنرمند ہیں!"

چماری کے ساتھ تین بیگار داخل ہوئے جو اس کا سامان لے کر آئے تھے۔ ایک بیگار نے اس کو چمڑے کا ایک تھیلا اور ایک خط دیا۔

"میاں اب تم ایک نئی زندگی میں داخل ہو رہے ہو اور تمہاری بے فکری کا وہی حال ہے۔ اس بے ڈھنگی چال سے کیسے کام چلے گا۔ تم ڈاکٹر ہو ڈاکٹر۔ اپنی شان کا خیال رکھو۔ اور یہ تھیلا کیوں بھول گئے۔ میں جانتا ہوں تم اس میں کام کی چیزیں رکھتے ہو۔ اچھا بتاؤ شکار کھیلنے کب آؤ گے؟ پکے ہوئے برگد، پیپل اور گولر کے پیڑوں پر ہریلیں ٹڈیوں کی طرح ٹوٹ پڑی ہیں۔ اور بھئی تم جانو مجھے تو ہریل کے گوشت کی خستگی تمہارے جیسے شہریوں کی محبوباؤں کے ہونٹوں سے زیادہ پسند ہے۔ میرا مطلب ہے اس میں زیادہ خلوص ہے۔ برا مان گئے؟ میری بلا سے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں منانے آؤں تو جلد از جلد شادی کر دو یا میرے بیمار پڑنے کی دعا مانگو۔

تمہارا گنوار دوست۔ رگھوناتھ

"گنوار" جاوید مسکرایا۔

جاوید کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا سامان قرینے سے رکھا ہوا ہے اور چارپائی پر بستر بچھ گیا ہے۔

سفید تکیے، چادر اور بڑے بڑے پھولوں کی چھاپ کے لحاف نے اسے للچایا۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور وہ بستر پر گرنے ہی والا تھا کہ باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔

"دربار سے آدمی آیا ہے" چپراسی نے واپس آتے ہوئے کہا۔

"دربار سے؟"

جاوید کو فوراً کمپونڈر درگا پرشاد کی باتیں یاد آئیں۔

"بہر حال عبدالجبار صاحب اس ہسپتال کو اپنی جاگیر اور ڈاکٹر، کمپونڈر کو اپنا پٹواری اور براحسیل سمجھتے ہیں ....."

"کیا کام ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"کہتا ہے سرکار نے یاد کیا ہے آپ کو۔"

"کہہ دو ڈاکٹر صاحب آج آرام کر رہے ہیں۔ کل سے ہسپتال کا کام سنبھالیں گے۔"

چپراسی جھجکتا ہوا ڈاکٹر کا جواب سنانے چلا گیا۔

وہ سو کر اٹھا تو اس کے کانوں میں یہ آواز آئی: "کیوں بھئی تمہارے ڈاکٹر صاحب اتنے تھکے ہوئے ہیں کہ ...." یہ یقیناً کسی بلغمی آدمی کی آواز تھی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

آنگن میں شام کا بسیرا ہو چکا تھا اور کالے شہتیر کے پاس پائے کے اوپر لوزیوں کے گھونسلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔

اس نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے۔ اور جب وہ باہر نکلا تو وہ ایک سرمئی سی موٹی گرم پتلون اور سیاہ رنگ کا سوئیٹر پہنے ہوئے تھا اور گلے میں مفلر۔

باہر برآمدے میں ایک لالٹین جل رہی تھی اور کرسیوں پر تین آدمی جمے ہوئے تھے۔ صبح والے مولوی صاحب کو اس نے پہلی نظر میں پہچان لیا سب سے پہلے مولوی صاحب نے مصافحہ کیا۔

"خوب جناب حضرت خضر کا بھی کچھ حق ہوتا ہے۔ ہم کب سے اپنے نئے مہمان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"شکریہ شکریہ۔"

دوسرا آدمی ڈاک بابو تھا چیچک رو اور زردی مائل زیتون جیسا چمکتا ہوا رنگ، لیکن آنکھوں میں عقابی چمک، ناک بھی چیل جیسی ...... نزیش میں ایک ذہین اور

چاپلوس آدمی کی ساری خوبیاں تھیں۔ اس کی باریک مونچھوں نے اس کے چہرے میں خود اعتمادی کی گمبھیرتا پیدا کر دی تھی اور یہ بھانپنا مشکل تھا کہ ابھی پچھلی شب برات ہی میں اس نے ستائیسویں بہار دیکھی ہے۔

ماسٹر شاہ عالم بہت ہی موٹا تھا۔ بلغمی آواز اس کی تھی۔ وہ کھڑا ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک دیو کھڑا ہو گیا ہے۔ چہرہ گول اور گوشت سے بھرا ہوا۔ آنکھیں بہت چھوٹی رنگ گورا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔ کتنا نرم تھا اس کا ہاتھ جیسے گندھا ہوا آٹا۔

تو یہی وہ سرکاری اور نیم سرکاری لوگ ہیں جو یہاں سب سے زیادہ روشن خیال اور مہذب سمجھے جاتے ہیں۔ ان ہی دوستوں میں جاوید کو کم از کم آئندہ تین برس کا عرصہ کاٹنا ہے۔ اس خیال سے اُسے بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ بڈھا مولوی جو بات بات پر پان کی پیک کی پھواریں برساتا ہے ...... ڈاک بابو جو اپنی عقلمندی کی دھاک بٹھانے کے لئے جا بے جا فارسی شعر پڑھتا ہے اور بار بار آنکھ مار کر اندرونی کھسیاہٹ مٹانے کی کوشش میں اور بھی کھسیانی بلی بن جاتا ہے۔ اور پھر یہ ماسٹر شاہ عالم ...... غضب خدا کا لمبا بھاری بھرکم تھل تھل قسم کا انسان ہے۔ ہر اچھی بری بات پر اپنی ناک سکیڑتا ہے جیسے چنگھاڑتی ہوئی چھینک کی دھمکی دے رہا ہو اور اچانک منہ بگاڑ لیتا ہے گویا منہ سے بات نہ نکل رہی ہو۔ اور تاش کا ذکر یوں ہو رہا ہے جیسے اس گائے کا ذکر خیر ہو جس کے سینگ پر دنیا ٹکی ہوئی ہے۔ خوب گزرے گی ان یکتائے روزگار مسخروں میں!

بہر حال وہ ان سے خاصے خلوص اور خوش اخلاقی سے پیش آنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ اس کے لئے یہ جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ وہ آئینہ تھا آئینہ۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنا اسے نہیں آتا تھا۔ لیکن "جی ہاں، جی ہاں" اور "خوب بہت خوب" کہتے رہنے میں سیاہ اور سفید کا سوال کہاں اٹھتا ہے۔ اچانک مولوی نے اعلان کیا:

"ڈاکٹر صاحب زندگی کا سارا نور، سارا کیف، خدا کی یاد میں ہے۔"

"میرے خیال میں نور اور کیف صرف ایک بات میں ہے۔ وہ دربار کی خوشنودی میں!" ڈاک بابو برنیش نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جیسے کسی کو چڑا رہا ہو۔ مولوی کی

تیوریاں چڑھ گئیں۔ "یہ کیا مذاق ہے!" منہ سے تو وہ کچھ نہ بولا۔ مگر اس کے داڑھی سمیت اپنے ہونٹ چاٹنے کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب شروع میں تو آپ بہت گھبرائیں گے۔ یہ دیہاتی زندگی کسے بھاتی ہے۔ شہری زندگی کے بعد تو......"

"نہیں میں تو خود دیہاتی ہوں۔" ڈاکٹر جاوید نے بات کاٹ دی۔

"ہاں صاحب شہر میں زیادہ حسن ہے۔" ڈاک بابو نے فیصلہ کن لہجے میں ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اچھا" اس وقت جاوید اپنے خاص طنز بھرے انداز میں مسکرایا۔ ایسے میں اس کے موٹے ہونٹوں سے زہر اور پھول ایک ساتھ جھڑتے تھے۔

"حُسن، میاں حُسن صرف تلاش حق میں ہے"۔ مولوی بولا۔

"جی ہاں تلاش حق میں ہے۔ میرا خیال ہے سارا حُسن پان کی گلوریوں میں۔ ہے۔" ڈاکٹر زور سے ہنسا۔ "دلچسپ لوگ ہیں!"

ماسٹر منہ پھلائے بیٹھا رہا جیسے ہر چیز سے بیزار دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہا ہو۔

تھوڑی دیر میں محفل نے طے کیا کہ اس اکیلے اور کنوارے نوجوان ڈاکٹر کی دلچسپی کے لئے وہ سب یہیں تاش کی منڈلی جمایا کریں گے۔ جنگل میں ہرن اور تیتر وغیرہ کے شکار پر جائیں گے۔ پورے چاند کی راتوں میں شکری ندی میں مچھلیوں کا شکار کھیلیں گے۔ دوستوں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ یہ شکار کُنڈے اور بنسی سے نہیں کھیلتے۔ یہ شکار ندی کے چھچھلے پانی میں دھارے کے رُخ پر تلوار سے کھیلا جاتا ہے۔

"اُف بڑا لطف آتا ہے!"

"دیہات ہو یا شہر، میں زندگی سے زیادہ مطالبے نہیں کرتا۔ اس لئے خوش رہتا ہوں"۔ ڈاکٹر جاوید نے پوری شام میں یہ پہلا جملہ اپنے بارے میں کہا۔ "لیکن ایک آدمی کی خوشی صرف اس آدمی کے ہاتھ میں نہیں ......" اس نے جملہ پورا نہیں کیا۔ "اچھا تو ہم ملتے رہیں گے۔"

"اجی ملتے رہیں گے۔ گاڑھی چھنے گی۔ بہت پچھڑا ہوا علاقہ ہے یہ۔ آپ کے آجانے

سے کتنوں کو زندگی کی روشنی دکھائی دیگی۔" مولوی نے ڈھکا چھپا طنز کیا تو جاوید مسکرا دیا۔

کوئی دس یا ساڑھے دس بجے درگا پرشاد کے ساتھ کھانا کھاتے کے بعد جاوید نے اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر خود بھی پی اور کمپونڈر کو بھی پلائی۔

"آپ تو کافی فضول خرچ آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔ درگا پرشاد کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی تھی لیکن اس نے دھوئیں سے منہ پھیر کر یہ جملہ جڑ ہی دیا۔"کیسے پسند آیا آپ کو یہ گاؤں؟"۔

"ابھی میں نے گاؤں دیکھا ہی کب ہے۔ ابھی تو ماسٹر، مولوی اور ڈاک بابو ہی سے ملاقات ہوئی ہے۔"

"ڈاک بابو سے ہوشیار رہیے گا۔ گرگٹ ہے گرگٹ!"

"اچھا، اور شاہ عالم اور مولوی؟"

"دونوں شریف آدمی ہیں۔ خیر اللہ میاں کی گائے تو کوئی نہیں ہوتا اس سنسار میں۔ پھر بھی،" دھواں اس کے گلے میں اتر گیا اور وہ کھانسنے لگا۔

"اچھا میں چلا۔ للو کی ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ نمستے!"

"آداب عرض ہے"

"ناشتہ کس وقت کریں گے آپ؟" جاتے جاتے درگا پرشاد نے پلٹ کر پوچھا۔

"آپ تکلیف نہ کریں۔ کل تڑکے ہی میرا ملازم بلکہ کہنا چاہیے میرا آقا آن دھمکے گا۔ شکریہ!"

اس نے دروازہ بند کیا۔ ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ صرف آنگن کے گھونسلے میں چڑیا پر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ نہ جانے وہ کیوں بے چین تھی۔ کوارٹر سے للو کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ تھوڑی دیر میں یہ آوازیں بھی بند ہوگئیں۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن سن رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے سونے کے کمرے میں آیا جیسے اس کو اندیشہ ہو کہ اس کی ذرا سی بے احتیاطی سے اس کے قدموں تلے ایک دھماکا ہوگا اور کسی کی نیند تباہ ہوجائے گی۔ وہ چپکے سے اپنی چارپائی پر بیٹھا۔ تکیہ اٹھا کر اس نے زانو پر رکھ لیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جس میں لکڑی کی

موٹی موٹی سلاخیں تھیں۔ چاندنی کا دودھیا آنچل درختوں اور میدانوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اسے دور ٹیلے پر کھڑا تاڑ ایک سیاہ نیزے کی طرح معلوم ہوا جس نے چاند کو اپنی نوک پر اٹھا لیا ہو۔ کھڑکی سے تیز ہوا اور چاندنی کی کرنیں اس کے کمرے میں آرہی تھیں۔ آدمی خود کو اس وقت پاتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکن سنتا ہے۔ اس نے اپنی پچاسویں بار دہرائی ہوئی بات دل ہی دل میں دہرائی۔ اسے لالٹین کی یرقانی روشنی بری معلوم ہوئی اور اس نے چاہا کہ اٹھ کر۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا مگر وہ اپنی دھڑکن سن نہ سکا۔ دوسری بار دستک کی آواز آئی: "ڈاکٹر بابو۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر بابو۔۔۔۔۔۔۔" بڑی کراری اور کھردار آواز تھی۔

اس نے دروازہ کھولا۔

کمپونڈر درگا پرشاد لحاف میں لپٹا ہوا لالٹین کی میلی اور سہمی ہوئی روشنی میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے دانت بج رہے تھے اور وہ اپنی گول گول آنکھوں سے اس دوسرے داڑھی والے کالے مجھنگ آدمی کی طرف اشارہ کررہا تھا جو ایک چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ اس نے جب ڈاکٹر کی چمکیلی سوالیہ نظر دیکھی تو کھردار آواز میں بولا "۔ ڈاکٹر بابو۔ دربار سے بلاوا ہے۔ حویلی میں مجبوری جرورت ہے۔"

"کیسی حویلی۔ کیسا دربار؟" جاوید نے درگا پرشاد کی طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے کہ میں نے کہا کرار خان سے۔ بھئی ڈاکٹر صاحب آج۔ میرا مطلب ہے کہ سرکار کی چھوٹی بہن کو دورہ پڑا ہے۔ حالت نازک ہے۔ جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔"

ڈاکٹر جاوید کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ایک لمحہ کھڑا اس چٹان کو دیکھتا رہا۔ جس کے ہاتھ میں اپنے سے بھی دو ہاتھ بڑا ڈنڈا تھا۔

وہ کچھ کہے بنا اندر آیا۔ اس نے گلے میں مفلر لپیٹا، ایک موٹا سا گرم کوٹ پہنا اور آلہ اور دواؤں کا تھیلا اٹھا کر کرار خان کے ساتھ چل دیا۔

لمبے لمبے تاڑ پیچھے رہ گئے۔ مسجد کے گنبد چاندنی میں سفید کلاہوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ مسجد کے زینے سے چپکے ہوئے ایک کتے نے سر اٹھا کر لالٹین کی

طرف دیکھا اور بھونکے بغیر سو گیا۔ جاوید کو یہ خاموشی بڑی گراں گزر رہی تھی۔ اس کو لگا کہ اگر یہ چٹان ذرا پگھلے اور بولنا شروع کر دے تو یہ پُراسرار فاصلہ آسانی سے کٹ جائے گا۔ "پتھر بھی پسیج سکتا ہے!" کرار خان نے اس کے دل کی بات کو جیسے بھانپ لیا۔

"تم آج ہی آئے ہو؟"

ڈاکٹر کو اس انداز گفتگو سے بڑا دھکا لگا...... عجب بے ڈھب آدمی ہے۔

"اندھیرے میں آدمی کو کتنا ڈر لگتا ہے!" کرار خان کی آواز گلی میں اُبھری اور دربار کی اگلی عمارت سے جا ٹکرائی۔

"ایک تو یہ کہ اندھیرا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈرنے والے کو بھری دوپہر میں ڈر لگتا ہے۔ مگر تم تو پہاڑ کے پہاڑ ہو پھر کیوں ڈرتے ہو اس چاندنی میں۔"

کرار خان چپ ہو گیا۔ اور جاوید اپنی سرکش سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگلی گلی میں چاندنی دیواروں اور چھپروں میں پھنس کر رہ گئی اور گلی میں ایسا اندھیرا ہو گیا کہ جاوید کو کرار خان کا سفید صافہ ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ کرار خان سے ٹکرا گیا۔

"سنبھل کے بڑا اندھیرا ہے۔ جب ہی تو خدا کے نیک بندے سارا گناہ رات ہی کو کرتے ہیں۔" کرار خان اتنی زور سے کھانسا کہ پاس کے کسی گھر میں مرغیاں ڈر کر پھڑپھڑانے لگیں۔

اچانک جاوید دیوار سے ٹکرا گیا۔ "باندھ کے!" کرار خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "حویلی کے پھاٹک کو اتنا کالا رنگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اے کھواب کے متوالے پہریدارو......!"

کرار خان نے اپنی بات پوری نہ کی تھی کہ اس بڑے پھاٹک میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور ایک لالٹین اوپر اٹھی، ٹھیک جاوید کے منہ کے سامنے۔

"ارے یہ کوئی رونمائی ہے۔ یہ ہیں اپنے نئے ڈاکٹر بابو۔ حویلی میں کھبر کرو۔"

پہریدار بڑے سے سفید محرابی دروازے کی طرف بھاگا اور اس کی لالٹین چھوٹے سے برآمدے سے گزر کر کہیں غائب ہو گئی۔ اتنے میں وہ دونوں بھی اس برآمدے میں پہنچ گئے۔

"بس ایک منٹ ڈاکٹر بابو۔ حویلی میں ڈاکٹر حکیم سے پردہ نہیں ہوتا۔ دیر نہیں ہوگی بس ایک منٹ۔"

پہرے دار دوڑتا ہوا آیا اور بد حواس لہجے میں بولا۔ "جلدی جلدی۔ سکینہ بی اب تک بیہوش ہیں ....." وہ سر دُھنتا ہوا پھاٹک کی طرف چلا گیا۔

ایک بار حویلی کے اندر قدم رکھتے ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ بالکل نئی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ اونچی اونچی سفید دیواروں، تھرتھراتی ہوئی چلمنوں اور چلمنوں سے جھانکتی ہوئی مریل روشنیوں، دبی دبی آوازوں، بھٹکتی ہوئی نگاہوں، اور بولتی ہوئی خاموشی کی دنیا۔ ..... آہٹوں کی اور سرگوشیوں کی ایک اجنبی دنیا۔ وہ دیر تک ایک آنگن سے دوسرے آنگن میں ایک سائبان سے دوسرے سائبان میں چلتا رہا۔ آخر حویلی کا پچھلا حصہ آیا۔ کرار خان نے ایک بڑے سے کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کی بے سلاخ کھڑکی سے روشنی چھن رہی تھی۔

دفعتاً ایک چیخ اُبھری اور جاوید کو محسوس ہوا کہ ایک تیز خنجر اس کے سینے میں اتر گیا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت کمرے سے دو تین عورتیں نکل کر ایک طرف بھاگیں۔ کرار خان نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جب دہلیز کے اندر قدم رکھ رہا تھا تو اس نے اپنے دل کو پسلیوں سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا۔ ..... ایک اور چیخ ..... اور کیسی چیخ! جیسے کوئی ظالم شہ رگ میں جلتی ہوئی سوئی چبھو رہا ہو اور باریک نوک سے جھٹکے دے دیکر ادھیڑ رہا ہو۔ جاوید کو پسینہ آگیا۔

کرار خان نے لالٹین اٹھائی۔

بڑی سی مسہری پر بیس بائیس برس کی ایک لڑکی لیٹی ہوئی تھی ..... گیندے کے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح زرد، چہرے پر پسینے کی ہلکی سی چمک تھی۔ بھنویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں اور آنکھیں انتہائی بے بسی میں زخمی زخمی سی پھڑپھڑا رہی تھیں۔ جیسے بیقرار بھنورے۔ اس کے بالائی ہونٹ پر پتلی سی کانپتی ہوئی ناک کے نیچے تل اتنا سیاہ تھا کہ اس پر کاجل کی بوند کا شبہ ہوتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور آنکھیں بند کرلیں ..... بھونرے کہیں اڑ گئے اور پلکوں کے اوپر بھی زردی چمکنے لگی۔

ایک کونے سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور اس میں لال مرچوں کی ایسی جھل تھی کہ ڈاکٹر کو بھی کھانسی آگئی۔

"یہ کیا ہے؟" جاوید نے مسہری کے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جب سے بی بی پر آسیب کا منحوس سایہ پڑا ہے مولوی صاحب روزانہ پھونک مار کر یہ مرچیں بھجواتے ہیں اور بلا کو دور رکھتے ہیں۔"

"بلا کو دور رکھتے ہیں۔ فوراً ہٹاؤ اس ہانڈی کو یہاں سے!" ڈاکٹر جاوید نے اتنے تحکمانہ انداز سے کہا کہ کرار خان نے حکم کی تعمیل میں ایک منٹ کی دیر نہ کی۔

ڈاکٹر جاوید کو لگا کہ لڑکی کی پلکوں میں حرکت ہوئی اور اس نے سوجے سوجے آنسوؤں سے تر پپوٹوں کے کونوں سے اسے دیکھا۔ ایک چیخ ہونٹوں تک آکر رہ گئی۔ اس کے بعد اس کے جسم کا تناؤ ختم ہونے لگا جیسے کمان ٹوٹ گیا ہو۔ اور شال کے اندر ایک جوان لڑکی کا جسم اپنی تمام معصومیتوں، شرارتوں اور پیچ و خم کے ساتھ سانس لینے لگا۔

ڈاکٹر جاوید نے نبض ہاتھ میں لے لی۔ نبض تھی یا خون کی بپھری ہوئی موج جو ساحل سے ٹکرا رہی تھی۔

"آنکھیں کھولو" جاوید نے آہستہ سے کہا۔

"آنکھیں" دوسری بار جاوید نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

سکینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ان میں وہی زخمی ہرن کی بے بسی اور وحشت تھی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر چھت کو گھورتی رہی۔ اس کے چہرے پر پسینہ تیرنے لگا۔ اتنی سرد رات اور پسینہ!

جاوید نے یہ سوچا ہی تھا کہ اسے اپنی پیشانی پر پسینہ تیرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے فوراً جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ لڑکی کا کہنیوں تک ننگا ہاتھ منہ پر آیا۔ اس نے اپنے بالائی ہونٹ پر تیرتے ہوئے موتیوں پر بڑی نزاکت سے انگلی پھیری اور جاوید کو یہ دیکھ کر ایک خوشگوار حیرانی ہوئی کہ اس کا تل کاجل کی بوند نہ تھا۔ اس نے ٹارچ سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے کاروباری ڈاکٹر کی طرح کہا اور نسخہ لکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور اس کی لکھائی ٹیڑھی میڑھی سی کاغذ پر گھسٹتی چلی جارہی تھی۔

"نیند آجائے گی اس دوا سے اور صبح تک آرام ہو جائے گا!"

چلتے چلتے جاوید کو ایسا لگا کہ اس کی آنکھوں میں بھیگی بھیگی سی التجا تیر رہی ہے۔ لیکن وہ پلٹ کر دیکھے بغیر آنگن میں نکل آیا جہاں ہانڈی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

جاوید نے زور سے کہا۔ "فضول۔ آسیب واسیب کچھ نہیں ہے۔ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا..." اور پھر اس کے قدم ان ہی پُراسرار دیواروں، محرابوں اور ستونوں کے سامنے اٹھنے لگے۔

مریضہ نے ڈاکٹر کی صاف اور تیز آواز سُنی اور دیوار کی طرف کروٹ بدل کر رونے لگی۔

کرار خان نے ڈیوڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہن کا یہ حال ہے اور یہاں مصاحبوں کی منڈلی جمی ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر چپ رہا۔ اس کے کانوں میں اب تک زخمی پرندے کی چیخ گونج رہی تھی۔

کمپونڈر کے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے کرار خان نے ہوا میں انگلی اٹھا کر کہا۔ "تم نئے نئے پھنسے ہو۔ یہ بڑی بھیانک جگہ ہے۔ دلدل ہے، دلدل۔ یہاں ایک سے ایک چمکتا موتی آیا اور کنکر بنکر لوٹا۔ خبردار رہنا۔ ہاں!"

"بکومت!" ڈاکٹر کا خون کھول گیا لیکن اس کی ڈانٹ سننے والا وہاں تھا کون۔ کرار خان تو کمپونڈر کے دروازے کی زنجیر ہلا رہا تھا۔ جاوید نے اپنا تھیلا باہر برآمدے میں ایک کرسی پر رکھ دیا۔ اس کا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ گھر کے اندر نہ جاسکا۔ ہوا سنک رہی تھی اور ناک برف کا ڈلا بنتی جارہی تھی۔ لیکن اس نے اپنے دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے اور ننگ بوس تاڑوں کے سائے میں سوئی ہوئی پین کے کنارے کنارے اپنے کوارٹر کے پچھواڑے آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ اور دل کی مبہم بے چینی پر قابو پانے کے لئے سگریٹ سلگالی۔

یکایک اس کے کانوں میں کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے کانوں میں مرد کی آواز بھی پڑی۔ کیا بات ہے۔ وہ لپکا۔ یہ آواز

بھنگی کے کوارٹر سے آرہی تھی۔ ڈومنا اپنی بیوی کو پیٹ رہا تھا۔ اور نشے میں دُھت، بیوی تام چینی کی ایک رکابی اس کے سر پر مار رہی تھی اور ساتھ ہی اس کے بازو میں دانت چبھو رہی تھی۔ نیم تاریکی میں ان کی نظر ڈاکٹر پر پڑی اور دونوں کا نشہ ہرن ہوگیا۔

"ڈومنا یہ ہسپتال ہے یا پاگل خانہ؟" جاوید نے پوچھا۔

ڈومنا کی عورت کوٹھری میں گھس گئی اور ڈومنا دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ ابھی جاوید چند ہی قدم لوٹا تھا کہ نشے سے بھری گانے کی آواز سنائی دی۔

"اندھیریا ہے رات سجن رہیو کہ جیو...... ہائے رام"

ڈاکٹر مسکرایا جیسے اس کی چھاتی سے ایک پہاڑ ٹل گیا ہو۔

اس نے کمرے میں آکر تین چار سگریٹیں پھونک ڈالیں لیکن نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ سگریٹ کا دھواں کھڑکی سے چھنتی ہوئی چاندنی میں چمک اٹھتا اور پھر غائب ہوجاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس کا سانس گھٹنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ ایک بھوکا عقاب اس پر جھپٹ رہا ہے حالانکہ یہ محض اس چیخ کی گونج تھی جو حویلی کی دیواروں سے ایک قیدی کی فریاد کی طرح ٹکرا رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"یہاں اس کا پہلا دن ہی کتنا عجیب ہے کیا یہ اچھا شگن ہے۔ شاید...... لیکن نیند کیوں نہیں آتی۔ نیند...... نیند...... نیند"

اس نے لالٹین جلائی اور چرمی تھیلے سے کالی سی ڈائری نکالی......

'کیوں نہ ڈائری ہی لکھ ڈالوں' اس نے سوچا

لیکن وہ ڈائری لکھنے کے بجائے پچھلے صفحے پڑھنے لگا۔

کلکتہ

۱۲ اگست۔۔۔۔۔۔

آج بہت ہی اچھا دن ہے۔ دھوپ چھاؤں نے ہماری سیر کو بہت پر لطف بنادیا۔ اچھا ہوا بارش نہیں ہوئی۔ لیکن کہیں قریب بارش ضرور ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ہوا میں بڑی سحر انگیز خنکی تھی، جو جذبات کے شعلوں کو اور بھڑکا رہی تھی۔ لیکن مجھے گیتا کا مذاق بہت کھلا۔ اس کو معلوم ہے کہ روز مجھ سے بہت دور ہو چکی ہے۔ شاید وہ تو دوستی بھی باقی رکھنا نہیں چاہتی۔ ڈور کٹ گئی ہے۔ اس کو کیا معلوم کہ بوٹانیکل گارڈن کی جھیل کے پاس بیٹھکر روز نے مجھ سے کیا کہا تھا،

"تم خود کو بہت اونچا سمجھتے ہو اور تمہاری بددماغی میں تم سے زیادہ ان لڑکیوں کا ہاتھ ہے جو پانی کی کمزور سے کمزور لہر میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں!

"میں تنکا نہیں ہوں۔ کشتی ڈوب جائے تو میں تیر کر کنارے تک پہنچ سکتی ہوں۔ تم تین سال قبل آئے تھے تو بڑے معصوم تھے۔ لیکن اب قزاقوں کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو۔"

اور نہ جانے کتنی بے سروپا باتیں۔ میں نے ٹھیک کیا اٹھ کر چلا آیا۔ گیتا کے ساتھ

ڈرامے میں پارٹ کر لینا کوئی ایسا جرم تو نہیں ہے۔ لیکن گیتا نے سبھوں کے سامنے یہ بے تکی بات کیا پوچھی ..... "تم کسی لڑکی کے لئے اپنا مذہب بدل سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے کیا تم عیسائی بن سکتے ہو؟"

"بیوقوف لڑکی!"

دن بھر اس کے بعد روز مجھ سے کٹی کٹی رہی۔ ممکن ہے وہ گیتا کی اس چوٹ کا مطلب یہ سمجھی ہو کہ میں نے اس کو اپنا رازدار بنا لیا ہے۔ واہ کمال کر دیا۔ گیتا تو خود ہی اڑتی چڑیا کا رُخ پہچانتی ہے۔ گیتا سب جانتی ہے۔ اسے معلوم ہے ونود اس کی زلفوں کا اسیر ہے حالانکہ ونود صرف اس کی زلفوں کا اسیر ہی نہیں ہے۔ آدمی زور دار ہے۔ زلفوں کی زنجیریں ہوں یا نگاہوں کے تیر، مسکراہٹوں کے پھول ہوں یا رخساروں کے چاند سورج ..... وہ تو سارے مزے لوٹنا چاہتا ہے۔ اگر وہ خلوص سے کچھ کرے تو مجھے شکایت نہیں۔ لیکن میں ہوتا کون ہوں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے اپنے دل میں خودی کے زہر میں بجھا ہوا جو خنجر چھپا رکھا ہے وہ میرے خون سے اپنی پیاس بجھائے گا۔

آنکھوں میں ایک لاش ہے کہ بھرتی چلی آتی ہے۔ میں اس سے بھاگ رہا ہوں اور وہ میرے پیچھے جھپٹ رہی ہے۔ لاش ہے یا زندہ عورت..... یہ ہونٹ یوں کھلے ہوئے کیوں ہیں ..... یہ اپنی داستان ادھوری کیوں چھوڑے دے رہے ہیں۔ کبھی یہ ہونٹ بڑے گلابی اور رسیلے ہوں گے لیکن اب تو پت جھڑ نے ان سے سارا رنگ، ساری آگ، ساری بیقراری چھین لی ہے۔ لیکن یہ آہستہ آہستہ کہہ کیا رہے ہیں؟ کسی کو پکار رہے ہیں۔ یہ بال ہیں یا بنگال کی گھنگھور گھٹائیں۔ یہ گھٹائیں خاموش کیوں ہیں۔ ان سے اٹھنے والا طوفان کہاں ہے؟ بجلیاں کہاں ہیں؟

میں پاگل ہو جاؤں گا .... ڈاکٹر مجھ سے ناراض ہو گیا۔ لیکن میں اپنی چیخ کیسے دبا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے دنیا کا کوئی آدمی روح کی چیخ کو نہیں دبا سکتا۔ میں ایک معصوم جسم پر نشتر کی بے رحمیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ جس نے نہ جانے کیسی بھیانک محرومی اور مجبوریوں سے گھبرا کر خودکشی کی تھی .....

لیکن میں آج موت کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں .... زندگی زندگی ....

روز....... دیکھو وہ وقت قریب آرہا ہے جب میں کلکتہ سے چلا جاؤں گا اور شاید کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ میں تم سے سیکڑوں میل دور چلا جاؤنگا۔۔۔۔ نہ جانے کہاں۔ کوئی جنگل ہوگا۔ ندی ہوگی۔ شاید پہاڑیاں بھی ہوں .... اس خاموش دور دراز ہری بھری وادی میں جہاں ہسپتال کا کام ہوگا۔ مریض ہوں گے ان کے جینے کی تمنائیں اور جدوجہد۔ شاید چند دوست مل جائیں۔ شاید نہ ملیں .... دوست ہوا کا وہ جھونکا ہے جس کے آنے سے پھول کھلتے ہیں اور خوشبوؤں میں پرواز کی طاقت آتی ہے۔ کون جانے ہوا کا یہ جھونکا کب آئے اور کب پھول کھلیں۔ جھونکا آئے نہ آئے پھول کھلیں نہ کھلیں۔ کون جانے...... نہ تم آؤ نہ گل کھلیں، نہ خوشبو پھیلے ؛، عجیب رنگ میں میری یہ شام گزرے گی، کتنا اداس ہوں میں!

لیکن آج سے چند مہینے پہلے جب نیل گگن میں چاند ایک جگہ تھم گیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا برگد کے اونچے جھنڈ والے درخت کے اوپر ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی اور میرا دل دھڑک رہا تھا، اتنے زور سے کہ تم گھبرا گئی تھیں۔ چاند کا نرم اور شفاف سونا ہماری سانس میں کیسی چنگاریاں بھڑکا رہا تھا۔ تمہارے گال اور میرے ہونٹ کس طرح جل اٹھے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ آگ یوں جلا بھی سکتی ہے، اس وقت وہ رات ایک خواب محسوس ہوتی تھی۔ اور اب، اس وقت ہر چیز ایک دیوانے کا خواب لگ رہی ہے۔ روز کیا تم کو بھی اس چاندنی رات کی، اس نیلے آسمان پر بادلوں کے لہراتے ہوئے بادبانوں کی، ہوا کی سنسناہٹ اور چنگاریوں کی یاد آتی ہے؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یاد انسان کی سب سے وفادار دوست ہے ....اور سب سے خطرناک دشمن۔

میں اس جادو کو آج تک نہیں سمجھ سکا۔ کیا تم سمجھ سکی ہو۔ گرمی جو دل سے نکلتی ہے اور رگ رگ میں دوڑ جاتی ہے۔ یہ آگ آنکھوں اور ہونٹوں میں دوڑ جاتی ہے۔ یہ آگ گالوں کی خوشبو اور پیشانی کی شبنم میں حل ہو جاتی ہے۔ دو لویں ملتی ہیں۔ ہونٹوں کی آگ آنکھوں، گالوں اور ہونٹوں پر ٹھنڈی چنگاریوں اور دہکتی ہوئی شبنم کی طرح برستی ہے۔ انگلیاں خوابوں اور آرزوؤں سے انگڑائی لیکر ابھرنے والے جسم کی نرمیوں اور گرمیوں سے کھیلتی ہیں اور..

۔۔۔۔۔اور پھر جسم اچانک اجنبی بن جاتا ہے۔ چاند کی روشنی گردو غبار میں دب جاتی ہے آدمی گردو غبار کو چیر کر پھر اس جسم کی طرف لپکتا ہے ۔۔۔ وہ جسم کی اجنبیت پر ذرا حیران نہیں۔ جسم کی یہ اجنبیت تو ایک خود فریبی ہے لیکن وہ تو اس روح کو تلاش کر رہا ہے جو کبھی اپنی تمام معصوم نرمی اور گرمی، تمام تر سپردگی کے ساتھ اس کی روح کے اندر تیرتی چلی گئی۔ اب وہ روح کہاں ہے؟ جان کہاں ہے؟ جس کی قسم کھائے ۔۔۔۔ لیکن یہ سب بکواس ہے۔ روح ہو یا جسم ۔۔۔۔۔ روز مجھ سے بہت دور جا چکی ہے ۔۔۔۔۔ لیکن یہ یاد، یہ لمس، یہ گرمی مجھ سے اتنی قریب کیوں ہے ۔۔۔۔ واقعی یاد انسان کی سب سے وفادار دوست، ہاری ہوئی تمناؤں کی سب سے سخت جان سہیلی ہے۔

۔۔۔۔۔۔چند دن اور، کھڑکی سے چھنتی ہوئی بیمار، مغموم اور خاموش روشنیوں ۔۔۔ میں تم کو چھوڑ کر جا رہا ہوں ۔۔۔ ہجر و وصال کا گیت گاتی ہوئی پھوارو ۔۔۔۔ میں تم سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ میں اپنی محبت کی قبر تمہارے سپرد کر جاؤں گا۔ پھوارو اور روشنیو، تمہارے سوا اور کوئی بھی قبر پر آنسو بہانے نہ آئے گا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس نے ڈائری لکھنے کا ارادہ چھوڑ دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ چاندنی کا رنگ پھیکا ہو گیا تھا۔ باہر برفیلی ہوا کا ایک جھونکا تیزی سے ابھرا۔ اور درختوں کو جھنجھوڑتا اور سیٹی بجاتا ہوا کہیں دور نکل گیا۔ اس کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ اٹھ کر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور سگریٹ سلگائی۔

اس کے باپ کی بڑی تمنا تھی کہ جب بیٹا ڈاکٹر بن کر کسی ہسپتال کا کام سنبھالے گا تو وہ اس کے ساتھ رہے گا۔ اس کی شان دیکھے گا۔ وہ ایک کھاتا پیتا کاشتکار تھا۔ لیکن پہلی عالمگیر جنگ میں لڑ چکا تھا۔ دنیا کا سرد گرم دیکھا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد انگریز افسروں اور ہندوستانی صاحبوں سے اس کی نہ بنی اور اس نے ڈاکٹر کو رشوت دے دلا کر فوج سے چھٹکارا حاصل کیا اور موروثی کھیت سے دلچسپی لینے لگا۔ اس زمانے میں اسے اپنے گاؤں میں ایک دور کی

رشتہ دار جوان بیوہ سے عشق ہوگیا اور اس نے تمام لوگوں کے سمجھانے کے باوجود اس سے شادی کرلی۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔ "یہ الو کے پٹھے سمجھتے ہیں اگر میں ان کی لڑکیوں سے شادی کرلوں تو وہ کبھی بیوہ ہو ہی نہیں سکتیں۔" اس کی بیوی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "تم ایسی باتیں کیوں منہ سے نکالتے ہو۔۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔ میرا مطلب ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے پیازی آنچل کا کونا دانتوں سے دبالیا تھا۔ اور اس کی بڑی بڑی غمزدہ، نم آنکھیں جھک گئیں تھیں "میں تو اپنے آپ سے ڈرتی ہوں۔ میں بہت منحوس ہوں۔ ہمارا بچہ خدا کرے۔۔۔۔۔۔" وہ اچھلا اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے جیسے تالیاں بجا کر ناچنا چاہتا ہو۔ پھر اچانک بیوی کو گود میں اٹھا کر اس کی آنکھوں، ہونٹوں اور بالوں کو چومنے لگا۔ "بیٹا۔۔۔۔ ہونا چاہئے۔ سب کا منہ گھی شکر سے بھر دوں گا۔ وعدہ کرو۔ بولو۔ بولو۔۔" اس نے بے تحاشا اس کو گدگدانا شروع کردیا۔ اس کے پیٹ میں بل پڑگئے۔ اور وہ اس کے بازوؤں سے نکلنے کے لئے تڑپنے لگی۔ اس کی چاندی کی پازیب بجنے لگی، چوڑیاں جھنجھنانے لگیں اور گلابی آنچل مٹی کے فرش پر لوٹنے لگا اور وہ اس کو لئے ہوئے پلنگ پر آگیا اور دیر تک اس کو سینے سے لگائے بڑبڑاتا رہا۔ "۔۔۔ بیٹا۔۔۔ بیٹا۔۔۔ بیٹا۔"

بیٹا تو پیدا ہوا مگر اس کی بیوی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور اپنے سیاہ پڑتے ہوئے ہونٹ دبا کر اپنے درد برداشت کرتی رہی اور آخر اپنے لال کی صورت دیکھے بغیر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ وہ اپنے بچے کو کلیجے سے لگا کر چیخ چیخ کر رویا اور پھر یکایک خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد کسی نے اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھے۔ کبھی کسی نے اس کے منہ سے بیوی کا ذکر نہ سنا۔ مؤذن اذان دے رہا تھا کہ اس نے اپنی بہن کو جگایا۔ اس کی ادھیڑ عمر کی بہن چونک کر آنکھ ملتے ہوئے اٹھی۔ "کیا ہے؟" اس نے اپنی بہن کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "تم نے مجھے ماں کی طرح پالا ہے۔ اب نئے پودے کو بھی جوان کرو۔ ہم دونوں اس پیڑ کی گھنی چھاؤں میں زندگی کاٹ دیں گے۔" اس کی بہن نے بچے کو سمیٹ کر کلیجے سے لگایا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

جاوید کو یہ باتیں کہاں معلوم تھیں۔ اسے اتنا یاد تھا کہ شروع میں اس کے باپ کی مونچھیں اوپر کو مڑی ہوئی کڑا کے دار تھیں۔ کالی اور اینٹھی اینٹھی ... اس کی آنکھیں اکثر بجھی بجھی رہتی تھیں۔ لیکن اسے یاد تھا کہ کبھی کبھی اس کو پیار کرتے وقت اس کے باپ کی بڑی بڑی آنکھوں میں شعلہ سا چمک کر بجھ جاتا تھا۔ یقیناً یہ دیا سلائی کی تیلی کا شعلہ تو تھا نہیں جس کا عکس اس نے اکثر ان آنکھوں میں دیکھا تھا جب وہ بیڑی کو دانتوں تلے دبا کر اور شعلے کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تتلی کی طرح چھپا کر تمباکو کے مہکتے ہوئے دھوئیں کا پہلا کش چھپر کی طرف اڑاتا تھا۔ جب جاوید مکتب سے نکل کر اسکول میں داخل ہوا تو اسے اپنے باپ سے دور ہونا پڑا، کیونکہ قریب ترین اسکول دس کوس کے فاصلے پر تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ ضرور بیٹے کے پاس آتا اور اس کے لئے گھی، باسمتی چاول، دہی، مرغی گوشت اور انڈے لاتا۔ ایک بار جب اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے جاوید کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کی ذہانت اور پڑھنے لکھنے کی تعریف کی تو اس نے دیکھا کہ اس کے باپ کی انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ مونچھیں پھڑک رہی ہیں اور آنکھوں میں وہی شعلہ کوند گیا ہے جس پر جاوید جان دیتا تھا۔ جب ہی تو اس نے اپنے اسکول کے بہت سے ہم عمر لڑکوں کو یہ خبر سنا کر بھونچکا کر دیا تھا کہ "میرے ابا جادوگر ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آگ جلتی ہے۔ ان کو غصہ کبھی نہیں آتا۔ وہ جتنا زیادہ پیار کرتے ہیں یہ آگ اتنی ہی چمکتی ہے۔۔ اللہ کی قسم، ہاں میں کوئی جھوٹ تھوڑے ہی بول رہا ہوں، چل کے دیکھ لو!" اس کے باپ نے ہیڈ ماسٹر کو بھی تحفے پہنچانا شروع کر دیئے، لیکن بیٹے کے حصے میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

جاوید چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا اور میٹرک کے امتحان کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کا باپ بچی کھچی زمین پر بڑی محنت کرتا۔ اکثر خود بھی کھیت میں اتر جاتا۔ کبھی ہل چلاتا کبھی مٹی برابر کرتا کبھی کیاریوں میں پانی دوڑاتا۔ اب اس کی کنپٹیوں کے بال راکھ کے رنگ کے ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد مکڑی کے جالے جیسی جھریاں پڑ گئی تھیں۔ مونچھیں بھی کھچڑی ہو گئی تھیں اور پیٹھے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ بہت خاموش رہتا تھا۔ شام کو واپس آتا تو کنوئیں پر کھڑا کھڑا بالٹی سے اپنے اوپر پانی انڈیلنے کے بعد گمچھے سے بدن صاف کرتے ہوئے

جاوید کے پاس آتا، کرتا پہنتا، لکلکتیا لنگی دوبارہ کس کر کمر پر باندھتا۔ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑتا اور کہتا۔ "چلو کھیتوں کی سیر کریں۔ دھان پک رہا ہے۔ اس کی خوشبو مجھے بہت سوندھی اور اچھی لگتی ہے۔" جاوید خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیتا۔ رات کے وقت وہ خود جاوید کے لئے لالٹین جلاتا اور تپائی پر لاکر رکھ دیتا۔ ایک دن اس نے جاوید کی کھلی ہوئی کاپی پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنی مخصوص بھاری اور کھردار آواز میں پوچھا"۔ "بیٹا یہ بتاؤ تم حساب میں کیسے ہو؟"

جاوید نے لالٹین کی زرد روشنی میں اپنے باپ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلہ جل اور بجھ رہا تھا۔ "اچھا ہوں ابا، کافی اچھا"۔ گھنی مونچھوں کے نیچے سے مسکراہٹ کی ایک موج اُبھری اور اس کے پورے چہرے کو سیراب کرگئی۔ اس کے کان سُرخ ہوگئے اور آنکھوں کا شعلہ جلا تو پھر جلتا گیا۔ "کیوں ابا؟"

اس نے بیٹے کے شانے پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ اس کے ہاتھ کی کاپی پنسل لالٹین کے پاس جاگری۔ اس نے اپنے باپ کا زوردار قہقہہ سنا۔ "بس ٹھیک ہے بیٹے۔ حساب میں مضبوط ہو تو میں تمھیں ڈاکٹر بنانے کے لئے اپنی کھال تک بیچ دوں گا۔ اچھے بیٹے۔ پڑھو۔ پڑھو۔" اس نے چمکارا اور اٹھ کر آنگن میں چلا گیا۔ اس کی گرجتی ہوئی آواز آئی: "بوبو لونڈا بہت دبلا ہو رہا ہے۔ پیلا پڑگیا ہے۔ پڑھنا لکھنا کھیل نہیں۔ آج سوتے وقت اسے دو پیالے دودھ پلادینا۔ ایک سے کیا ہوتا ہے۔ جس بچے کو ماں کا دودھ نہ ملا ہو........." اس کی آواز آنسو بن کر گلے میں پھنس گئی اور وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ جاوید بار بار کاپی کھولتا اور اسے سفید کاغذ پر صرف ایک لفظ ناچتا ہوا نظر آتا........ "ڈاکٹر.....ڈاکٹر.....ڈاکٹر....." یہ لفظ بلبلوں کی طرح ابھرتا۔ یہ بلبلے تیرتے اور ٹوٹ کر پھول بن جاتے اور ہر پھول سے ہزار رنگ کی تتلیاں اڑتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ وہ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رات اکارت گئی۔ وہ بالکل نہ پڑھ سکا۔ اس کی نگاہیں رنگین بلبلوں اور پھولوں سے کھیلتی رہیں۔

"جاوید آج کب تک جاگتے رہوگے۔ میاں اب دودھ پیو۔ اور سو جاؤ"۔

وہ خود آیا اور اسے تام چینی کے بڑے پیالے سے دودھ پلانے کے بعد لالٹین بجھا کر

کمرے سے باہر نکل گیا۔ بہت دیر تک جاوید کی آنکھ نہ لگی۔ وہ آنکھ بند کرتا تو پھر وہی بلبلے اور پھول ناچنے لگتے۔ آنکھ کھولتا تو اسے اندھیرے میں ابا کی آنکھوں کا شعلہ لپکتا ہوا نظر آتا۔ اس نے کروٹ بدل لی لیکن نیند نہ آئی۔ پھر اس نے ایک آہٹ سنی۔ کوئی دبے پاؤں کمرے میں چل رہا تھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "چور"۔ لیکن اس کی آواز گلے میں گھٹ گئی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک گرم ہاتھ نے اس کی پیشانی کو چھُوا اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک سنہرا شعلہ اندھیرے میں کوندگیا۔ "ابا۔۔۔۔" جاوید اپنے باپ سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آگئی۔ باپ نے اس کو لحاف اڑھایا رُکا اور بیڑی سلگا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا جہاں الاؤ کی روشنی سسک رہی تھی۔

ایک دن بنیے کی دوکان کے سامنے چوپال میں گاؤں کے کچھ لوگوں نے جاوید کو روکا۔ "بیٹے کہاں جارہے ہو" پھر اس کو پاس بلایا اور اپنی چارپائی کے ایک کونے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ لوگوں کے منہ سے تاڑی کا کھٹا بھپکا آرہا تھا۔ "میاں پڑھ لکھ کر کیا کروگے آخر اسی زمین کو جوتنا اور کھانا ہے! تمہیں تو بیل کی دم مروڑنا بھی نہ آتا ہوگا۔ ہل کیسے سنبھلے گا۔ دنیا میں آج تک ایسا نہ ہوا کہ کتابیں کھیت میں بودو اور لہلہاتی فصل کاٹ لو۔ کاغذ بوؤ اور سونا اگاؤ۔" سب نے قہقہہ لگایا۔ مولوی کے انداز میں عجیب مسخرہ پن تھا۔ اس نے چلم سے ایک زوردار کش کھینچا اور شام کے دھندلکے میں ناک سے دھواں نکالتے ہوئے ہنس کر دوبارہ کہنا شروع کیا: "تمہارے باپ نے خود تو ایک بیوہ کے لئے زندگی کا اچار ڈال دیا۔ اب کیا تمہارا معجون بنائے گا۔ میاں پتہ بھی ہے تمہارے اسکول، کاغذ، قلم اور پنسل کی خاطر کیا گل کھل رہے ہیں۔ تمہارے دادا نے اپنی ہڈی چمڑی ایک کرکے جو زمین چھوڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ٹکڑے ہو کر بک رہی ہے۔ خیر خدا کرے تم علم حاصل کرو اور علم کے زور سے زمین پر ہل چلا سکو۔ ہونہہ ہمیں کیا۔ اچھی بری تمہارے ہی آگے آئے گی۔ اچھا اب جاؤ اور خوش رہو۔"

اس کے سر میں یہ باتیں جھینگر کی چیخ کی طرح گونجتی رہیں۔ وہ رات بھر نہیں سویا۔ اپنے باپ کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ کس طرح دانت پیس کر ٹھنڈی سانس لیتا

تھا۔ اب اس کی مونچھوں میں وہ اینٹھن نہ تھی۔ وہ بیڑی پیتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ زہر پی رہا ہے۔ وہ بیٹھا بیٹھا آنکھیں بند کر لیتا۔ جیسے آنسو خشک کر رہا ہو۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اور ہاتھوں کی رگیں سانپ کی طرح نظر آتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اندرونی ہیجان اس کے ہاتھ کی رگوں کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ تبھی تو وہ اکثر چیزوں کو پٹک دیتا تھا ایک چھناکے، ایک دھماکے کے ساتھ۔ رات کو جب لالٹین بجھ گئی۔ نُوا جائے نماز بچھا کر تہجد ادا کرنے کے لئے کھڑی ہو گئیں۔ جھینگروں اور مینڈکوں اور سیاروں کی آوازوں کے سوا رات کے سناٹے کو چیرنے والی اور ساری آوازیں سو گئیں تو جاوید نے بڑبڑانے کی آواز سُنی۔ یہ آواز اس کے باپ کے کمرے سے آرہی تھی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے لیکن کچھ سُن نہ سکا سوائے بڑبڑاہٹ کے۔ اسی طرح صبح ہو گئی۔ اس کا باپ اٹھا اور کھنکھارتا ہوا کوٹھری سے نکلا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور اپنا گرہ دار ڈنڈا اٹھا کر باہر نکلا۔ نیم کے درخت کے نیچے اسے اپنا بیٹا نظر آیا۔ "ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو دیکھنا چاہتے ہو سورج کس طرح نکلتا ہے۔ آؤ تمہیں اس کی بہار دکھاؤں"۔

دونوں خاموش چلتے رہے۔ نالے سے آگے جا کر کھجوروں کی ٹیڑھی سیڑھی قطار کے پاس اس کا باپ رک گیا۔ "دیکھو وہاں اس جنگل کے پیچھے کیسی آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ آگ سورج کی روشنی ہے۔ ابھی نہیں۔۔۔۔۔ دیکھو یہ رہا دمکتا ہوا سورج۔ میں روز صبح اسے دیکھتا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے۔ میرے ساتھ آتا ہے کھیتوں میں اور میرے ساتھ ہی واپس گھر جاتا ہے۔ کتابوں میں نہ جانے اس کے بارے میں کیا لکھا ہو گا۔ کبھی مجھے اس کا قصہ سنانا۔ ہم تو بیٹا جاہل ٹھہرے!"

"ابا میں ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا!" باپ نے بیٹے کو دیکھا۔ جاوید کے نچلے ہونٹ سے خون نکل رہا تھا اور اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

"کیوں؟" باپ نے دہکتے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کھیت بیچ رہے ہیں۔ پھر آپ کے پاس کیا رہ جائے گا؟" باپ نے بیٹے کی طرف دیکھا اور خون کا گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا۔

"کس نے تمہارے دماغ میں یہ زہر بھرا ہے۔ کل تم ان کتوں کے پاس کیوں بیٹھے تھے ؟"
اتنا کہہ کر وہ اچانک پلٹا اور کھیت کے بیچوں بیچ دوڑتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا۔ جاوید اس کے پیچھے لپکا۔ جب وہ مسجد کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کے بھیڑ لگی ہوئی ہے اور مولوی کی داڑھی لہولہان ہے۔ "میں کہتا ہوں جب میں کیچڑ میں ڈھیلا نہیں پھینکتا تو کیچڑ میرے پیروں سے کیوں چپکتا ہے۔ میں کہے دیتا ہوں پھر کسی نے حرامی پن کیا تو خون پی جاؤں گا، مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ تمہارے قاضی کا بھی نہیں اور تمہارے باپ انگریز بہادر کا بھی نہیں۔" اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور گاؤں کے کنارے کنارے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ جاوید کے کانوں نے سنا۔ "پاگل ہے جنم کا۔ اس کی آنکھوں میں تو خون تیرتا رہتا ہے۔ دیکھنا کسی نہ کسی دن خون کر کے رہے گا۔"

اس دن اس کا باپ پھر گھر سے نہ نکلا... آنگن کی دھوپ میں لیٹا بیڑی پیتا رہا اور ڈھلے ہوئے نیلے آسمان میں چیلوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھتا رہا جو قصاب کے گھر سے گوشت اور چھیچھڑے چنگلوں میں جھپٹ لاتی تھیں۔ کبھی چنگل سے چھیچھڑا چھوٹ جاتا۔ چیلیں ہوا میں تیزی سے غوطہ لگاتیں اور مال غنیمت کو دوبارہ جھپٹنے کے لئے ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں۔ جاوید نے اپنے باپ کے منہ سے دن میں صرف ایک جملہ سنا۔

"آدمی اور چیل میں زیادہ فرق نہیں ہے۔"

رات کے وقت سونے سے پہلے وہ جاوید کے پاس آیا اور لالٹین کی بھڑکتی ہوئی لو کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا: "بیٹے تم جانتے ہو تمہاری ماں کیوں مری اور میں تمہیں ڈاکٹر کیوں بنانا چاہتا ہوں ؟" ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے سینے میں دھواں بھرا ہوا ہو، اور اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ جاوید نے اپنے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
"اب میں کچھ نہیں کہوں گا ابا۔" جاوید کا باپ ہنسا۔ "بے وقوف تم نے ٹھیک کیا کہہ دیا۔ اور پھر کبھی وہ بدمعاش تم سے بکے تو مجھے بتانا میں اس کی ٹانگیں چیر دوں گا۔" جاوید کو پہلی بار اپنے باپ کا چہرہ اتنا بھیانک نظر آیا کہ وہ کانپ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے کی سختی غائب ہوگئی اور اس نے زور سے سانس لیتے ہوئے کہنا شروع کیا: "میں چاہتا ہوں

جب تم کسی سے بیاہ کرو اور جب تمہارے باپ بننے کا وقت آئے تو ایسا نہ ہو کہ تم ڈاکٹر کے پیروں پر گر کر فریاد کرتے رہو اور وہ اپنے پیر کھینچ کر ڈولی میں بیٹھ جائے۔ اور کہار ہاتھی والے راجہ بہادر کے زکام کا علاج کرنے کے لئے اسے لے کر غائب ہو جائیں اور جب تم گھر آؤ تو......"

جاوید نے پہلی اور آخری بار باپ سے اپنی ماں کا ذکر سُنا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں ابا میں ضرور ڈاکٹر بنوں گا"۔ باپ نے اسے گلے سے لگالیا۔ دودھ پلایا۔ لالٹین بجھائی اور اس کا سر سہلا کر آہستہ سے بولا: "بیٹے تم کل ہی شہر چلے جاؤ۔ وہاں امتحان کی بہتر تیاری کر سکو گے۔"

کلکتہ میں ڈاکٹری پڑھنے کے دوران میں جاوید سال میں ایک بار گھر آتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچتا تو اس کا باپ نیم کے درخت کے نیچے سے اپنے بیٹے کی طرف لپکتا۔ جاوید گھوڑے کی پیٹھ پر سے کودتے ہی اپنے باپ سے لپٹ جاتا۔ دونوں کی آنکھیں بھر آتیں۔ دونوں ایک لفظ نہ بولتے۔ پھر اپنے بیٹے کو کھڑا چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹتا۔ "بانکا جوان ہو گیا تو تو۔ کیا خوبصورت تیور ہیں۔ لیکن تم اتنے کمزور کیوں لگ رہے ہو؟ یہ بات مجھے نہیں جچی۔ اچھا دیکھنا اب کے تمہیں پہلوان بنا کر نہ بھیجوں تو کہنا۔ ایک بھی دوست پہچان لے تو چہرے پر مونچھ......"
وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ پھیرتا اور گھوڑے کی لگام کسی گھیرے کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہتا۔ "ارے سنو بہادر کو چارے میں ذرا چنے زیادہ دے دینا۔ دور کا سفر کیا ہے بیچارے نے۔ چلو بیٹے تمہاری بُوا تمہارے لئے بے قرار ہیں....." وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر چلا جاتا۔ شہر کی روشنی، ہنگامہ خیز دوڑ دھوپ اور چمک دمک کے بعد اچانک جاوید کو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بہت ہی پرسکون جنگل میں آگیا ہے جہاں چشمے بہتے ہیں، درخت سانس لیتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں، سورج نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے اور ایک خاموش غمگی ہر چیز میں تیرتی رہتی ہے۔ اسے صبح و شام کے دھندلکے میں خاص لطف آتا۔ شہر میں کب سورج نکلتا اور کب ڈوبتا اسے پتہ ہی نہ چلتا اور یہاں....... وہ اپنے باپ کو دیکھتا اور شربت پیتا۔ کیوڑے کی خوشبو اس کی نس نس میں دوڑ جاتی۔ وہ بے وجہ ہنستا اور اپنے ہونٹ چاٹتا۔ اس کے باپ کی مونچھیں

پہلی ملاقات کے وقت ہونٹوں کے کناروں تک جھکی نظر آتیں لیکن بعد میں تن کر آنکھوں کی طرف اشارہ کرنے لگتیں۔ وہ دیکھتا کہ اس کا باپ بوڑھا ہوتا جارہا ہے۔ آنکھوں کے گرد اس کی جھریاں گہری اور پیشانی پر شکنیں بڑھ گئی ہیں۔ اس کے ہاتھوں کی کھال ڈھیلی ہوگئی ہے۔ لیکن اس کی آواز میں وہی کھرج، وہی غم انگیزی، وہی للکار باقی تھی: "جاوید بیٹے تمہاری مونچھیں تو بالکل نئے ڈھب کی ہیں اتنی باریک جیسے مچھلی کا کانٹا۔ دور سے بالکل دکھائی نہ دیں۔ خیر بھئی یہ تمہارا زمانہ ہے۔ تمہاری شرمیلی مونچھوں کا زمانہ ہے۔ تم شہر کے لوگ ٹھہرے ہمارے زمانے میں لوگ بھی تگڑے ہوتے تھے اور ان کی مونچھیں بھی۔"

لیکن جاوید جانتا تھا کہ یہ زور، یہ جوش محض اوپری تھا۔ اندر اندر اس کی تعلیم کے خرچ نے اس کے باپ پر اتنا بوجھ ڈالا تھا کہ وہ ایسا ہوگیا تھا۔ اس نے زمین کا بڑا حصہ بیچ دیا تھا۔ لیکن جو کچھ اس کے پاس رہ گیا تھا اس پر وہ جان توڑ محنت کرتا تھا کہ زیادہ فصل پیدا ہوسکے۔ زمین کتنی ہی زرخیز ہو، بل بیل کتنا ہی تھکیں، اور انسان کا خون پسینہ کتنا ہی ٹپکے قطرے کو دریا نہیں بنایا جاسکتا!

اس کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ اس کا باپ بیمار تھا۔ وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ کھیت اداس پڑے تھے۔ جاوید نے باپ کو دیکھ کر ایک نسخہ لکھا اور اس کے لئے دوا منگوائی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا لیکن اس کی واپسی کے وقت تک اس کا باپ اس کے علاج سے اچھا ہوگیا۔ ایک دن کھیت کی طرف جاتے ہوئے اس نے جاوید سے کہا۔ "دیکھتے نہیں یہ درخت ہریلوں سے پٹا پڑا ہے۔ سنو کس طرح پھڑ پھڑا رہی ہیں اور سیٹیاں بجا رہی ہیں۔ تم شکار کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کبھی بندوق کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بچی اس لئے نہیں کہ تم بڑے ہوکر چلاؤ گے۔ لائسنس ہوگا تو تمہارے نام کردینے میں آسانی ہوگی۔" دوسرے دن اس نے خود بندوق صاف کی اور اسے شکار پر لے گیا۔ بیماری کے بعد وہ تھک کر چور ہوگیا تھا۔ لیکن برابر ہنستا رہا۔ اس نے ہریل کی طرح سیٹی بجائی پیپل کے ایک درخت سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جاوید نے بندوق چھتیا کر لبلبی دبادی۔ سینکڑوں ہریلیں اڑ گئیں۔ ایک بھی نہ گری۔ جاوید کھسیا گیا۔

"میاں پہلا نشانہ خالی جائے تو آخری نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا!" باپ نے بیٹے کے

شانے پر تھپکی دی۔ جب چھٹی ختم ہوئی اور جاوید چلنے لگا تو اس کے باپ نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تمھاری ڈاکٹری نے تمھیں یتیم ہونے سے بچالیا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس وقت جاوید کو کیا معلوم تھا کہ وہ اپنے باپ سے آخری بار گلے مل رہا ہے۔

جب اس کو دوبارہ اپنے باپ کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً گھر بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن وہ نہ جاسکا۔ ایک ضروری تجربہ کرنا تھا اور پھر روز کے ساتھ ایک ڈرامے میں پارٹ کرنے کی مجبوری نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ جس دن اس کا تجربہ ختم ہوا۔ اس نے روز سے کہا۔ "میں ڈرامے میں پارٹ نہ کرسکوں گا۔ ابا بیمار ہیں۔" روز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم تو بچوں کی طرح گھبرا جاتے ہو۔ یہ تمھارا آخری سال ہے۔ تم گھر کیسے جاسکتے ہو۔" جاوید نے مٹھیاں کس لیں اور آنکھیں بند کر کے پارک کے بنچ پر اپنا سر رکھ دیا۔ نرم انگلیاں اس کے بالوں سے کھیلتی رہیں اور ٹھیک اس وقت سیکڑوں میل دور گاؤں کے ایک گھر میں جس کی دیواروں سے پرانی مٹی کی سوندھی خوشبو آرہی تھی، اس کے باپ کی آنکھوں میں شعلہ آخری بار بھڑکا اور ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ مٹی کی خوشبو میں لوبان، گلاب، اگربتی اور کافور کی خوشبو بس گئی۔

جاوید سر کے نیچے ہاتھ رکھے بے خیال ٹانگیں ہلائے جارہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو آہستہ آہستہ بہہ کر رخساروں پر دوڑ رہے تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک اٹھا۔ دھوپ آنگن میں کھیل رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہاں جنگی اور نُوا کھڑے تھے۔ جنگی نے فوجی انداز میں سلامی داغی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ گاؤں میں درزی کا کام کرتا تھا۔ لیکن بعد میں مشین بیچ دی اور جاوید کے باپ کی مدد کرنے لگا۔ سنکی تھا۔ لیکن دل کا اچھا تھا۔ اب اس نے جاوید کی دیکھ بھال اور اونچ نیچ کی تمام تر ذمہ داری بزعم خود اپنے سر لے لی تھی۔ نُوا کو وہ اپنی ماں کی طرح چاہتا تھا۔ اس نے سامان اٹھا اٹھا کر آنگن میں رکھا۔ اپنی بکری ایک پائے سے باندھی اور پاندان اور جائے نماز نُوا کے پاس رکھتے ہوئے بولا۔ "اپنے ڈاکٹر بیٹا کو

پان کھلا کر ہسپتال بھیجنا۔ تم جانو منہ جتنا لال ہو گا تمہاری بہو اتنا ہی دولہا میاں پر ریجھے گی۔"

جاوید نے زوردار قہقہہ لگایا اور نُوا کے پاس بیٹھ گیا۔ نُوا نے اس کی بلائیں لیں اور ان کی دسوں انگلیاں چٹخ گئیں۔ "نُوا ذرا انگلیوں کو بچا کر رکھنا۔ جلدی ہی تمہاری بہو آئے گی۔ اس وقت انگلیاں نہ بجیں تو۔" جنگلی نے اپنی بکری کی داڑھی سہلاتے ہوئے کہا۔

"جنگلی میاں یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر تم اپنی بکری دلہن کو یہاں کیوں لے آئے۔ یہاں گھر میں تو بڑی گندگی ہوگی۔" جاوید نے اس کو گھورتے ہوئے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ارے واہ بڑی گندگی ہوگی۔ وہ کوئی تمہارے بستر پر تھوڑے سوئے گی۔ اس کے لئے میں الگ گھر بناؤں گا۔" اس نے بکری کی رسی پکڑی اور باہر نکل کر اسے مہندی کے پیڑ سے باندھ دیا۔

نُوا نے پوپلا منہ کھول کر بے آواز قہقہہ لگایا۔ پان کی پیک کا ایک قطرہ ان کے دھوپ جیسے سفید آنچل میں ٹپک کر جذب ہو گیا۔ جاوید نے بڑھ کر اگالدان ان کے سامنے رکھ دیا۔

"کام پر کب جاؤ گے؟" نُوا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی۔ بس اب بھاگنا ہی چاہیے۔ میں پڑا پڑا خواب دیکھتا رہا اور آپ کو گاڑی یہاں لے آئی۔"

وہ اٹھا اور کمرے کی طرف بھاگا۔ اور نُوا کمر سے ہتھّی ٹکّی آہستہ آہستہ اپنی دلی والی جوتیاں گھسیٹتی ہوئی اور پوپلے منہ سے پان کا رس چوستی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ "نگوڑا آتے ہی اپنی بکری کے چکر میں پڑ گیا۔ ناشتہ چائے کچھ نہیں۔ بس بکری ہی سب کچھ ہے۔ خدا کا تو ڈر رہا ہی نہیں اس نکھٹو کو۔"

"کیا بک رہی ہو نُوا۔ کچوریاں اور انڈے تو تل دو۔ اس سے بڑھیا ناشتہ اور کیا ہو گا۔ میں آٹا گوندھتا ہوں۔ میری بکری کو کچھ نہ کہو۔ وہ غریب تو گھاس چر رہی ہے۔"

"گھاس نہ چرتی تو کیا ہاتھی گھوڑا چرتی۔" نُوا آہستہ سے بڑبڑائیں اور چولہے میں کوئلہ ڈالنے لگیں۔ آناً فاناً باورچی خانہ دھوئیں سے بھر گیا اور اس نئے کوارٹر کے کھپریل کے چھپر سے دھواں چھن چھن کر تاڑ کے اونچے پیڑوں کی پھنگیوں کی طرف اڑنے لگا۔

4

جاوید سرمئی فلالین کی موٹی پتلون، بھورے کوٹ اور عنابی رنگ کی قمیص پہنے، ہاتھ میں آلہ لئے تازہ تازہ سلگائی ہوئی سگریٹ ہونٹوں میں دبائے، اپنے سیاہ جوتوں کی پالش پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اپنے کوارٹر سے باہر نکلا۔

اس کی قمیص کے کالر حسب معمول کھلے ہوئے تھے اور اس کے بال جو نہانے کے بعد پوری طرح سوکھے نہ تھے۔ بائیں طرف زیادہ جھکے نظر آرہے تھے۔ اس نے ہسپتال کے زینے پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اپنی دائیں بائیں طرف مریضوں کی منتظر اور تجسس بھری نظریں دیکھیں۔

"بھئی آپ لوگ ایسا کیجئے کہ مرد مریض ادھر بائیں طرف سے داخل ہوں اور عورتیں اور بچے دائیں طرف والے زینے سے۔ عورتیں دھکے سے بچ جائیں گی!" اس نے مسکرا کر دیکھا۔ عورتیں اپنے اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑ کر اور گھونگھٹ کھینچ کر بائیں طرف والے زینے کی طرف بھاگنے لگیں۔

بڑی سی میز کے سامنے گھومنے والی گول کرسی پر بیٹھتے ہی اسے ایک نیا اور پُر اسرار مزہ محسوس ہوا۔

سامنے شیشم کے آرام دہ بنچ پر ایک وجیہہ سفید پوش آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے اور دو پلی ٹوپی سر پر جمی ہوئی تھی۔

وہ ڈاکٹر کو دیکھ کر بڑے دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ "ڈاکٹر صاحب آداب عرض ہے۔ میں دربار کا منشی ہوں بنسی لال۔"

"آداب"۔ جاوید نے قلم اٹھایا اور سگریٹ راکھدان میں رکھ دی۔ "کہئے کیا تکلیف ہے آپ کو"۔

منشی بنسی لال یوں مسکرایا جیسے جانتا ہی نہ ہو تکلیف کس چڑیا کا نام ہے۔

"مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ میں تو تکلیف دینے آیا ہوں۔ شام کو سرکار نے آپ کو یاد کیا ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد۔" منشی لال اپنی پتلی انگلیوں سے میز کو بجانے لگا۔

جاوید نے تیکھی نظروں سے اسے اس طرح گھور کر دیکھا کہ اس کی جو انگلیاں میز پر تھیں وہ میز پر رہ گئیں اور جو ہوا میں بلند تھیں وہ اسی طرح ہوا میں بلند رہ گئیں۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹے اور بولا۔ "تو آپ آئیں گے نا؟ کیا کہہ دوں؟" اس کا لہجہ کچھ دھمکی جیسا ہو گیا۔

جاوید نے سنی ان سنی کر دی۔ اور بائیں ہاتھ پر عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں بوڑھی ماں کیا دکھ ہے تم کو؟"

بڑھیا نے بڑی لجاجت اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ کہا۔ "میرا سوانگ مر رہا ہے مائی باپ۔ وہی ایک بیٹا ہے۔ میری لاٹھی"۔ وہ رونے لگی

"بوڑھی ماں روتی کیوں ہو۔ میں دیکھوں گا تمہارے بیٹے کو۔ کہاں ہے؟"

"گھر پر۔ دو کوس ہے یہاں سے۔ براہیل گھوڑا نا ہیں دے۔ پیدل وہ چل نہ سکے۔ ہم بڑھیا کا کریں؟" وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔

"تم گھر جاؤ۔ چماری کو بتا دو پتہ۔ میں آجاؤں گا"۔ بڑھیا کو یقین نہ آیا اور منہ کھول کر اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ لیکن دوسروں نے کہنیاں مار کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

ایک لڑکے کے کراہنے کی آواز آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ جب جاوید نے اس کی ران پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں رکھیں تو وہ چیخ پڑا۔ "لمبے چوڑے مرد ہو پھر چیختے کیوں ہو؟"

لڑکے نے فوراً چیخ کو دبا کر کہا "میں مرد کہاں ہوں میں تو لڑکا ہوں"۔ اور پھر رونے لگا۔

جاوید نے کمپونڈر سے آپریشن کے لیے کہا اور تیسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گیا اور کنکھیوں سے بنسی لال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ تشریف لے جایئے میں آؤں گا۔"

بارہ بجنے کو آئے اور جاوید یکے بعد دیگرے بھانت بھانت کے مریضوں کو دیکھتا اور نسخے لکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی اجنبیت دور ہو گئی۔ اب وہ مریضوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ کسی کی نبض دیکھتا، کسی کی آنکھیں، کسی کے دل کی دھڑکن سنتا اور ہنس کر کہتا۔ "تمہارا دل تو اس شان سے دھڑک رہا ہے کہ سو برس اس میں زنگ نہ لگے۔ مہاشے آپ یوں ہی گھبرا گئے ہیں۔ میں دوا دیتا ہوں۔ مگر آپ ذرا ورزش کیا کیجیے۔ اور کچھ نہیں تو ایک آدھ میل صبح کے وقت ٹہل لیجیے۔ لیٹے لیٹے حقہ پیتے رہنا اچھا مشغلہ ہے مگر........"

گوالے کے لڑکے کی ران پر آپریشن کرنے اور گرم پانی اور کاربولک صابن سے دیر تک ہاتھ دھونے کے بعد جب اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا تو کمپونڈر، چپراسی اور ڈومنا کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ باہر گرد آلود سڑک پر بیل گاڑی میں بیٹھا گوالے کا لڑکا ہنس ہنس کر ماں سے بات کر رہا تھا۔ اور وہ بیٹے کے سر میں سرسوں کا تیل مل رہی تھی، اسے گڑ اور چوڑا کھلا رہی تھی۔

جاوید کے دل میں ایک نئی مسرت، ایک نئی آسودگی کا سوتا پھوٹا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا، سگریٹ سلگائی اور میز پر اپنے ہاتھ دونوں رکھ دیے جیسے وہ ڈاکٹر کی میز نہ ہو بلکہ پیانو ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دھواں آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں سے نکل کر روشن دان کی طرف پیچ کھاتا ہوا اٹھتا رہا۔

"چپراسی" اس نے چونک کر پکارا۔ چپراسی دوڑا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی قینچی تھی۔ "بڑھیا کا گاؤں جانتے ہو؟"

"جی ہاں۔ گھوڑے پر کوئی بیس پچیس منٹ لگیں گے۔"

"گھوڑا تیار کرو اور تم آگے چلے جاؤ دوا کا بکس لے کر"۔ پھر اس نے درگا پرشاد سے کہا:

"کمپونڈر صاحب آیئے ہم اتنی دیر میں کچھ سامان کا رجسٹر وغیرہ دیکھ لیں۔ سب سے پہلے تو

آیئے آپریشن کے آلات کا رجسٹر دیکھیں۔ لگتا ہے ہمارے یہاں سامان بہت کم ہے۔ ایسے آلات سے تو بڑا آپریشن ہو نہیں سکتا۔ آج مجھے ایک مریض کو شہر بھیجنا پڑا۔ اس آدمی کو بڑی دقت ہوگی۔ بیچارہ غریب آدمی کیا کرے گا؟"

"ڈاکٹر صاحب یہاں تو روز ہی کتنے آدمی دوا کے بغیر مرتے ہیں۔ اس کا غم کون پالے؟"

جاوید نے غور سے کمپونڈر کو دیکھا۔ تھوڑی دیر تو درگا پرشاد نے اس کی آنکھوں کا مقابلہ کیا۔ پھر کچھ پچھتایا، کچھ کھسیایا اور ہنسنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب جب میں نے نوکری کی تو میرا بھی یہی حال تھا جو آپ کا ہے۔ لیکن آدمی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب!" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"کمپونڈر صاحب گھبرایئے مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ باتیں ہم پھر کریں گے۔ آیئے اس وقت سر جوڑ کے بیٹھیں اور یہ بوریت کا کام ختم کرلیں۔"

"آیئے" کمپونڈر نے ایک کالا رجسٹر کھول دیا اور لال پنسل لیکر بیٹھ گیا۔

جاوید نے سگریٹ بجھائی اور کھڑا ہوگیا۔ "آیئے کمپونڈر صاحب ساتھ ہی ساتھ دیکھتے چلیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد جاوید کی آواز ابھر کر چھت سے ٹکرائی اور گونج گئی: "یہ کیا مذاق ہے! یہ کوئی آلہ ہے۔ غدر کے زمانے کی چھری رکھ دی یہاں لاکر۔ اس سے تو لکڑی بھی نہیں کٹ سکتی۔"

"درگا پرشاد نے سر ہلایا، ہنسا اور آہستہ سے بولا"۔ آپ کافی جھگڑا مول لیں گے۔ آپ نرالے اور نئے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں اس جھگڑے میں آپ سے ایک قدم پیچھے نہ رہوں گا۔"

دونوں کے قہقہے پھر ایک بار چھت کو لے اڑے۔

چماری برگد کے بڑے پیڑ کے نیچے گاؤں کے باہر جاوید کا انتظار کر رہا تھا۔ بڑھیا کا جھونپڑا قریب ہی تھا۔ جہاں گنے کے کھیتوں کے پاس چہ بچے میں پانی جمع تھا اور اس پر مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ سور کیچڑ میں لوٹ رہے تھے اور ننگے بدن کسان جاڑے کی ترکاریوں کے

کھیتوں میں لاٹھا چلا رہے تھے۔ خود نما بالٹیوں سے پانی چمکتا ہوا کھیتوں میں گر رہا تھا۔ عورتیں کھرپے چلا رہی تھیں اور کتھئی ساریوں سے نکلے ہوئے گہرے کتھئی رنگ کے ان کے بازو تیزی سے زمین کھود رہے تھے۔ بڑھیا کا جھونپڑا بانس کے جنگل میں سے جھانک رہا تھا۔ اس کے پاس ایک نالہ تھا..... گہرے کتھئی رنگ کے کیچڑ کا نالہ..... کیچڑ کا رنگ گہرا ہی تھا۔ پھونس کے چھپر تلے ایک اندھیری کوٹھری میں کلیا بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ چھاتی دھونکنی بنی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ گیہواں تھا جس کو بخار نے جلا دیا تھا۔ اس کے چہرے سے دھواں سا اٹھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چار پائی بہت چھوٹی تھی اور وہ ٹانگیں موڑے پڑا تھا۔ اس کی ماں آتی، اسے جھانک کر دیکھتی تھی، کبھی کبھی پیتل کے پیالے سے دو گھونٹ پانی پلاتی اور اپنی پسیجتی ہوئی آنکھوں میں انتظار کی بیقراری چھپائے ہوئے باہر نکل جاتی تھی۔

"کہاں جاتی ہے ماں۔ ڈاکٹر نہیں آئے گا۔ سب دربار کے غلام ہیں سب کولھو کے بیل ہیں۔

"میری چتا جلانے کو لکڑیاں بٹور۔ کس کی راہ دیکھتی ہے....." اس نے موٹے کپڑے کی موٹی دولائی پھینک دی اپنے بدن سے اور ہاتھوں کو ہوا میں لہرانے لگا جیسے کسی چیز کو پکڑنے یا جھپٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بچپن میں وہ اسی طرح گھاس پر لیٹا چاندنی راتوں میں آسمان سے تارے توڑا کرتا تھا۔

بڑھیا نے اپنا میلا کتھئی آنچل آنکھوں پر رکھ لیا۔

پندرہ بیس دن پہلے کندھے پر ڈنڈا رکھے دربار کے مویشیوں کو چراتا پھرتا تھا۔ اسے بانسری بجانے کا شوق بچپن سے تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کرشن جی بانسری کی تان اڑاتے تھے تو رادھا کا من ناچ اٹھتا تھا۔ وہ تھا بھی ذات کا گوالا۔ بانسری بجاتے ہوئے وہ ڈنگروں کو بھول جاتا اور من ہی من کرشن اور گوپیوں کا کھیل کھیلنے لگتا۔ دہی اور ماکھن چرانے کے لئے من بہکنے لگتا۔ لیکن وہ اپنی لال زبان سے ہونٹوں کو چاٹ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اور پوری سانس اندر سینے میں کھینچ کر بانسری کی تان اڑاتا تو لگتا کہ درخت پر چڑیاں

نے پر سمیٹ لئے ہیں، شام کے قدم تھم گئے ہیں، اور شفق کے پھول سریلی آواز کے جادو سے کھل رہے ہیں۔

ایسی ہی ایک شام تھی کہ غضب ہوگیا۔ دربار کے مویشی اپنی گردن کی گھنٹیاں بجاتے باسمتی دھان کے کھیتوں میں گھستے چلے گئے اور دھان کے خوشوں سے اپنا پیٹ بھرنے لگے۔ کلیا کی آنکھ کھلی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ اچھل کر ایک بھینس کی پیٹھ پر بیٹھا اور جانوروں کو گاؤں کی طرف ہانکنے لگا۔

اس قسم کے گناہوں کا انصاف رات کے وقت دربار کے سامنے کچہری میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں سرکاری براھیل نے اپنے ڈنڈے سے اس کی کمر توڑ دی۔ لیکن وہ ڈٹا کھڑا رہا۔ اس کی بانسری ٹوٹی ہوئی سامنے پڑی تھی، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور کمر پر ڈنڈے برس رہے تھے۔ اس نے ہونٹوں کو اتنے زور سے دانتوں تلے دبالیا تھا کہ زبان پر خود اس کے خون کا نمک تیرنے لگا تھا۔

چند دن وہ اپنے گھر بے سدھ پڑا رہا۔ کھائے پئے بغیر۔۔۔ آنکھیں بند کئے، ہونٹ اسی طرح دانتوں تلے دبائے۔۔۔ ماں اس کے آنسو پونچھتی رہی اور اس کی کمر پر چونے اور ہلدی کا لیپ لگاتی رہی۔ کچھ آرام ہوگیا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ چلتا ہوا آہستہ آہستہ اسی گھنے درخت کے نیچے آگیا جہاں اس نے آخری بار بانسری بجائی تھی۔ دور ہرے میدان میں ببول کے پیڑوں کے پاس شام کے دھندلکے میں جانور گھاس چر رہے تھے اور خواب کی طرح مٹتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی کا درد کریدی ہوئی چنگاریوں کی طرح چمک اٹھا اور وہ بخار میں پھنکنے لگا۔

"کیا ہے جوان تو روتا کیوں ہے۔" جاوید نے اس کے سینے پر اپنی انگلیوں کو رکھ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے بجاتے ہوئے پوچھا۔

اس نے دانت نکال دئے۔ "نہیں ڈاکٹر بابو!"

جاوید نے نسخہ لکھ کر بڑھیا کو دیا۔ بڑھیا نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے اپنے آنچل کی گانٹھ کھولی اور بہت سی چمکتی ہوئی ریزگاری۔ اکنیاں، دونیاں، چونیاں۔ اس کی طرف بڑھائیں۔

"یہ میری پہلی فیس ہے۔ ان پیسوں سے شہر سے پھل منگوا کر اسے کھلادے، وہ

بہت کمزور ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ پھر شیر ہو جائے گا۔ گھبرانا مت۔"

چماری نے گاؤں سے نکل کر سارا قصہ ڈاکٹر کو بتایا۔ جاوید نے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے دور دیکھا اور اچانک چماری کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھا اور آہو کی دیوار پر گھوڑا بھگاتا ہوا جھومتے ہوئے گنوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

5

دربار میں گیس کا ہنڈا جل رہا تھا۔ سفید عمارت میں داخل ہونے سے پہلے چھوٹے سے سفید پل پر سے گزرنا پڑتا تھا جو سڑک اور برآمدے کو ملاتا تھا۔ وہاں دو ولائتی کتے زنجیروں سے بندھے رہتے تھے۔ لمبے سائبان میں کوئی سولہ ستون تھے۔ اس کے دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا مربع صحن اور صحن کے چاروں طرف پختہ سائبان تھے۔ یہاں بھی ہر چہار طرف ان گنت ستون اوپر والی منزل کا بوجھ اٹھائے کھڑے تھے۔ ان ستونوں کے اوپر شیر کے سر ابھرے ہوئے تھے اور ان کے جبڑے اس طرح کھلے ہوئے تھے جیسے کسی شکاری نے ان کے سینے میں نیزے کی انی پیوست کر دی ہو۔ ایک کونے میں زینہ تھا محرابوں کے نیچے پھولوں کے گملے سجے ہوئے تھے اور طرح طرح کے پھول مسکرا رہے تھے۔ اکثر گملوں میں ولائتی پودے تھے۔ جن کے خوشنما پھولوں کی خوشبو میں زہر بھرا ہوا تھا۔

جاوید منشی کی باتیں سنتا ہوا زینہ چڑھ رہا تھا۔

"آج میں نے کئی مریضوں سے آپ کی تعریف سنی ۔ جوان آدمی ہیں ۔ نیا خون ہے ۔ آپ چاہیں تو روپے کی تین اٹھنیاں بنا سکتے ہیں ۔ یہاں دور دور تک ڈاکٹر نہیں ۔ جو ہیں نقلی ہیں ۔ ہیضے کے موسم میں تو یہ ہزاروں پیٹ لیتے ہیں ۔۔۔ جی ۔۔۔ جی ہاں بائیں ہاتھ کو وہ ریشمی پردہ اٹھا کر اندر چلے جائیے ۔ سرکار آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں" جاوید کا جی چاہا کہ مڑ کر دیکھے ۔ منشی ضرور اپنی شیطانی مسکراہٹ بکھیر رہا ہوگا ۔ وہ اکڑ کر آگے بڑھا اور جھٹکے سے پردہ اٹھا کر کمرے میں داخل ہو گیا ۔

آرام کرسی میں گوشت کا ایک پہاڑ دھرا تھا ۔ اس کا رنگ آبنوسی تھا ۔ آنکھیں اس کے بالوں سے بھی زیادہ کالی تھیں ۔ چہرہ بالکل گول تھا اور اس پر ناک اوپر سے رکھی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ اس کی مونچھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں مگر اوپر کے لب پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کی چمک اس کے چہرے کی سیاہی پر حاوی تھی ۔ سینے پر بندھے ہوئے ہاتھ موٹر کے کٹے ہوئے ٹائروں جیسے لگ رہے تھے ۔ وہ ململ کا پستئی کرتا اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا ۔ "یہ آدمی کھڑا کیسے ہوتا ہوگا ؟" یہ عجیب اور دلچسپ خیال جاوید کے ذہن میں گونج گیا ۔

"آئیے ڈاکٹر جاوید بہت انتظار کرایا ۔ میں بہت مصروف آدمی ہوں خاص طور پر رات کے وقت ..... خیر آئیے بیٹھئے ۔" اس نے ہاتھ بڑھایا ۔

جاوید نے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک مرد کا اتنا موٹا ہاتھ ، اتنا نرم کیسے تھا اور انگلیاں اتنی ٹھنڈی اور ہتھیلی اتنی گرم کیوں تھی ..... کیسے ؟

کمرے میں جلتے ہوئے خوبصورت لیمپ کی نیلی چمنی کیا تھی روشنی کی رقاصہ ناچ رہی تھی ۔ چاروں طرف تصویروں کے بڑے بڑے سیاہ فریم لٹک رہے تھے ۔ عبدالجبار کے بڑے سے بے ڈول سر کے اوپر دیوار پر سنہرا فریم آویزاں تھا جس سے سرکار عبدالجبار کے باپ رئیس عبدالستار کا پُر نور چہرہ جھانک رہا تھا ..... روشن نشیلی آنکھیں ، غصے میں بھنچے ہوئے لب اور گھونگریالی داڑھی ۔ جاوید اس تصویر کو پہچان گیا ۔

ایسی ہی ایک تصویر اس کے ہسپتال میں خود اس کی کرسی کے اوپر لٹکی ہوئی تھی۔
جاوید نے خیریت پوچھی اور ایک نظر پھر دیواروں پر دوڑائی۔ عبدالجبار کے پیچھے والی دیوار پر آویزاں ایرانی قالین پر جھیل کا سنہرا ڈیزائن تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور ایک ہرن درختوں اور جھاڑیوں سے جھانک رہا تھا۔ ہرن کی آنکھیں ذرا غیر فطری حد تک لمبی تھیں، جیسے کسی حسینہ کی دنبالہ دار آنکھیں ہوں۔ قالین پر ایک تلوار لٹک رہی تھی جس کا دستہ چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور اس پر نقش و نگار ابھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف بارہ سنگے کے سینگ کی ایک شاخ میں صندل کی ایک موٹی سی تسبیح پھانسی کے پھندے کی طرح جھول رہی تھی۔ دوسری شاخ میں نازک، گرہ دار چھڑی لٹک رہی تھی۔ جس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔

جاوید کو محسوس ہوا کہ عبدالجبار کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کی آنکھوں کا تعاقب کر رہی ہیں اور اس کے سیاہ ہونٹوں پر ایک بڑی رذیل اور کم ظرف مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔
"بڑا عجیب علاقہ ہے یہ! ویسے بالکل جنگلی علاقہ ہے لیکن قریب ہی ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ وہاں کام کی ساری چیزیں مل جاتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ولایتی شراب بھی ملتی ہے!" اس نے کنکھیوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو پھر قالین کو دیکھ رہا تھا۔
"وہاں سب ڈویژن کا افسر لوکس رہتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ اس کی میم کبھی کبھی شکار کے شوق میں یہاں آتی ہے۔ شکار وکار کیا اس کو ہمارے باورچی خانے کی بریانی اور قورمہ بہت پسند ہے۔ میرا باورچی ابا جان کے وقتوں کا ہے۔ پانی کو بھی چھو دے تو اس میں یخنی کا مزا پیدا ہو جائے۔" وہ یکایک رُک گیا، "کیوں آپ کو یہ جگہ پسند آئی؟" اس نے لہجے کو بہت رازدارانہ بنالیا۔ اس کی آنکھیں اور بھی چھوٹی اور سیاہ ہو گئیں۔
جاوید نے کندھوں کو جھٹک کر کہا "آج میرا یہاں دوسرا دن ہے۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے!"
"جناب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کو اس جگہ سے ایسی محبت ہو جائے گی کہ پھر آپ تین برس بعد کہیں گے دیکھیے ڈسٹرکٹ بورڈ والے تنگ کر رہے ہیں۔ میرا تبادلہ رکوا دیجیے... اور میں رکوا دوں گا۔ بے فکر رہیے!"

"میں بے فکر ہوں!" جاوید نے عبدالجبار کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی کرسی پر تن گیا۔

"یہاں کسی ہندو ڈاکٹر کو بھیج رہے تھے۔ میں نے سوچا اگر وہ آگیا تو بڑا ستائے گا۔ میں نے زور لگایا اور لوکس کی مدد سے آپ کو ...."

"جی ہاں خوب جانتا ہوں، ویسے میں تو مریضوں کا خادم ہوں۔ میرے زیادہ تر دوست ہندو ہیں۔"

"اجی چھوڑیے کلکتے کی بات۔ وہاں تو بنگالی چھوکریوں کے چکر میں آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سنا ہے وہاں تو اچھی صورت شکل کے نوجوانوں کو عورتیں بھیڑ بکری بنا کر رکھ لیتی ہیں!"

جاوید کا چہرہ سرخ ہو گیا اس کی انگلیاں کانپنے لگیں۔

"خیر چھوڑیے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا یہاں آپ کو بڑا آرام ملے گا۔ دربار سے پچاس روپے ماہوار تو بندھا ہوا ہے ہی۔ اور بھی راستے ہیں۔ دلچسپی کا سامان بھی ہے۔ بس چھوٹی سی جنت سمجھیے۔ یہاں سب کچھ ہے۔ ضرورت ہے مستعدی اور سوجھ بوجھ کی۔ جس کی آپ میں کمی نہیں معلوم ہوتی!" اس کی آواز ایسی ہو گئی جیسے رک رک کر خراٹے لے رہا ہو۔

"بات یہ ہے کہ میں پہلی بار ایک ہسپتال کا کام سنبھال رہا ہوں۔ میں نے کام کرنے کا ایک خاص تصور قائم کیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنے خواب پورے کروں۔ میں اچھا ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں!" جاوید کہنا کچھ اور چاہتا تھا اور کہہ کچھ اور رہا تھا۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی جناب؟" عبدالجبار کا لہجہ اچانک دوستانہ ہو گیا۔

"جب وقت آئے گا ہو جائے گی۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ ہاں بھئی ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ موج اڑاؤ۔"

منشی نے آکر خبر دی کہ تھانیدار سلام کو حاضر ہوا ہے۔

"کوئی خاص بات؟"

"جی نہیں ...."

"بارہ دری میں ٹھہرنے کا انتظام کر دو۔ میں کل ملوں گا" عبدالجبار نے کہا۔
منشی نے اس کو جاتے جاتے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا اور جاوید کی رگوں میں چنگاریاں بھڑک اٹھیں ...... "یہ آدمی ہے یا ......"

"یہاں چاروں طرف بہت سے زمیندار ہیں۔ سب آپ کو پھانسنا چاہیں گے ..... خبردار رہیے گا۔ اگر کسی ایسے جنجال میں پھنسیں تو مجھ سے کہیے گا۔ ذرا سی ٹھیس لگی تو نوکری اور عزت دونوں خطرے میں ......"

جاوید اس دوستانہ دھمکی کو سمجھ گیا۔

"بات یہ ہے کہ میں یہاں زمینداروں کے معاملوں میں پڑنے نہیں آیا ہوں۔" اس کی سانس بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ "میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ڈاکٹر ہوں اور اپنے فرض کو خوب سمجھتا ہوں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں، اور آپ اجازت دیں تو ..."

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کھانا کھا کر جائیے گا ......" اس نے تالی بجائی اور ایک خدمت گار دوڑا ہوا اندر آیا ..... "کھانا لاؤ!"

"جو حکم!" ملازم جس طرح اندر آیا تھا اسی طرح الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"دیکھئے ...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ رات آپ نے میری بہن سکینہ کو دیکھا۔ کیا تشخیص ہے آپ کی؟"

ایک بجلی کوند گئی اور جاوید کا دل بلیوں اچھل گیا۔ "ارے میں تو بالکل ہی بھول گیا!" اس نے قالین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں رات میں نے دیکھا۔ میرا خیال ہے جن بھوت کی بات بکواس ہے!"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ گاؤں میں جن بھوت کے بغیر زندگی بڑی ویران ہو جاتی ہے۔ اس سے ذرا چہل پہل، ذرا رنگینی رہتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے .... مجھ کو معلوم ہے جنت کی حقیقت .... لیکن .... وہ بہت بیمار ہے۔ میں دعا، تعویذ، علاج، ہر چیز سے تھک گیا ہوں۔" اس نے کچھ اس طرح منہ بنایا جیسے بڑی کڑوی دوا اس کے حلق میں انڈیل دی گئی ہو۔

پھر اس نے اپنا انتہائی بھاری اور ساتھ ہی انتہائی نرم ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
ڈاکٹر اس کو اچھا کر دو۔ میں تمہارا احسان مند رہوں گا۔ اور کبھی تم کو اپنے سے دور نہ ہونے دوں گا۔"

"کس جرم میں؟" اس نے دل میں کہا اور اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہونے میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہسٹریا ہے۔ ایک ڈیڑھ مہینے میں چلتا ہو جائے گا۔" جاوید نے بڑے جغادری ڈاکٹر کے انداز میں کہا۔

"ہسٹریا؟" سرکار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟ ...... یہ تو معمولی بات ہے۔"

"ہسٹریا سے مجھے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔"

"آپ کو؟"

"میرا مطلب ہے میری پہلی بیوی کو بھی ہسٹریا کا مرض تھا۔ شادی سے پہلے۔ لیکن شادی کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ ماشاءاللہ۔"

"جی ہاں ایسا ہوتا ہے۔ شادی کے بعد یہ مرض خود بخود دور ہو جاتا ہے۔"

"لیکن سکینہ کو شادی سے پہلے اچھا کر دیجیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اور ہاں اس کے ہسٹریا کا ذکر کسی سے نہ کیجیے گا۔ میں چاہتا ہوں دربار کی باتیں دربار ہی میں رہیں تو اچھا ہے۔"

جاوید کو یہ بات بری لگی لیکن وہ خاموش اسے گھورتا رہ گیا۔ عبدالجبار نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی کو شہادت کی موٹی انگلی میں گھمایا اور تیز کرنیں چمک کر بجھ گئیں۔ پردے کے پیچھے سے کبھی کبھی رئیس عبدالجبار کی مسہری کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا...... قریب ہی ایک بڑا سا مرادآبادی اگالدان اور ایک چھوٹی سی میز پر بلور کی ایک صراحی اور چھوٹے چھوٹے جام رکھے تھے۔

"اچھا تو اب اجازت دیجیے۔ میں چلا۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا سونا چاہتا ہوں۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"خیر مجبوری ہے۔" عبدالجبار نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے سگنل کی طرح ہاتھ بڑھایا۔ وہی

ٹھنڈی انگلیاں اور گرم ہتھیلی۔ جاوید تیزی سے باہر نکل گیا۔ ملازم کے کندھے پر رکھے ہوئے خوان سے بریانی اور قورمے کی لذیذ خوشبو نے اسے شب بخیر کہا اور اس نے رئیس کی گرجدار آواز سنی۔ "تھانیدار کو بلاؤ۔ میں کوئی بھوت ہوں جو اکیلے کھانا کھاؤں گا"۔

آہٹ سن کر جنگلی چونکا۔ "کمال کر دیا تم نے تو پہلے دن ہی عجیب رنگ دکھایا۔ شوروا نگوڑا بڑا اچھا بن گیا!"

مارے نیند کے اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ مگر اس نے جاوید کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے جاوید کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر نظر ڈالے بغیر اپنی کتھا جاری رکھی۔ "میں کہتا ہوں صحت سب سے بڑی دولت ہے۔ تمہارے ابا کہا کرتے تھے۔ کیا کہا کرتے تھے، ہاں ایک گیت پڑھا کریں تھے...... تندرستی ہزار نعمت ہے۔"

ایک بڑے پیالے میں آلو انڈے کا شوربہ تھا۔ چپاتیاں ٹھنڈی ہوچکی تھیں اور چاول سے اس جاپانی لٹھے کی سفیدی جھانک رہی تھی جو ابھی ابھی وہ عبدالجبار کی ٹانگوں سے چپکا ہوا دیکھ چکا تھا۔

اس نے ہاتھ اٹھالیا۔ "بھوک نہیں جنگلی اٹھالو"۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ اور برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ جنگلی نے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آنکھیں اتنی لال کیوں ہورہی ہیں۔ مرچ کا برادہ ڈال دیا ہے کیا"۔

"بکومت جاکر سوجاؤ"۔

اس نے جھانک کر دیکھا بوا عشا کی نماز پڑھ رہی تھیں اور ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ جیسے وہ کسی سے سرگوشی کررہی ہوں۔

وہ کپڑے بدل کر اپنے بستر پر لیٹا تو ٹھنڈک نے اسے چونکا دیا۔ لیکن جلد ہی اندر سے گرمی نکلنے لگی اور اس کے تلوے گرم ہونے لگے۔ اس نے لحاف کو اور بھی اچھی طرح لپیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ لالٹین کی روشنی آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو اتنی کم کردی کہ سوائے لالٹین کے ہر چیز اندھیرے میں غرق ہوگئی۔

اس کی بند آنکھوں میں کوئی چیز چمکی اور ایک سنہرے فیتے کی طرح دوڑنے لگی ...... سونے کی گھڑی، سونے کی زنجیر، سونے کے بٹن، سونے کے دانت۔ چھوٹی چھوٹی ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی ہوئی آنکھوں میں سونے کی چمک، ...... ایرانی قالین، سنہری موچیں، سنہرا ہرن اور سنہرے سینگ، دیوار پر لٹکتی ہوئی تلوار (کون جانے یہ تلوار کب بے نیام ہو جائے) ہلتا ہوا پردہ مسہری، سفید تکئے، بلورین صراحی اور چمکتے ہوئے منہ چڑاتے ہوئے جام۔ پچاس روپے، زمیندار، رشوت، دربار دربار، حویلی حویلی ...... اور پھر وہ منشی، اس کی عیار آنکھیں، خوشامدانہ مسکراہٹ ... عبدالجبار ...... ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ موج اڑاؤ۔

"بدمعاش!" جاوید نے دانت پیس کر کہا اور آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی سے باہر ابھرتے ہوئے چاند کی روشنی میں فلک بوس تاڑ کے پیڑ ایک دوسرے کی طرف بل کھا کر ایک دوسرے کو چومتے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے معلوم ہوئے۔ چاندنی، چاندنی، گاؤں کی خاموش چاندنی، تو اتنی سہمی ہوئی کمزور اور دکھی کیوں ہے؟ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

ہسٹریا۔ سکینہ۔ جن بھوت۔ ہسٹریا۔

ایک چیخ اس کے دل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور پھر فوراً لحاف میں منہ لپیٹ کر لیٹ گیا۔ ایک بہت ہی معصوم چہرہ اس کی آنکھوں میں ابھرا۔ تل جو کاجل کی ننھی بوند نظر آ رہا تھا اور ہلکے ہلکے شبنمی موتی جو اس کے لب پر چمک رہے تھے۔ یہ ایک کنواری بیمار لڑکی کا چہرہ تھا۔ یا یہ وہ ہرنی تھی جو کسی شکاری کی زد میں آ گئی تھی۔ کون جانے وہ کون تھی!

وہ آنکھیں ...... آنکھیں؟ ...... بیقرار، سیاہ، روشن اور التجا بھری آنکھیں ...... نہ جانے یہ کس زخمی پرندے کی آنکھیں تھیں!

جاوید کی آنکھیں، ان دو آنکھوں میں، ان لمبی لمبی گھنی پلکوں کے سائے میں تیرتی رہیں۔ اسے نیند آ گئی۔

ایک بڑی شریر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ اس نے کروٹ لی اور منہ تکئے میں چھپا لیا۔

6

داروغہ کرن سنگھ نے مرغی کی ران کے نرم گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا چباتے اور ہڈی چوستے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا:

"کیا کہنے۔ سرکار کے یہاں کی مرغیاں بہت مزیدار ہوتی ہیں۔"

"عورت کے سوا اچھی ذات کی ہر چیز مزیدار ہوتی ہے!"

عبدالجبار نے بڑی حقارت بھری نظر سے داروغہ کرن سنگھ کو دیکھا جس کے جبڑوں کی ہڈیاں چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کھاتے وقت لالچ اور بھی چمک اٹھا تھا۔ اور اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نیند کی ماتی نظر آنے لگی تھیں۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور ورزشی اور گٹھا ہوا جسم دوہری ہڈیوں کی وجہ سے خاصا چوڑا چکلا معلوم ہوتا تھا۔

"عورت!" کرن سنگھ نے دوسری ران اٹھائی۔ آم کے اچار کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور ہچکی روکنے کے لئے پانی کا پورا گلاس خالی کر دیا۔ "عورت کا نمبر مرغی اور آم کے اچار کے بعد آتا ہے!"

عبدالجبار نے پھر اس کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

"بڑے چنٹ ہو تم۔ آخر اس گوالن کا کام تمام کر دیا۔ بڑے بھنسے تھے۔ خیریت ہوئی کہ لوکس مان گیا!"

ہڈی کرن سنگھ کی چپڑی ہوئی انگلیوں سے چھٹ گئی۔

"ڈر گئے؟" عبدالجبار نے فتحمندانہ قہقہہ لگایا۔ "مزے کرو۔ اب کیا رکھا ہے اب تو

معاملہ دب گیا۔ تم کو کیا معلوم خود لوکس کا ایک قصہ بڑی مشکل سے دبایا گیا ہے۔"

کرن سنگھ مسکرایا اور دوبارہ ہڈی اٹھا کر اسے چوسنے لگا۔ اس کے چہرے پر وہی اطمینان، لالچ اور عیاری کی چمک پیدا ہو گئی۔

"حضور، تھانیدار کی زندگی بڑی مصیبت کی ہوتی ہے۔ ہر وقت سر او کھلی میں رہتا ہے۔ ایک طرف سرکاری فرض۔ دوسری طرف آپ جیسے بڑے آدمیوں کا دباؤ۔ ہر بڑا زمیندار اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن سچ کہا ہے کسی فلسفی نے۔ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہو تو بے دھڑک آگ میں کود پڑو۔ میں تو کود پڑا ہوں۔ میں آپ کا خادم ہوں۔"

"خادم وادم چھوڑو۔ تم میرے دوست ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" عبدالجبار نے فرنی کی انگوری طشتری داروغہ کی طرف کھسکائی جس پر پستے کی ہوائیاں تھیں۔ کیوڑے کی بھینی بھینی خوشبو اڑی تو کرن سنگھ کی مونچھیں بھی معطر ہو گئیں۔

"میرے کئی کھلیان لٹ چکے ہیں۔ یہ ڈاکوؤں کا کام ہے۔ اس میں پرمیشر سنگھ کا ہاتھ ہے۔ وہ بدلہ لے رہا ہے۔ یاد ہے اس نے جج کے فیصلے کے بعد کیا کہا تھا؟"

"بدلہ نہ لوں تو میں راجپوت نہیں .... حرامی پوت ہوں! .... مجھے خوب یاد ہے سرکار۔"

"تو پھر؟" اس نے داروغہ کو سوالیہ نظر سے دیکھا۔

"میں بھی راجپوت ہوں سرکار، اور ایسے کتنے پرمیشر سنگھ کو پودینے کی طرح جڑ سے نوچ کر نالے میں پھینک چکا ہوں۔" اس کے نتھنے پھولنے لگے اور مونچھیں پھڑپھڑا گئیں۔

پھر دونوں سر جوڑ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ دونوں کی آنکھیں ہوا کی آہٹ پر بھی بلی کی آنکھوں کی طرح دروازے کی طرف اٹھ جاتیں اور آواز حلق میں گھٹ کر رہ جاتی۔

آخر عبدالجبار نے ایک زوردار ہاتھ کرن سنگھ کے شانے پر مارا۔

"سب آپ کی دعا ہے۔" کرن سنگھ نے اپنی آنکھوں کے نشے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ پیو گے؟" عبدالجبار نے پوچھا۔

"سرکار۔" اس نے اپنی آواز میں ساری التجا ساری پیاس بھر دی، مگر آہستہ سے نفی میں

سر ہلایا۔ "اچھا تو آؤ سونے کے کمرے میں چلیں۔" سرکار نے بمشکل اٹھتے ہوئے کہا۔

آہستہ آہستہ آنکھیں سرخ ہوتی گئیں۔ جام خالی ہوتے رہے۔ کرن سنگھ اخروٹ اور بھنے ہوئے کاجو چباتا اور زبان سے دانتوں اور مسوڑھوں کو صاف کرتا رہا۔ اب اس کی بڑی بڑی آنکھیں آدھی سے زیادہ بند تھیں۔ اور جب وہ انہیں پوری طرح کھول کر عبدالجبار کی آنکھوں کو گھورنا چاہتا تو اس کی آنکھیں بڑی ڈراونی ہو جاتیں۔ اور اسے سرکار کی آنکھوں کی جگہ سُرخ شعلے ناچتے نظر آتے۔

"یہ سب ٹھیک ہے مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"نہیں سرکار آپ کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟" تھانیدار کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"کرن سنگھ اگر تم کو نشہ آرہا ہے تو جاؤ سو جاؤ۔ کل صبح بات کریں گے۔"

کرن سنگھ چونک گیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "ولائتی شراب بہت تیز ہوتی ہے سرکار۔ ویسے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دھیرج سے کام لینا ہوگا اور دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا جس کی لاٹھی اس کی بھینس، سرکار"

"تو ہمارے پاس لاٹھیوں کی کیا کمی ہے؟ آدمی کو کچھ کرنا چاہیے۔ شیر کو بھی مان میں شکار نہیں ملتا۔ کچھ روپیوں کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"جی آپ کا دیا بہت کچھ ہے۔ ویسے وہ میرا لڑکا ذرا زیادہ شوقین ہو گیا ہے۔ یونیورسٹی میں نام کیا لکھا لیا ہے سمجھتا ہے لارڈ صاحب بن گیا۔ کل ہی اس کی چٹھی آئی ہے ......" اسے ہچکی آئی اور اس نے جام کا چمکتا ہوا سونا اپنے منہ میں انڈیل لیا اور مونچھوں پر زبان پھیرتے ہوئے عبدالجبار کو حریص نظروں سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ کل جانے سے پہلے منشی سے مل لینا۔"

"آپ بہت مہربان ہیں سرکار۔" اس نے جام اٹھایا۔

"دیکھو زیادہ نہ پیو ورنہ پھر بات کیسے ہوگی؟" عبدالجبار تھوڑی تھوڑی دیر پر جام اٹھا کر ایک گھونٹ منہ میں لیتا اور زبان پر تیرتا ہوا آہستہ آہستہ گلے سے اتارتا اور پھر کاجو کا ایک آدھ دانا دانت تلے دبا کر منہ چلانے لگتا۔ اور اس کے رخساروں کا گوشت آہستہ آہستہ تھرکنے

لگتا۔ کرن سنگھ نے جام واپس میز پر رکھ دیا لیکن اب اسے ہر چیز ترچھی نظر آرہی تھی عبدالجبار کی ناک گدھ کی چونچ کی طرح اور نگاہیں آڑی بھاگتی نظر آئیں تو اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"کرن سنگھ ..... غور سے سنو" اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں "تم جانتے ہو میں کیا چاہتا ہوں۔ میں اپنے علاقے میں ترقی اور خوبصورتی دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب بھی شہر سے گاؤں واپس آتا ہوں تو دو دنیاؤں کا فرق نظر آتا ہے۔ میں نے یہاں لوئر پرائمری اسکول کھلوایا۔ مسجد میں مکتب قائم کیا۔ ریلوے اسٹیشن کے لئے دوڑ دھوپ کی۔ کیا سمجھے؟ ڈاک خانہ قائم کروایا۔ ہسپتال قائم کروایا اور ہسپتال کی نئی عمارت کے لئے ڈسٹرکٹ بورڈ کو بیس ہزار روپے دیئے۔"

"بھگوان قسم آپ کو چیرمین ہونا چاہیے!" کرن سنگھ نے زور سے ڈکار لی اور آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

"سن رہے ہو میری باتیں یا نیند آرہی ہے کرن سنگھ؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں "سن رہا ہوں سرکار! آپ سولہ آنے ٹھیک کہہ رہے ہیں"

"اب ایک مل کی کمی ہے۔ شکر مل۔ یہ ہو جائے تو کیا سے کیا ہو جائیگا..... بڑی ترقی ہوگی۔ درجنوں کو روزگار مل جائے گا۔ آخر میں نے اسٹیشن، ہسپتال اور ڈاک خانہ بیکار تو نہیں قائم کروائے۔ لیکن راستے سے بہت سی چٹانوں کو ہٹانا پڑے گا۔"

"ضرور ہٹانا پڑے گا!" کرن سنگھ جیسے چونک گیا "میں کہوں گا ذرا جلدی نہ کیجئے۔ ابھی پچھلی فوجداری کا مقدمہ ختم ہوا ہے۔ دو تین مہینے بعد......" اس کی آواز دھیمی ہو گئی اور آنکھوں میں سازش اور بدمعاشی کی چمک پیدا ہو گئی۔

"تم چاہتے ہو میں پرمیشر سنگھ کو پنپنے کا موقع دوں۔ اگر وہ دوبارہ اٹھا تو تم بھی سنبھال نہیں سکو گے۔ وہ بڑا بدمعاش ہے۔ علاقہ میں تمام ڈاکوؤں کا سرغنہ ہے۔ وہی ان کو ہتھیار دیتا ہے۔ ان کو بچاتا ہے۔ سانپ کو دوبارہ سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دینا چاہیے!"

"یہ تو ٹھیک ہے سرکار! میں بھی جانتا ہوں۔ وہ ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہے اوپر سے دھمکی

پر دھمکی آتی رہتی ہے کہ ڈاکوؤں کو نہ پکڑا تو ...... لیکن دشمن ننگا ہو اور سر سے پیر تک سرسوں کے تیل میں ڈوبا ہو تو پکڑ میں کب آتا ہے بھلا!"

"دیکھو کرن سنگھ تم بہت دنوں سے ٹال رہے ہو۔ تم ڈرتے ہو اس سے۔ لیکن ایک بار اس کو رنگے ہاتھ دھر لو پھر دیکھنا کیا سے کیا ہو جائے گا۔"

کرن سنگھ خاموش سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔ "اچھا سرکار یہ بتایئے آپ کے یہاں نیا ڈاکٹر آگیا یا نہیں؟"

"ہاں آگیا۔ میں تو خود ہی تم سے کہنا چاہتا تھا۔"

"کیسا آدمی ہے؟"

"ٹیڑھا آدمی ہے۔ جوان ہے اور خواب دیکھتا ہے۔"

کرن سنگھ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "خواب دیکھتا ہے۔ خواب تو میں بھی دیکھتا ہوں۔ اور خوب رنگین خواب دیکھتا ہوں لیکن کبھی کبھی تو سرکار کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عورت کو میں اپنی گود میں اٹھاتا ہوں تو اس کا چہرہ تو عورت کا رہتا ہے اور دھڑ بکری کا ہو جاتا ہے اور اس کے ٹھنڈے تھن سے کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی شے ٹپکتی ہے۔ اور جو میں چلّوؤں میں لے کر دیکھتا ہوں تو اس کا رنگ خون کی طرح لال ہے..... ہے بھگوان یہ کیسا دودھ ہے!" میرے منھ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ اور آنکھ کھل جاتی ہے!" کرن سنگھ کے چہرے سے ایک عجیب سراسیمگی ٹپکنے لگی۔

"تمہارا ہاضمہ خراب ہو گیا ہے۔ کسی اچھے سے حکیم سے علاج کراؤ۔ ڈاکٹر کے چکر میں نہ پڑنا۔ وہ تمہیں پاگل خانے بھیج دیگا۔"

دونوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ عبدالجبار کی آواز تو رک گئی۔ لیکن کرن سنگھ ہارمونیم کی پھٹی ہوئی بھاتی کی طرح چیختا رہا۔

"دیکھو کرن سنگھ، اس ڈاکٹر کو قابو میں کرنا ہوگا۔ اس سے دوستی گانٹھو۔ وہ ہمارا سارا کھیل بگاڑ سکتا ہے۔ تم تو خود ہی کائیاں ہو!"

"سمجھتا ہوں۔" اس نے شرابی کی سی بے پروائی سے کہا اور پھر جام اٹھا کر پینے لگا۔

"تم اس سے دوستی کرو۔ جانتے ہی ہو جب روپیہ کام نہیں کرتا تو عورت اور شراب کام کرتی ہے۔"

"سرکار یہ جوان آج کل کے بڑی سیانی بلی ہوتے ہیں۔ سو چوہے کھالیں گے اور حاجی بنے رہیں گے ... مگر آپ بے فکر رہیے۔ مچھلی کو دیکھ کر بگلا برت توڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"اچھا یہ بات ہے تو اٹھاؤ جام اور ٹکراؤ .... ہاں یوں۔ ارے بھئی چھلکاؤ مت!"

دونوں نے جام خالی کر دیئے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ عبدالجبار نے انگڑائی کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ لیکن ہاتھ کانوں سے اوپر نہ اٹھ سکے اس نے ہاتھ گرا کر آنکھیں بند کر لیں .... "اچھا...... کل صبح مونشی سے ضرور مل لینا ..... ہاں ...."

تھانیدار اٹھا اور ایک جام اور چڑھا کر اپنے جانتے دبے پاؤں۔ دیوار۔ دروازے اور گملوں سے ٹکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

عام طور پر شراب پینے کے بعد عبدالجبار کے رگ و پے میں آگ سی دوڑ جاتی اور وہ چہکنے لگتا..... تنہائی میں بھی کسی فرضی آدمی سے بات چیت کرنے لگتا کسی کی طرف جھپٹتا، کسی کو گلے لگاتا۔ کسی کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر شاباشی دیتا۔ کسی کو ڈانٹتا اور دھمکی دیتا "تیرے گھر پر گدھے سے ہل چلوا دوں گا حرامزادے" دیر تک اس کی خیالی محفل گرم رہتی۔ مانو اسکے جسم کے بے ڈول ڈھانچے میں نئی گرمی آگئی ہو اور اس کی رگوں میں جما ہوا خون شراب کی گرمی سے پگھل کر سر سے پیر تک ایک بے چین شعلگی پیدا کر رہا ہو۔ اس کا نتیجہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ صبح کے وقت ملازموں کو گلاس چکنا چور ملتے۔ پودے فرش پر لیٹے نظر آتے۔ ایک آدھ مقدس طغرہ بھی زمین پر منہ کے بل لیٹا نظر آتا۔ اس گناہ کے پاداش میں دو فقیروں کو کھانا کھلایا جاتا اور کسی ملازم پر دو جوتے رسید کئے جاتے ..... آخر اس نے کیل کمزور کیوں گاڑی تھی دیوار میں۔ ملازم دوبارہ ہتھوڑا لے کر کمرے میں جاتا اور جب وہ کیل کو دیوار پر جوں کا توں مضبوطی سے گڑا پاتا تو آہستہ سے زیر لب کہتا .... "مادر ...... ہضم نہیں ہوتی تو مت پیو!" لیکن باہر جا کر کہتا: "اب کے کیل یوں گاڑی ہے کہ خود سرکار بھی لٹک جائیں تو کیل کی کمر

میں بل نہ پڑے" اور باورچی خانے کے سب ملازم منہ چھپا کر بے آواز قہقہہ لگاتے۔

لیکن آج کرن سنگھ دیواروں کے سہارے ڈگمگاتا ہوا باہر نکل گیا تب بھی عبدالجبار کی پیشانی کی شکنیں نہ مٹیں۔ وہ جام پر جام چڑھاتا رہا۔ آخر اس نے جام زمین پر پٹک دیا۔ وہ بار بار سر ہلاتا لیکن بڑے بڑے، بھیانک اور تباہ کن خیالات اس کو بار بار آدبوچتے۔

یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ دربار کا بڑا دبدبہ تھا۔ وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس جنگل کے علاقے میں انگریز سب ڈویژن افسروں اور کلکٹروں کے سائے میں اور بھی بہت سے بے تاج بادشاہ تھے۔ ہر بادشاہ دوسرے بادشاہ کا دشمن تھا۔ اوپر سے ان کے تعلقات خاصے دودھ شکر تھے۔ مگر اندر اندر دودھ کے پیالے میں زہر تیرتا رہتا تھا۔ اس وقت اسے سب سے زیادہ پریشانی پرمیشر سنگھ کی طرف سے تھی۔ کیونکہ اس میں شریف اور خاندانی زمینداروں کی شان نہیں تھی۔ وہ مقدمہ بازی اور فوجداری تک ہی نہ رہتا اور بھی بڑھ کے ہاتھ مارتا تھا۔ کہنے کو راجپوت تھا لیکن حرکتیں اس کی بڑی چھچھورے پن کی تھیں۔ ڈاکوؤں کا گروہ بنا رکھا تھا جو مختلف گاؤں میں بسے ہوئے تھے۔ دن کے وقت وہ کھیتوں میں کام کرتے تھے، زمینداروں کی گالیاں بھی سنتے تھے۔ چپکے چپکے جگہ جگہ کی ٹوہ لگا لیتے تھے اور موقع پاتے ہی ہتھیاروں سے لیس رات کے اندھیرے میں بلہ بول دیتے تھے اور ہر طرح کے ظلم کرتے تھے۔۔۔ ایک ہاتھ سے عورتوں کے کانوں کی بالیاں نوچ لیتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے سونے کے کنگن اتنے زوروں سے جھٹک کر کھینچتے کہ نازک کلائیاں ٹوٹی ہوئی پھل دار شاخ کی طرح لٹک کر رہ جاتی تھیں۔

وہ کسی دن بھی انتقام لے سکتا ہے۔ دربار پر حملہ کرنے کی تو خیر ہمت نہیں ہو سکتی تھی لیکن آس پاس کی کھریوں اور گوداموں کو لوٹنے میں ڈاکوؤں کو جھجک نہ تھی۔ شکری ندی کی طرح یہ بدمعاش بھی بڑا خطرناک شاطر تھا۔ جانے کب کدھر کا رُخ کرلے۔

دنیا جانتی تھی کہ عبدالجبار نے جوانی سے لے کر ادھیڑ عمر تک محض ورثے کو سنبھالنے کا فرض انجام دیا تھا۔ اس نے باپ کی چھوڑی ہوئی دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ ہاں البتہ ٹھاٹ اور شان بہت بڑھادی تھی۔ اس کے باپ کے وقت میں دربار کے آگے

صرف ایک گھوڑا گاڑی کھڑی رہتی تھی جسے دربار والے فٹن کہتے تھے اور اس میں شان سے اکڑ کر بیٹھتے تھے۔ عبدالجبار نے اس فٹن کو اور بھی شاندار بنوادیا تھا۔ اب اس کی چھت کھل سکتی تھی اور بند ہو سکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ شہر میں، جہاں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بستیاں شہر سے باہر پہاڑی ڈھلان پر آباد تھیں، وہاں اس نے جھیل کے کنارے ایک بہت ہی خوبصورت بنگلہ ..... چھوٹا، سبک اور آرام دہ بنگلہ بنوایا تھا۔ انگریز انجینئر کا کارنامہ تھا۔ برساتی میں شیورلیٹ کا نیا ماڈل کھڑا تھا۔ اس کے باپ کو موٹر رکھنے سے بڑی چڑ تھی۔ لیکن اس کا باپ تو قبر میں سو رہا تھا اور اس کے لائق بیٹے کو شراب کی بھٹی کے لئے کیسی کیسی بارونق اور شاندار برساتیوں کے زینے پر ہانپتے ہوئے چڑھنا پڑتا تھا۔ پرانا زمانہ لد چکا تھا اب نیا زمانہ تھا۔ تکڑم بازی اور ٹیپ ٹاپ کے بغیر بڑا دھندا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ بھی ایسا دھندا جس میں قدم قدم پر دشمنوں نے کھائیاں کھود رکھی ہوں۔ شب خون مارنے کی گھات میں ہوں ..... چھپے ہوئے دشمن کا وار خالی نہیں جاتا۔ سامنے کے دشمن سے تو آدمی بچ سکتا ہے.......

اس خیال کے ساتھ ایک بہت پرانی رات گڑے مردے کی طرح اس کی یاد کی قبر سے نکلی اور اس کے پورے وجود پر چھاگئی۔

رات بڑی بھیانک تھی۔ برسات کی گونجتی برستی رات ... باپ آنکھیں بند کئے مسہری پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ گندھک کی طرح زرد تھا، پیشانی پر سجدے کا گھٹا تک گہنائے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اور سفید جھک داڑھی سفید کرتے پر رکھی تھی ... جیسے پھینیاں رکھی ہوں۔

"ایک برس ہو گیا اب میں اچھا نہیں ہو سکتا۔ میرا وقت آگیا ہے۔ کاروبار کو ٹھیک سے سنبھالنا اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کو اور کچھ مت دینا۔ لیکن ان کا حصہ چھیننا بھی مت۔ سب بڑے بے وقوف اور نکمے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام برا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے اپنے وصیت نامے میں ساری جائداد تم کو دے دی ہے۔ اپنی بھٹی بھی ... یہ انمول ہیرے ہیں۔" اس کی بے رونق بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمکے اور کانوں کی طرف دوڑ کر تکئے میں جذب ہو گئے۔

عبدالجبار اس وقت اتنا موٹا نہ تھا۔ وہ ایف اے کے امتحان میں ساتویں بار فیل ہو کر گھر آیا تو باپ کی بیماری کے کارن گاؤں میں ہی رہ گیا۔ کئی بار اسے شہر جاکر کاروبار کو بھی دیکھا۔ اور کئی بار گاؤں میں بھی معاملے کو سنبھالا۔ اسے اپنے اندر طالب علمی کے رئیسانہ لاابالی پن کے بجائے ایک شاہانہ اعتماد کا پودا جڑ پکڑتا محسوس ہوا۔ اس نے پورے ایک برس باپ کے مرنے کا انتظار کیا۔ انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ انتظار کرتے کرتے اس کا جسم پھولنے لگا اور دل کا خوف جم کر پتھر بنتا گیا۔ اس تبدیلی سے اسے ذرا گھبراہٹ نہ ہوئی۔ وہ خاموشی سے باپ کے بستر مرگ کے کنارے بیٹھا گاؤں کی جائداد کو سنبھالنے اور بڑھانے کے گر سیکھتا رہا۔ لیکن اسے زیادہ دلچسپی بھٹی سے تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ بھٹی اندھیری رات کا ستارہ ہے۔

اس رات باپ نے دوبارہ کہا کہ اب چند دن کا مہمان ہے۔ لیکن عبدالجبار سال بھر سے یہی سنتے سنتے تھک چکا تھا۔ باپ کے خوشگوار وعدے پر یقین نہ آیا۔ اچانک اس کے باپ نے چیخ ماری اور اپنی سفید آستین میں اپنا منہ چھپا لیا۔ "یا اللہ میں بڑا گنہگار ہوں۔ عمر بتادی اور حج بھی نہ کیا۔۔۔ سفر آخرت کے لئے تو کوئی سامان کر ہی نہ پایا تھا ابھی میں۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ عبدالجبار کو اپنے باپ کا چہرہ کفن سے جھانکتا ہوا معلوم ہوا۔ اس نے بڑی مستعدی سے کاغذ کی پڑیا کھولی اور دوا کے گلاس میں سفوف ڈال دیا۔ بہت محبت سے اپنے باپ کو سہارا دے کر سر اٹھایا اور دوا کا ایک ایک قطرہ قبر کی طرح کھلے ہوئے منہ میں ٹپکا دیا۔

"ابا آرام سے سو جائیے۔ آپ کی تکلیف بہت جلد دور ہو جائے گی۔" عبدالجبار نے آہستہ سے کہا جیسے اس کا دل پھٹا جا رہا ہو۔

باپ نے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ آنکھیں پھر نہ کھل سکیں اور سویرا ہو گیا۔

عبدالجبار کا باپ عبدالستار جنتی آدمی تھا۔ جمعہ کو مرا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جب صبح نے پہلی بار اس کو مرا پایا تو اس کی آنکھیں بند تھیں جیسے نیند میں غافل ہو۔ دونوں ہاتھ سینے پر برہنہ بندھے ہوئے تھے۔ گویا لیٹا لیٹا نماز ادا کر رہا ہو اور رخ کعبہ شریف کی طرف تھا۔ البتہ

ہونٹ کچھ اس طرح بھنچے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی گلے میں کوئی بڑی کڑوی دوا زبردستی اتار دی گئی ہو۔

بیٹے نے جنازے میں شریک ہونے والوں کے منہ سے اپنے باپ کی نیکی اور خدا ترسی کا ذکر سن کر آنسو بہائے اور سسکیاں بھریں۔ چند ہی ہفتے بعد رئیس عبدالستار مرحوم کی قبر ایک شاندار پختہ مزار بن گئی اور اس کے سرہانے سنگ مرمر کا کتبہ چمکتا نظر آیا۔

پھر اس کے بعد ہر سال اس مزار پر عید کی پچیس تاریخ کو چادر چڑھائی جاتی۔ عرس ہوتا۔ قوالی ہوتی۔ حلوائیوں کے خوانچے سجتے۔ رات بھر اجالا ہوتا۔ عورتوں کا میلہ لگتا۔ گیت گائے جاتے اور مرادیں مانگی جاتیں جو کبھی بر نہ آتیں۔ مگر اندھے عقیدے کا دریا چڑھتا ہی رہتا۔

عبدالجبار نے باپ کے سدھارتے ہی اپنی ماں کو، جو مرحوم کا "آخری محل" تھی، کرار خان کے ساتھ حج کے لیے روانہ کر دیا۔ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کے بعد دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ کچھ اس طرح بیٹھیں کہ پھر نہ اٹھیں...... خاموشی سے چل بسیں اور اپنی خوش قسمتی پر لوگوں کو رشک کرنے کے لیے تڑپتا چھوڑ گئیں۔

اس نے ماں کی آخری اور واحد جیتی جاگتی یادگار سکینہ کو گلے سے لگایا۔ اس وقت وہ صرف پانچ برس کی تھی ماں سے بچھڑنے کے بعد وہ ایسی خاموش ہوئی کہ پھر ایک زمانے تک ہاں ہوں سے زیادہ بولی ہی نہیں...... سب کی باتیں سنتی۔ نگاہیں اٹھا کر دیکھتی اور ہونٹ بھینچ لیتی۔ اسے دو دو بوڑھی اور پرانی نمک خوار ماماؤں کی نگرانی میں حویلی کے سب سے پچھواڑے والے آنگن کے دو کمروں میں زندگی گزارنے اور پھلنے پھولنے کی پوری آزادی دے دی گئی تھی۔

اس نے اپنے تینوں سوتیلے بھائیوں کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا...... وہ سب عمر میں اس سے بڑے تھے اور بالترتیب بڑے سرکار، منجھلے سرکار اور چھوٹے سرکار کہلاتے تھے۔ دیکھنے میں تینوں انتہائی جاہل، گنوار اور نکمے معلوم ہوتے تھے۔ اس نے تینوں بھائیوں سے بڑی مربیانہ شان سے بات کی۔ ان کو زندگی کی اونچ نیچ سمجھائی۔ باپ کی خواہش اور دربار کی عزت کی طرف توجہ دلائی۔ اور بتایا کہ حویلی کا ایک ایک آنگن تینوں بھائیوں کے حصے میں آئے

گا۔ جہاں ان کا اپنا خاندان جیسے چاہے رہ سکتا ہے۔ حویلی کا باورچی خانہ مشترکہ ہوگا۔ اگر کوئی بھائی اپنا الگ باورچی خانہ رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے۔ لیکن حویلی کے خاص باورچی خانہ سے ان کو ․ راتب․ ملتا رہے گا۔ اور سارا انتظام اسی طرح رہے گا جس طرح ابا مرحوم کے زمانے میں تھا۔" ابا مرحوم کا ذکر کرتے ہی اس نے اپنی آنکھیں چھوئیں اور آہستہ سے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا: "خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے!"

تینوں بھائیوں نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی کے حُسنِ سلوک کی تعریف کی اور ان کے سر بارِ احسان سے جھک گئے۔ انہوں نے باپ کے بعد اب اسے سرکار کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے آنگن میں اپنی بیوی بچوں سمیت دفن ہوگئے۔

پندرہ برس سے اس حویلی کو، اس دربار کو، دربار کی رونق اور شان کو، عبدالجبار ہر طرح کے دیکھے ان دیکھے طوفانوں سے بچاتا رہا تھا..... زندگی سکھ چین سے کٹ رہی تھی۔ لیکن اس اطمینان اور سکون اور بے فکری اور شان و شوکت کی تہہ میں نجانے کتنی الجھنیں اور بے چینیاں تھیں۔

اس بڑے جہاز کے کپتان نے آنکھیں کھول دیں اور نشے بھری نظروں سے سجے ہوئے کمرے کی خاموش دیواروں کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے نظر "سبحان اللہ" کے طغرے پر پڑی اور اس کے بعد آخری طغرے پر جس کی سرخ زمین پر سنہرے حروف میں لکھا تھا: "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں" اسے ایسا لگا کہ اس زمین کو زلزلے نے جھنجھوڑ دیا ہے، زمین سرخ سمندر بن گئی ہے اور لہریں حقیقتِ منتظر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں اور رفتہ رفتہ ان کا تلاطم اتنا بڑھ گیا ہے کہ لہریں ساحل کو چھو کر باہر لپکنے لگی ہیں۔

وہ گھبرا کر اٹھا اور مسہری پر گر گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب دوبارہ آنکھیں کھولیں تو لہریں غائب ہو چکی تھیں اور فریم سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ سنہرا چہرہ، پیشانی پر سجدے کا سنہرا نشان، ہونٹ بھنچے ہوئے ..... ہونٹ تھرتھرائے ..... "بیٹے میں تیرا احسان مند ہوں۔ تو نے دنیا کے جنجال سے چھٹکارا دلا دیا۔ اب میں آرام سے جنت میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ لیکن یہاں بھی ایک فکر سے جان پر بن آئی ہے۔ کبھی کبھی کوئی فرشتہ

آتا ہے اور میرے کان میں کہتا ہے ..... تم نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جس دولت کو سمیٹنے میں صرف کیا تھا وہ تمہارے چشم و چراغ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ لیکن میں جانتا ہوں یہ فرشتے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہاں فرشتے بھی جھوٹ بولتے ہیں اور خدا کی خوشامد کر کے اپنا عہدہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ بہت سے فرشتے بہت کام چور ہوتے ہیں مگر رہتے ہیں بڑے ٹھاٹ سے۔ انہوں نے خوشامد کر کے خداوند کریم سے عقل زیادہ لے لی ہے اور وہ عقل کے چابک سے دوسرے بیوقوف اور بودے فرشتوں کو اپنے سنہرے رتھوں میں ہانکتے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہاں بہت لطف آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اپنے گاؤں میں ہوں اور انتظام اس طرح چلتا ہے جیسے میں چلایا کرتا تھا۔

"اب میرے آرام کا وقت ہو رہا ہے نام پکارے جائیں گے اور میں غیر حاضر ہوا تو میرا حقہ تیار کرنے والے فرشتے کو حکم دے دیا جائے گا کہ مجھے سزا کے طور پر خمیرہ تمباکو نہ دیا جائے اور تم جانتے ہو.......... اچھا میں چلا بیٹے۔ لیکن یاد رکھنا میں جو سونے کی کشتی تمہیں دے آیا ہوں اسے ڈوبنے سے بچانا، وہ میری ساری زندگی ہے.......... اور ہاں جو تم نے دوا دی تھی آخری رات، وہ ذرا زیادہ کڑوی تھی۔ میرا خیال ہے اس سے کم مقدار میں بھی مریض کا دکھ درد دور ہو سکتا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔ اور ہاں میری پیاری بچی سکینہ کی شادی کسی بڑے گھر میں کرنا جہاں اس کے شایان شان......" عبدالجبار زور سے چیخا: "بھوت ..... بھوت!"

آواز آئی: "میں بھوت نہیں ہوں۔ میں تیرے باپ کی روح ہوں"۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ کمرے میں خاموشی تھی اور طغرے اپنی تقدس بھری آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔ وہ ہنسا اور ایک جام پی کر اپنے بازوؤں کو ہوا میں اٹھایا۔

"سب ٹھیک ہے۔ میں بڑا آدمی ہو گیا ہوں!" وہ ٹہلنے لگا۔

"لیکن سکینہ کی شادی تو ڈپٹی نصیر احمد کے بیٹے سے ہی کرنی پڑے گی۔ یہی ایک راستہ ہے شراب کی بھٹی کو تباہی سے بچانے کا۔ لونڈا کائیاں ہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی بھٹی کا کاروبار کتنا پھیلا لیا ہے۔ نہیں نہیں وہ دربار کا داماد بن کے رہے گا۔ اسی میں نجات

ہے۔ کڑا کے کا جہیز دینا ہوگا۔ خیر وہ تو کوئی مشکل نہیں۔ لیکن مصیبت تو سکینہ کا ہسٹریا ہے۔ جاوید ڈاکٹر تو تیز معلوم ہوتا ہے۔ فوراً سمجھ گیا۔ میں تو خود ہی جانتا تھا۔ یہ مولویوں کی جہالت ۔۔۔ آسیب! میں خود ہی ایک آسیب ہوں۔۔ دیکھتا ہوں کیسے اچھی نہیں ہوتی سکینہ۔ لیکن یہ جاوید خطرناک لگتا ہے۔ ایمانداری کا بھوت سوار معلوم ہوتا ہے اس پر۔ کرن سنگھ پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ میرے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔ لیکن خیر۔۔۔۔ اگر وہ جاوید کو جال میں پھانس لے تو پانچوں انگلیاں گھی میں ۔۔۔۔۔

شکر کی مل کھل جائے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں۔ ڈپٹی نصیر احمد کے ہاں سمدھیانہ قائم ہوتے ہی ایک دو اور حصہ داروں کو داؤ پر لاکر الو سیدھا ہو سکتا ہے ۔۔۔۔ پھر یہ سارے دشمن چاروں خانے چت نظر آئیں گے ۔۔۔۔۔۔ حرام زادے!"

وہ مسکرایا، آہستہ آہستہ اٹھا، مسہری کے سرہانے سے چمڑے کا ایک قیمتی تھیلا نکالا۔ لیکن تھیلے کو ویسے ہی چھوڑ کر پہلے دروازہ بند کیا اور پھر آکر مسہری پر بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی روشنی اور تیز کر دی۔

اس نے دونوں تکیوں پر اپنی کندہ نما کہنیاں ٹیک دیں اور پوسٹ کارڈ سائز کی چمکتی ہوئی رنگین تصویروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی اضطراری کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ پھر آنکھیں کھولتا اور نشے بھری بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے دوسری تصویر دیکھنے لگتا۔ یہ عورتوں اور مردوں کی عیاشیوں اور جنسی قلابازیوں کی رنگا رنگ تصویریں تھیں۔ ننگی رانیں، ننگے سینے اور درمیان میں ناف کا نشان، جس پر عبدالجبار کی نظریں جم جاتیں اور لگتا جیسے اس کا سارا خون اس تھرکتے ہوئے بھنور میں ناچ رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی ان تصویروں کو سینے سے لگا لیتا، اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر بھاری سانس لیتے ہوئے انہیں بے اختیار چومنے لگتا ۔۔۔۔۔۔۔۔ یکا یک اس کے چہرے میں ایک کرب انگیز نشاط کی چمک پیدا ہوئی اور اس نے آخری تصویر کو اس طرح دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی سادھو طلوع ہوتے ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا ہو۔

"جانتا ہوں میری زندگی خطرے میں ہے۔ جانتا ہوں بینک میں میرا اکاؤنٹ دھوپ

میں رکھی ہوئی برف کی سل کی طرح تیزی سے پگھل رہا ہے۔ جہاں اتنی سازشیں ہوں، جہاں سارا کاروبار رشوتوں پر چلتا ہو، جہاں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھانے کے لئے تیرتی رہتی ہو وہاں .... لیکن میں آسانی سے ہار نہیں ماننے کا... خیر ہار و گولی!"

اس کے جسم میں ایک عجیب پھرتی اور لچک پیدا ہو گئی۔ ایسی پھرتی جو شکار پر جھپٹنے سے پہلے شیر میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک چمچ معجون منہ میں ڈالا اور چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی دو گولیاں کھائیں اور دیوار پر لٹکتا ہوا پردہ اٹھا کر اندھیرے زینے پر سے اترتا ہوا تہہ خانے میں پہنچ گیا، جہاں ایسا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ وہاں ایک عجیب قسم کی خوشبو بسی ہوئی تھی "ملے دلے پھولوں کی خوشبو، چنبیلی اور آملے کے تیل کی خوشبو، جس میں پسینے کی کھٹاس کا مزا بھی تھا۔ اس نے آخری کونے میں جا کر ایک کھڑکی جتنے چھوٹے دروازے کی زنجیر چھو کر دیکھی اور واپس آ کر دوسرے کونے میں گر گیا۔

ایک سسکتی ہوئی آواز ابھری: "مری ہائے مری"

مسجد سے اذان کی لرزتی ہوئی آواز آتی اور حویلی میں زندگی کی حرکت شروع ہو جاتی۔ یہ حرکت آہستہ آہستہ پیدا ہوتی جیسے جنگل میں سانپ یا کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہوں۔

سب سے پہلے مامائیں اور بھٹھانیاں جاگتیں اور باورچی خانے والے آنگن کا راستہ لیتیں۔ وہاں لکڑی کے چولھے جلتے اور دھواں آنگن کی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ کچھ مامائیں

دبے پاؤں ایک محراب سے دوسری محرابوں کی طرف جاتیں اور ٹمٹماتی ہوئی لالٹین بجھا دیتیں۔ کبھی کبھی کھڑکی سے جھانک کر کمروں میں بھی دیکھ لیتیں جہاں منجھلے یا چھوٹے سرکار اوندھے منہ ننگے پڑے نظر آتے اور ان کی بیویاں پورا لحاف تانے مزے میں سوتی ہوتیں۔ بڑے سرکار کے کمرے میں کوئی ایسا روح فرسا اور دلچسپ منظر نظر نہ آتا۔۔۔۔ اس لئے کہ وہ تو مخدوم ہو گئے تھے اور اللہ سے لو لگائے ایک کونے میں پڑے رہتے تھے۔ سال میں ایک بار اجمیر شریف کے عرس میں جا کر اپنی معرفت کی دھار تیز کر لیتے تھے۔ البتہ ان کے سولہ برس کے صاحبزادے جو ابھی سے مخدوم بننے کے خواب دیکھ رہے تھے کبھی کبھی کسی دوگنی عمر کی پٹھانی سے نہ جانے کیسے کیسے گر سیکھتے۔ بڑا کہرام مچتا لیکن یہ کہرام سورج کی پہلی کرن کے آنگن میں پہنچنے سے پہلے ہی دبا دیا جاتا۔ مخدوم کی بیوی تسبیح کھٹکھٹاتی ہوئی آتی اور ماماؤں کو بھگا کر مجرم پٹھانی سے کہتی۔ "یہ کیا اندھیر ہے چڑیل۔ تو میرے لال کے توشک کا تو خیال کرتی۔ خبردار جو آئندہ کبھی رات کو یہاں سوئی۔ بیٹے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو اور اپنا جزدان اٹھا کر مکتب جاؤ۔"

سرکار عبدالجبار کا خاص محل الگ تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ دو بیویاں ایک ہی آنگن میں مگر الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ دونوں میں سے کسی کی گود ہری نہ ہوئی حالانکہ خود عبدالجبار سے لے کر ڈاکٹروں، ویدوں، حکیموں اور پہنچے ہوئے شاہ صاحبوں نے سارا زور لگا کر دیکھ لیا۔ پہلی بیوی نے تو سوتن کی جلن میں کرار خان کا سہارا بھی لیا اور اب کے ابر رحمت کچھ ایسا برسا کہ بانجھ پودے میں بھی جان پڑ گئی اور کونپل پھوٹنے کی دھوم مچ گئی۔ عبدالجبار نے شکرانے کی نماز بھی ادا کی اور پورے ایک ہفتہ تک تہہ خانے کا رُخ بھی نہ کیا۔ مسلسل آ کر اپنی بیوی کا بستر گرم کرتا رہا جو ہر رات اپنے شوہر کے پہلو سے غائب ہوتی رہی اور کرار خان کی مہربانی کا معاوضہ ادا کرتی رہی۔۔۔ لیکن پھر کچھ ایسی گڑبڑ مچی کہ سارا خون پانی کی طرح بہہ گیا اور دل کی کلی کھل نہ سکی۔ اب کے عبدالجبار کی دوسری بیوی نے بتاشے اور جلیبیاں تقسیم کیں اور عبدالجبار نے پھر کبھی پہلی بیوی کے کمرے کا رُخ نہ کیا۔

حویلی کی ساری جوان لڑکیاں منہ اندھیرے باورچی خانے والے آنگن میں پہنچ جاتیں

اور صابن سے ہاتھ پیر دھو کر ایک دوسرے پر چھینٹے اڑاتی ہوئی سنگ مرمر کے حوض کے پاس چبوترے پر بیٹھ جاتیں۔ آٹے سے بھرے ہوئے کھٹوت رکھے رہتے۔ ایک ماما بالٹی سے پانی انڈیلتی جاتی اور پھر مٹھیوں کا ناچ شروع ہو جاتا۔ سنہری، گندمی، کالی، بھری بھری اور لاغر مٹھیاں دھنستی اور ابھرتیں۔ لڑکیاں جاڑے میں بھی پسینے پسینے ہو جاتیں اور ان کے پسینے کے قطرے گزرتے ہوئے آٹے میں ٹپک جاتے، تھوڑی دیر بعد وہ جسمانی محنت سے تھک کر آنچل سے منہ پونچھتی ہوئی چبوترے سے اترتیں اور پھر ایک بار صابن سے ہاتھ دھوتیں اور ایک دوسرے پر دھول جماتی ہوئی اپنے گھونسلوں کی طرف بھاگ جاتیں۔

پٹھانیاں اپنی اپنی قاب میں گندھا ہوا آٹا نکالتیں اور اپنے اپنے چولھے کی طرف لپکتیں۔ اور گھر کے نوکر چاکر ملا کر پچاس افراد کے لئے چپاتیاں سینکی جاتیں۔ چپاتیاں اور آلو، ترئی، بھنڈی اور دوسری موسمی ترکاریوں کے برتن ہر آنگن میں پہنچ جاتے۔ کوئی پٹھانی سینی سر پر اٹھاتی اور مکتب کے مولوی اور اسکول کے ماسٹر کا ناشتہ لیکر باہر نکل جاتی۔ سرکار کا باورچی خانہ باہر ہی تھا اور وہاں کوئی بیس آدمیوں کا کھانا روزانہ پکتا تھا۔ اور ایک خاص باورچی تھا جو عبدالجبار کے دسترخوان کی جان اور آبرو تھا۔

حویلی کی زندگی باورچی خانے، سلائی کی مشینوں، جھولوں، تہواروں اور کنگھی چوٹی میں کٹ رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بڑا دھماکہ ہوتا تو حرامی اور حلالی کی بحث چل نکلتی تھی۔ ایک آنگن دوسرے آنگن پر کیچڑ اچھالتا۔ کسی کے ہاتھ کسی کی چوٹی کی طرف جھپٹتے تھے، دانت اور ناخن ہتیار بن جاتے تھے۔ اور پھر ہنگامہ خود بخود دب جاتا تھا اور یہ چیخ دھاڑ حویلی کی مضبوط دیواروں سے ٹکرا کر اندر کی اندھیری گہرائی میں دفن ہو جاتی تھی اور سارا کارخانہ بدستور چلتا رہتا تھا۔

ابھی آنگن میں اندھیرا ہی تھا کہ سکینہ کی ہم عمر بھتیجی سنجیدہ نے اس کی کھڑکی سے جھانک کر کہا: "شہزادی اٹھو، باورچی خانے چلو۔ کب تک پلنگ توڑتی رہوگی۔"

سکینہ لحاف پھینک کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور سینہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ فوراً منہ ہتھیلیوں میں چھپا کر رونے لگی۔

"اچھا ڈھکوسلا ہے!" نجیدہ نے کہا اور برا سا منہ بنا کر ٹھینگا دکھاتی ہوئی اٹھلا کر آگے بڑھ گئی۔

سکینہ نے چہرے سے ہتھیلیاں ہٹائیں۔ اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور آنکھیں ڈبڈبا کر چھلک رہی تھیں۔ اس کے زرد رخساروں پر گلابی دھبے جل بجھ رہے تھے۔ اس کا قد میانہ تھا مگر لمبا معلوم ہوتا تھا۔ بازو بھرے بھرے تھے۔ کمر اتنی پتلی تھی کہ لگتا تھا ہوا کے جھونکے میں لچک جائے گی۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کو مٹھی میں لے کر آئینے میں دیکھا مگر روشنی کی کمی کی وجہ سے دھندلی پرچھائیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر قدم ڈگمگا گئے اور وہ بڑی بے بسی کے ساتھ بستر پر گر گئی۔

تھوڑی دیر میں اس کی خاص پٹھانی بڑھیا جمعراتن آئی۔ اس نے لالٹین بجھائی اور غور سے سکینہ کو دیکھا "یا اللہ!" اس نے سکینہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "بخار ... ہائے میری بچی!"

کرار خان ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑا۔ لیکن ڈاکٹر بہت سویرے کلیا کو دیکھنے کے لیے جا چکا تھا۔ وہ ہر صبح ہسپتال کے وقت سے پہلے اس غریب لڑکے کو دیکھنے کے لیے جاتا تھا۔ آنے کے بعد وہ ہسپتال کے مریضوں میں گھر کر حویلی کے بلاوے کے بارے میں بھول ہی گیا۔

سکینہ کا سر پھٹ رہا تھا اور وہ بار بار ہونٹوں کو دانتوں سے دبا کر اپنی کراہ کو روک لیتی تھی جو کبھی کبھی دبی ہوئی چیخ بن کر اس کے منہ سے نکل جاتی تھی۔ اس کے پاس کوئی نہ آیا ... روز روز کے بیمار کے پاس کون آتا۔ ویسے بھی وہ تو سب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ صرف بڑھیا جمعراتن اس کے سرہانے سر کے کی ٹھنڈی پٹیاں رکھتی رہی اور پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی۔ دوا ایک بار وضو کر کے کلام الٰہی کی ہوا بھی دی۔ لیکن کچھ کارگر نہ ہوا۔

"بڑا پاگل ڈاکٹر ہے۔ ہر ڈاکٹر دربار کے آگے ناک رگڑتا ہے اور یہ ہے کہ کچھ سنتا ہی نہیں۔ جنے ہے کس کھیت کی مولی!"

ایک بار بہت دن ہوئے جب سکینہ نے کسی بات پر چڑ کر اپنی منجھلی بھابی کو کوئی سخت بات کہہ دی تھی تو اس نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔ "او ہو کس برتے پر تتا پانی۔ تم ہو کس کھیت کی مولی۔ میرے سسر اللہ کو پیارے ہوئے۔ اب تم کو پوچھتا کون ہے میری لاڈو۔"

سکینہ اپنی بھابی کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، مگر اس نے ایک موتی بھی زمین پر گرنے نہ دیا۔ بس وہ کمرے میں بند ہوگئی اور مرجانے کی دعائیں مانگتی رہی۔

اس وقت ڈاکٹر کے بارے میں جمراتن کے منہ سے ایسی بات سن کر اسے اپنا خیال آگیا۔ اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور چیخ گلے میں دبا دی۔

جب سے اس کا باپ مرا تھا اور ماں خانہ کعبہ کی خاک کا پیوند بن گئی تھی تب سے وہ اس بھری حویلی میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔ جب وہ بڑی ہوئی تو اس کی دوستی اپنے رشتے کے ایک لڑکے صمد سے ہوگئی۔ اس کی عمر اٹھارہ برس تھی اور وہ حویلی کی بیبیوں کی خدمت کرکے اپنا پیٹ پال رہا تھا۔ اس کو ناول پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ ناولوں اور داستانوں میں اسے چاٹ کا مزہ آتا تھا۔ بہادری کے ناول۔ جانے وہ کہاں کہاں سے پیسے چاکر اپنے نیفے میں جمع کرتا اور جب خوشبودار بال صفا صابن، تولیے، شلوکے کے کپڑے، چمکدار سینڈل، چاند چکی وغیرہ لینے پاس کے شہر جاتا تو ایک حکیم سے کتابیں خرید لاتا جو چورن کے علاوہ کتابیں بھی بیچتا تھا۔ وہ کتابیں پڑھنے کے بعد سکینہ کو دے دیتا اور وہ دروازے کی کنڈی چڑھا کر بغیر کھائے پئے کتابی قصوں کو نگلتی رہتی۔ اس کو "الف لیلیٰ" اور "سمرنا کا چاند" یہ دو کتابیں اتنی پسند آئیں کہ ہزار مانگنے پر بھی اپنے دور کے رشتے کے بھائی صمد کو یہ کتابیں نہ لوٹائیں اور اس نے آخر چڑ کر کہا۔ "کتابیں نہیں دو گی تو میں ...." اور اس سے پہلے کہ سکینہ کے نازک ہاتھ اس کو دھکیلیں اس نے سکینہ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ سکینہ کی آنکھوں میں نہ جانے کتنی روشنیاں جلیں اور بجھیں۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ صمد نے سہارا دیکر اسے بستر پر لٹا دیا۔ پھر جھک کر سکینہ کا پیر چھوا جیسے حیرت زدہ بچہ تتلی کے پر چھوتا ہے۔ سکینہ تڑپ کر بیٹھ گئی۔ صمد اس کی آنکھوں کی وحشت سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کے بعد سکینہ دیر تک اپنی سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتی رہی اور الف لیلیٰ کے ورق الٹتی رہی۔ لیکن کچھ پڑھ نہ سکی اسے ایسا لگتا کہ سنہرے دودھ کا دریا خود اس کے سینے سے پھوٹ رہا ہے۔ اس کی لہریں اٹھتی ہیں تو ان کے ساتھ چڑھتے سورج کی گلابی کرنیں ناچ اٹھتی ہیں اور ان لہروں میں اس کا دل کنول کے پھول کی طرح، خوشبو کی ننھی سی کشتی کی طرح تیر رہا ہے۔ اور چند ان دیکھی انگلیاں کشتی کے چپوؤں کو چلا رہی ہیں جن سے صندل کی بھیگی ہوئی خوشبو آ رہی ہے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ آنکھیں کھول دے اور الف لیلیٰ کے ان خوابوں کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کر دے۔ مگر خواب اس کی آنکھوں میں تیرتے رہے اور اس کے دل، اس کے لبوں اور رخساروں کو چومتے رہے۔ وہ سو گئی۔ اور نیند میں بھی یہی خواب گھر گھر کر سنہرے بادلوں کی طرح آتے رہے اور اس کی روح پر چاند برساتے رہے۔

الف لیلیٰ کا شہزادہ زندہ ہو گیا اور اس حویلی کے بام و در سے جھانکنے لگا۔ وہ اندھیری دیواروں سے نکلتا اور پھر ان ہی دیواروں میں خوبصورت پرچھائیوں کی طرح جذب ہو جاتا۔ سکینہ کو اپنے شہزادے سے عشق ہو گیا۔ وہ آتا تو سکینہ لالٹین بجھا دیتی اور رنگین بادلوں میں اڑنے لگتی۔ جن کے سائے میں ایک سنہری کشتی صندل کے چپوؤں کے سہارے ڈوبتی ہوئی سنہری موجوں سے کھیلنے لگتی۔ ایک رات شہزادے کو شرارت سوجھی ...... اس نے اپنی انگلیاں اس کی نازک گردن پر رکھ دیں اور ہونٹوں اور دھڑکتے ہوئے سینے پر دوڑتے ہوئے شعلوں کی طرح لپٹی ہوئی سرخ ساری ...... کو چھو کر مسکرایا۔ پھر اس نے کشتی سے بادبان کو اتارنا شروع کر دیا۔ شہزادی آج ہوا طوفانی ہے۔ بادبان اتار دو اور کشتی کو لہروں میں چھوڑ دو۔ پہلے تو وہ مسکرائی۔ لیکن جب اس کے جسم سے لپٹا ہوا سرخ شعلہ آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا تو اس کی جان نکل گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور شہزادے کے گال پر اتنے زور سے طمانچہ پڑا کہ اس کی انگلیاں شہزادے کے گال پر آگ کی مچھلیوں کی طرح تیر گئیں۔ شہزادہ پرچھائیں بن کر آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے دیواروں میں جذب ہو گیا۔

شہزادی نے سرخ شعلوں کو اپنے چاروں طرف لپیٹا۔ شلوکے کے بٹن لگائے، ایک

انگڑائی لی۔ لالٹین کی روشنی تیز کی اور الف لیلیٰ کی جلد اٹھا کر پڑھنے لگی اور صبح تک پڑھتی رہی۔
شہزادہ غائب ہوگیا وہ کسی نوٹنکی کی منڈلی میں شامل ہوگیا تھا۔ دن بھر کسی رنڈی کے پیر دباتا اور رات کو منہ پر پاؤڈر تھوپ کر اور کمر پر چمکی لگی ہوئی لکڑی کی تلوار باندھ کر راجکماروں اور شہزادوں کا پارٹ ادا کرتا۔ اور رات گئے مسخروں کے درمیان بیٹھ کر حویلی کے مزیدار اور چٹپٹے راز فاش کرتا ... اور لوگ چٹخارے لینے لگتے تو وہ کہتا: "سالے منہ میں پانی بھر آیا؟"

سکینہ اس وقت اپنے کمرے میں پڑی ہوئی تھی، اور بے چینی سے ان خوابوں کو یاد کرکے ایک ضدی بچے کی طرح ان خوابوں سے لڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر جاوید کو آخر شام کو فرصت ملی اور وہ جب حویلی میں داخل ہوا تو لالٹین جل چکی تھی۔ پُر اسرار حویلی میں بہت سی پرچھائیاں نظر آئیں۔ پچھلی بار جب وہ آیا تو یہاں ایک عجیب سناٹا تھا۔ اب کے تو بہت سے چہروں پر ناک تک آنچل کی نقاب پڑی ہوئی تھی لیکن آنکھیں زندہ تھیں، دوڑتی، تھرکتی، ایک دوسرے کو اشارے کرتی ہوئی آنکھیں۔ یہ آنکھیں کالی بھی تھیں اور بھوری بھی۔ یہ آنکھیں بڑی بھی تھیں اور چھوٹی بھی۔ ابھری ہوئی بھی تھیں اور دھنسی ہوئی بھی۔ ان سب میں غضب کا تجسس بھرا تھا۔ اسے ان آنکھوں سے بڑا ڈر لگا۔ اور وہ تیز تیز کرار خاں سے بھی آگے ایک آنگن سے دوسرے آنگن کی طرف لپکتا رہا۔

جب اس نے اس کمرے میں قدم رکھا جہاں پچھلی بار ایک بے چین چیخ سنی تھی اور اس نے ایک زخمی پرندے کو تڑپتے اور ہرن کی آنکھوں کو التجا کرتے ہوئے دیکھا تھا تو اس کے دل میں ایک گھبراہٹ پیدا ہوئی اور اس کا جی چاہا کہ لوٹ جائے۔ لیکن اس کا ہاتھ بڑھا اور ایک گرم کلائی اس کے ہاتھ میں آگئی اور ایک بھری ہوئی نبض اس کی انگلیوں میں سوئی کی طرح چبھنے لگی۔ سکینہ کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں جیسے پھٹے بادلوں سے چاند نکل آئے۔
اس نے حیران آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھا جیسے کچھ پوچھ رہی ہو۔
"کیسا لگ رہا ہے" جاوید نے پوچھا مگر جواب سے محروم رہا۔

بڑھیا جمعراتن آنگن میں ٹہل ٹہل کر دعا مانگ رہی تھی۔ اور کرار خاں زینے پر بیٹھا آنگن سے جھانکتے ہوئے آسمان کو دیکھ رہا تھا.....

"آج پانی برسے گا"۔ اس نے جمعراتن سے کہا۔

"برسے گا تو برسے، میری بلا سے!" اور وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

جاوید نے لحاف ہٹایا، سکینہ کے شاداب جسم کا جائزہ لیا اور کان میں آلہ لگا کر اس کے سینے کی دھڑکن سننے لگا۔ سکینہ کو گرم گرم سی گدگدی محسوس ہوئی۔ لیکن وہ دم سادھے پڑی رہی۔

"ڈاکٹر صاحب اگر میں اچھی نہیں ہو سکتی تو مجھے مار ڈالئے۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔" اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"سکینہ، تمہارے جسم میں کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟"

اس وقت اس کے سینے میں درد ہو رہا تھا لیکن اس نے کہا "نہیں"۔

"ڈاکٹر سے جھوٹ نہیں بولتے۔"

سکینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر کو غور سے دیکھا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری، اور اس نے کہا: "جھوٹ نہیں بولتی"

"اچھا بتاؤ تم مرنا کیوں چاہتی ہو؟"

اس نے آنکھیں پھیلا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ "میں مرنا کیوں چاہتی ہوں؟"۔ اس کی آنکھوں نے سوال دہرایا اور بس۔ خاموشی چھائی رہی۔

جاوید اس کی آنکھوں سے کترانے لگا۔ اس رات اس لڑکی کے بارے میں رئیس عبدالجبار یوں باتیں کر رہا تھا جیسے یہی اس کی امید کا سہارا ہو۔ اور اس وقت یہ لڑکی اپنی موت کی بات کر رہی تھی جیسے اس کی زندگی میں دور دور تک امید کی کوئی کرن نہ ہو۔

جاوید نے آہستہ سے کھانس کر کہا۔ "دیوار کی طرف کروٹ لو۔"

سکینہ نے دیوار کی طرف منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں اور شلوکے کے بٹن تھر تھراتی ہوئی انگلیوں سے کھول دیے۔ سب ڈاکٹر اس کو یونہی ستاتے تھے۔ "پتہ نہیں پیٹھ میں کیا رکھا ہے دیکھنے کو۔ اونہہ!" جاوید نے اپنے آلے کا سیاہ کان اس کی سنہری پیٹھ پر رکھ دیا جس میں

خون کا کوئی رنگ نہ تھا۔ ایک ٹھنڈی چمک ضرور تھی۔ اس کی انگلیاں سکینہ کی جلد سے چھو گئیں اور اسے انگلیاں جلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے آلے کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنا شروع کیا جیسے بھرے جنگل میں کانٹوں سے گھرے ہوئے پھول چن رہا ہو۔ یکایک اس نے بلور کے پیالے میں چمچے کے ٹکرانے کی آواز سنی۔ سکینہ کی ہنسی جلترنگ سے کتنی ملتی جلتی تھی۔

"کیا ہوا؟" جاوید نے آلے کو گردن میں لٹکاتے ہوئے بڑی نرمی سے سکینہ سے پوچھا۔

"گدگدی ہو رہی تھی۔"

"اوہ!" جاوید نے گھبرا کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ذرا آنکھیں دکھاؤ۔"

"دیکھیے!" سکینہ چت لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں ۔۔۔۔ گہری، سیاہ اور بے قرار ۔۔۔۔

جاوید نے جھانک کر آنکھوں میں دیکھا سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور خمار سے آنکھوں میں ایک عجیب سی بے قرار تھکن جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ جیسے جاوید کا مذاق اڑا رہی ہوں۔ اس کی نگاہیں پھر کترانے لگیں اور اس نے اپنے آلے سے کھیلتے ہوئے بہت ہی گمبھیر اور تھرائی ہوئی آواز میں پوچھا:

"اچھا بتاؤ تمہیں کیا کیا چیزیں بری لگتی ہیں"

"مجھے؟" اس نے نچلا ہونٹ دبا کر سوچا۔ "سب چیزیں بری معلوم ہوتی ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔ ہوتا ہے۔ میں جو کہہ رہی ہوں۔"

"یہ تو تم غصے میں کہہ رہی ہو، سکینہ سچ سچ بتاؤ جب تم پر دورہ پڑتا ہے تو اس سے پہلے اور اس کے بعد کیا محسوس ہوتا ہے؟"

"بڑا ڈاکٹر صاحب میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ پرچھائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ جی چاہتا ہے ہر چیز کی گردن مروڑ دوں۔ کیونکہ ۔۔۔۔ کیونکہ ۔۔۔۔ کیسے بتاؤں ۔۔۔۔ لگتا

ہے یہ ساری پر چھائیاں اپنے ڈراونے سوکھے ہوئے ہاتھ بڑھا رہی ہیں میری گردن کی طرف۔ اس لئے مجھے ہر چیز سے نفرت ہو جاتی ہے۔ میں خاموشی سے مرنا چاہتی ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے تم ان پر چھائیوں سے بھاگنا چاہتی ہو۔"

سکینہ نے بڑی بے بسی کے ساتھ اپنی آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر جما دیں اور آہستہ سے سر ہلایا۔"جی ہاں!"

"اندھیرے میں ڈر لگتا ہے؟"

"مجھے نہ اندھیرے میں ڈر لگتا ہے نہ اُجالے میں۔ میں تو رات کو اکیلی جنگل جا سکتی ہوں۔ پہاڑوں اور سمندروں میں۔۔۔۔۔۔"اس کے دانت بجنے لگے۔"تم ظالم ہو۔ تم خونی ہو۔ نہیں میں اس دیو کے پاس نہیں جاؤں گی۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ شہزادے۔۔۔۔۔۔"

وہ چیخنے لگی۔۔۔۔۔ کرار خاں اور جمراتن دوڑتے ہوئے اندر آگئے۔ جمراتن سکینہ کی الٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔"اے بڑے پیر رحم کر۔ تم جو بھی ہو چلے جاؤ۔ میری بچی کو چھوڑ دو۔ تم اس کلی کو کھلنے دو۔ تم جو بھی ہو۔۔۔۔۔"سکینہ کی آنکھیں آہستہ آہستہ جمراتن کی تھرتھراتی ہوئی جھریوں بھرے چہرے پر جم گئیں:"کیا بک رہی ہے بڑھیا۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم لوگ اس کو اندھیرے میں قتل کرنا چاہتے ہو۔ میں اس کو بچاؤں گا۔۔۔۔"سکینہ کی آنکھیں چڑھی چڑھی سی گھومتی رہیں اور پتلیاں غائب ہونے لگیں۔

جاوید اس پر جھک گیا۔ اس نے لڑکی کا سر پکڑ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "سکینہ بے وقوفی کی باتیں بند کرو۔ مجھے دیکھو۔ میں ڈاکٹر ہوں۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔ دیکھو۔"سکینہ نے اس کو دیکھنے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں اور زور سے چیخ مار کر خاموش ہو گئی۔ اس کے دانت جکڑ گئے اور سانس کے آہنگ میں ایک تلاطم سا مچ گیا۔

ڈاکٹر جاوید نے رحم بھری نظروں سے سکینہ کو دیکھتے ہوئے کرار خاں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔

رات گئے دواؤں نے کام کیا۔ اس کا بخار بھی کم ہو گیا اور اس کی اضطرابی کیفیت بھی ختم

ہوگئی۔ جمعراتن کو اس نے کمرے سے نکال دیا اور خود لیمپ کی روشنی میں چھت کو گھورتی رہی۔
اس کی آنکھوں میں ایک جوان گھبرایا ہوا چہرہ تھا جو اس پر جھکا ہوا تھا اور ایک گرم ہاتھ اس کے پورے جسم کو سہلا رہا تھا۔ یکایک ہر چیز مٹ گئی اور اس کے منہ سے نکلا۔ "میں یہاں سے بھاگنا چاہتی ہوں۔ یہاں مر جاؤں گی۔ یہ ڈاکٹر بھی مجھے نہیں بچا سکتا۔ میں ۔۔۔ ہاں میں ۔۔۔۔ اس سے بھی ڈرتی ہوں!"
اسے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور جوڑ جوڑ تھکن سے ٹوٹنے لگا۔

8

رات کا وقت تھا۔ دھول سے بھری ہوئی خاموش سڑک پر ٹہلتے ہوئے جاوید ریلوے لائن سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ ڈھلان کے نیچے کھیتوں میں فصل دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ جاڑے کی ٹھنڈی ہوا کے زور دار جھونکے دھان کی بالوں میں سرسرا رہے تھے۔
جاوید نے کوٹ کا کالر چڑھا لیا اور جھک کر سگریٹ سلگانے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس وقت دھوئیں کی جلتی ہوئی خوشبو اسے بہت

فرحت بخش معلوم ہوئی۔ دن بھر کی تھکن دھوئیں میں اڑ کر دھان کے کھیتوں میں جذب ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کا بوجھ بھی دور ہونے لگا۔ خاموشی اور ٹھنڈی ہوا نے اس میں تازگی اور چستی پیدا کر دی۔ اس نے ایک پتھر کو جوتے کی نوک سے ٹھوکر ماری اور پتھر لڑھکتا ہوا نیچے جا رہا۔

وہ بہت دیر کے بعد بڑے دروازے سے اپنے کوارٹر میں داخل ہوا تو کھانے کی خوشبو نے اسے یاد دلایا کہ اسے شام ہی سے بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس نے دن کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں کو مل کر آواز دی۔

"جنگلی کھانا کھلاؤ۔ مرا جا رہا ہوں۔"

نُوا نے عشاء کی نماز ختم کی۔ پھر دونوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔

"تم اتنے چپ کیوں ہو؟"

"بس یوں ہی"۔ جاوید نے چونک کر منہ میں نوالہ لے جاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں بیٹا۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہوگا۔ امتیاز حسن کی لڑکی......"

باہر سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ پھر برآمدے میں کسی کے زور زور سے جوتے پٹک کر چلنے کی آواز آئی۔ کرسی گھسیٹی گئی اور جوتوں کی تال پر سیٹی بجنے لگی۔

جنگلی نے آکر کہا۔ "خاکی وردی والا جانور ہے"۔

"کیا؟" جاوید اٹھ گیا۔

کرن سنگھ نے اس سے ہاتھ ملا کر بیٹھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی۔" جاوید نے سگریٹ بڑھاتے ہوئے کہا اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا جو لیمپ میں دہکتا نظر آیا۔ رخسار کی ہڈیوں پر استرے کی پلیٹ سے بچے ہوئے بالوں نے اس کے چہرے میں ایک عجیب سی عیارانہ سخت گیری پیدا کر دی تھی۔

"یہ گاؤں تو آپ ہی کے علاقہ میں ہے نا؟"

"اور کس کے علاقے میں ہوگا۔ جناب ہم ایک ہی علاقے کے غلام ہیں۔ پبلک کے

خادم!" اس نے مسخرے پن سے قہقہہ لگایا اور جاوید سے داد وصول کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جاوید اسی طرح بیٹھا سگریٹ پیتا رہا پھر بے نیازی سے بولا۔

"آپ کو تو یہ علاقہ پسند ہو گا؟"

"علاقہ جنگلی ہے۔ لوگ بھی جنگلی ہیں ۔۔۔ ڈٹ کر فوجداری ہوتی ہے۔ سر پھوٹتے ہیں، مقدمے بازی ہوتی ہے! تھانیدار اور ڈاکٹر کی مصیبت ہے۔ عدالت کے اتنے چکر لگانے پڑتے ہیں کہ آدمی بیوی بچوں کی صورت دیکھنے کو ترس جائے ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن" اس نے جھک کر سازشی انداز میں سرگوشی کی اور ڈاکٹر کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ "علاقہ زرخیز ہے، غم نہیں کھانا پڑے گا۔ مرغی کھایئے ۔۔ حلوہ کھایئے!"

"اچھا؟" جاوید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

لیکن اب تھانیدار بکنے پر تلا ہوا تھا۔ "ایک سے ایک بد دماغ بدمعاش پڑا ہوا ہے جوار میں۔ لیکن میں کوئی لونڈا نہیں ہوں۔ سب کو ٹھیک رکھتا ہوں۔" اس نے چھوٹے سے ہنٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں بلا کا جادو ہے۔ بدمعاش سے بدمعاش بد کے گھوڑے کو رام کر لیتا ہے!"

جاوید نے بیزاری سے پوچھا "داروغہ جی آپ کھانا تو کھائیں گے نا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اگر آپ کہیں تو رات کو آپ ہی کا مہمان ہو جاؤں! تھکن سے برا حال ہے روز روز کا دورہ ۔۔۔۔ کہیں کوئی سالہ ڈاکہ مارتا ہے، کہیں ایک چلو پانی کے لئے گلا کاٹ لیا جاتا ہے، کہیں کوئی کسی کی نابالغ بیٹی کو بھگا لے جاتا ہے ۔۔۔ ہا ہا ہا!" اس نے ایک سگریٹ کے بعد دوسری سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا اور اپنی خاکی ہاف پینٹ سے جھانکتی ہوئی موٹی رانوں کے بالوں کو سہلانے لگا۔

جاوید اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جتنی دیر میں وہ واپس آیا تھانیدار نے جاسوس کی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور لپک کر میز سے ایک فریم اٹھا کر روشنی کے قریب آ گیا۔ جب جاوید دوبارہ کمرے میں آیا تو تھانیدار کی ناک اور منہ سے نکلا ہوا دھواں تصویر پر بادل کی طرح اتر رہا تھا۔

"یار یہ کسی لونڈیا کی تصویر ہے۔ بنگالن معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں میرے ساتھ پڑھتی تھی. کرسچین لڑکی ہے۔" جاوید نے سانس روک کر اپنی بات پوری کی۔

"خوبصورت ہے۔ بنگالن جوانی میں قیامت ہوتی ہے .... ہاہاہا!"

"ہاں آپ کچھ کہہ رہے تھے علاقے کے متعلق؟" جاوید کو اس سے نفرت ہو گئی۔

"بھئی گھبراتے کیوں ہو۔ سارا حال خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ سر میں جتنے بال ہوں گے سامنے ہی تو آئیں گے!" اس نے بڑے اطمینان سے کہا "بات یہ ہے کہ یہاں کے ڈاکو ہیں ... کوئی ایسے ویسے ڈاکو بھی نہیں ہیں۔ ان کی پرورش آس پاس کے زمیندار کرتے ہیں۔ سفید پوش بنے رہتے ہیں اور۔ خیر چھوڑو تم اپنی سناؤ ...." اس نے آپ سے تم پر آتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو چند ہی دن ہوئے ہیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"پیتے ہو؟" تھانیدار نے جھک کر پوچھا۔ اس کے منہ سے ٹھرے کا بھبکا آیا اور جاوید نے اپنا سر ذرا پیچھے ہٹا لیا۔

"نہیں!"

"لو! آدمی پیئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ تم تو نوجوان ہو۔ میں تو ادھیڑ ہوں۔ روز ٹھرا پیتا ہوں۔ اچھی مل جائے تو انکار نہیں، بری سے بری مل جائے تو انکار نہیں۔ اس کے بغیر جینا دو بھر ہو جائے میاں .... تو پھر سگریٹ کیوں پیتے ہو؟ گناہ بے لذت! اور پھر قینچی بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔۔ میں تو پاسنگ شو پیتا ہوں، کھینی پھانکتا ہوں۔ حقہ اڑاتا ہوں۔ سارے شوق پورے کرتا ہوں۔ سارے تہوار مناتا ہوں!"

جاوید مسکرایا: "دیکھئے نا ہر آدمی کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے تھانیدار صاحب!"

"اوہو ہو .... تم تو پنڈت کی طرح بات کرتے ہو۔ میں تو بھائی راجپوت ہوں، کھاؤ، پیو، موج اڑاؤ ..... زندگی یوں گزرتی ہے چٹکیوں میں۔ ایک بات بتاؤں؟" اس کی آواز پھر رازدارانہ ہو گئی اور آنکھوں میں ایک خباثت بھری چمک پیدا ہو گئی "تمہیں عورت کا شوق ہے؟ بڑا زرخیز علاقہ ہے۔ بڑی جاندار ہوتی ہیں جنگلی عورتیں۔ روزہ تو خیر تم کب کا توڑ چکے ہو گے۔ مگر سحری یہاں کھا لو!" اس کے منہ سے پھر ٹھرے کا بھبکا آیا۔ اور وہ

جاوید کی آنکھوں اور بھنچے ہوئے ہونٹ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

دونوں چپ تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دو پہلوانوں کی طرح تول رہے تھے۔ ایک بے قراری، خود اعتمادی اور غرور کے ساتھ، دوسرا ناتجربہ کاری کی خاموشی مگر چونکی ہوئی کیفیت کے ساتھ۔

جنگی کھانا لے کر اندر آ گیا۔ تھانیدار فوراً کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کھانا کھاتا جاتا تھا اور ساتھ ہی بایاں ہاتھ پستول کے خول پر پھیرتا جاتا تھا۔ جنگی نے پانی کا گلاس دسترخوان پر رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا "ابے آدمی ہے یا بندر۔ منہ سے بساند چھوٹ رہی ہے کیا؟" تھانیدار نے چیخ کر کہا۔

جنگی وہیں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا "داروغہ جی میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔ میرے مالک نے بھی کبھی مجھ سے اس طرح ابے تبے نہیں کی۔"

کرن سنگھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ جنگی بے ساختہ اچھل کر دور ہٹ گیا اور اپنی اس حرکت پر کھسیاہٹ دور کرنے کے لئے اور بھی سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

"جنگی تم اندر جاؤ۔ تھوڑی دیر میں برتن لے جانا۔" جاوید کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ جنگی چلا گیا تو جاوید نے بڑی آہستگی سے داروغہ سے کہا۔ "داروغہ جی آپ کا غصہ بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ وہ میرا نوکر ہی نہیں سرپرست بھی ہے۔ ابا کی یادگار۔"

داروغہ نے ہنس کر اپنے دانت نکال دیے۔۔۔ "مجھے بھی ایسے نوکر پسند ہیں۔ لیکن تم تو جانتے ہو بھائی تھانیدار اپنے پیشے سے مجبور ہے۔ گالی بکے بنا اس کا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہنٹر اور گالی نہ ہو تو حرامزادے راتوں کی نیندیں حرام کر دیں۔"

کھانے کے بعد کرن سنگھ دیر تک چاندی کی ایک باریک سی پھری سے جو اس کے جینو میں بندھی ہوئی تھی اپنے دانت میں خلال کرتا رہا۔

"لوگ بڑے حرامی ہیں۔ ہوشیار رہنا ڈاکٹر۔ ہوشیار رہو گے تو روپے کی چار اٹھنیاں بھناؤ گے۔۔۔۔ پچھلا ڈاکٹر بیوقوف تھا۔ وہ زیادہ روپیہ بنانے کے چکر میں سرکار کے دشمن کی

جوتیاں بھی چاٹنے لگا تھا۔ گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے!"

"شہر کی طرف بھاگیں نہ بھاگیں مارے تو بہرحال جاتے ہیں۔" جاوید اٹھا اور شب بخیر کہہ کر اندر چلا گیا۔

"عجیب اُلٹی کھوپڑی کا آدمی ہے ... اس سے نباہ کیسے ہو گا۔ یہ آدمی تو سارا مزا کرکرا کر دے گا۔ سرکار نے ٹھیک کہا تھا .... خیر دیکھا جائے گا!" اس نے تکئے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک بار پھر یقین کر لیا کہ پستول اپنی جگہ پر ہے اور آہستہ آہستہ اسے نیند آ گئی۔

جاوید دیر تک اپنے بستر پر کروٹ بدلتا رہا۔ جلد ہی کرن سنگھ کی باتوں کا خیال مٹنے لگا۔ "کہاں آن پھنسا میں:" وہ سمجھ گیا کہ سرکار اور کرن سنگھ جیسے لوگ اسے اطمینان سے اپنا کام نہیں کرنے دیں گے۔ اس نے جو کچھ سیکھا تھا اسکو کام میں لانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بڑا سا وارڈ بنوائے جہاں مریض رہیں۔ بڑے بڑے آپریشن کرنا چاہتا تھا لیکن آلے اور اوزار نہیں تھے۔ یہاں تو ہر شخص اپنے مطلب کی ہانک رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ بھی ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے مل جائے۔ "حرام خور:"

اسے روز کی تصویر کا خیال آ گیا جس کے بارے میں کرن سنگھ نے سگریٹ کا دھواں پھینکتے ہوئے بیہودہ باتیں کی تھیں۔ "سور:"

رفتہ رفتہ آنکھوں کے پپوٹے تھکن اور نیند سے بھاری ہونے لگے لیکن سونے سے پہلے آنکھوں میں ایک نازک سا پیکر اُبھرا۔ جیسے جنگل کے پیچھے سے چاند طلوع ہوتا ہے۔ ایک لڑکی کا نازک مگر بھرا بھرا سا دہکتا ہوا جسم بخار میں پھنک رہا تھا اور اس کی انگلیوں سے لڑکی کے بدن میں گدگدی ہو رہی تھی اور ہر لمس کے ساتھ اسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ریشمیں چیز اس سے گریز کر رہی ہے۔ اُس نے اِس ریشمیں اور گرم چیز کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کی نیند بڑی پُر سکون تھی اور ہونٹوں پر ایک جاگتے ہوئے نشاط کی مدھم سی روشنی تھی۔

وہ رات بھر اسی طرح تکئے کو سینے سے لگائے سوتا رہا۔

9

رئیس عبدالستار مرحوم کے مزار پر چادر چڑھانے کا دن آیا۔ رمضان میں جو زلزلہ آیا تھا اس کی وجہ سے سب کے دل دہلے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے بے چین تھا۔

ہر شخص دوسرے سے اتنا کہتا۔ "دنیا میں پاپ بہت بڑھ گیا ہے۔ جب کشتی پاپ سے بھر جاتی ہے تو ڈوب جاتی ہے!" مولوی مکتب میں بچوں کو پڑھانے کے بجائے لوگوں کی محفل جمائے طوفان نوح کا قصہ سنایا کرتا۔۔۔۔ آخر میں ہر شخص اپنا سر دُھنتا جیسے سر پر سے سانپ اور بچھوؤں کی گٹھری گرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کڑاکے کی سردی میں بھی بہت سے لوگ اب تک خیموں میں سوتے تھے۔ کھلیان اور کھیتوں میں سونے والوں کو دیوار کے نیچے دب کر مرجانے کا خطرہ تو نہیں ستاتا تھا۔ لیکن زلزلے کا کیا بھروسہ۔ زمین دھڑکتی ہے تو تماشا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

یہ انسان کا دل نہیں کہ اندر ہی اندر دھڑک کر خاموش ہو جائے۔

زلزلے نے جگہ جگہ زمین کا دل چیر دیا تھا۔ اور اس میں سے کھولتے ہوئے چشمے ابل پڑے تھے جن سے گندھک کی بو آتی تھی اور لگتا تھا کہ مردے جلائے جا رہے ہیں۔ زندہ آدمی چیختے پکارتے رہ گئے تھے اور بپھری ہوئی بھوکی زمین نے اپنے لقموں کو نگل کر منہ بند کر لیا تھا اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

اب ملبوں اور آہ و کراہ اور آنسوؤں کے سوا زمین پر خدائے قہار و جبار کے اس غیظ و غضب کی اور کوئی نشانی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لوگ اسے دیکھتے، کانوں پر ہاتھ رکھتے اور اپنی پشیمان روح کے سارے آنسو آنکھوں میں کھینچ کر خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑتے تھے۔

مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ یہاں تک کہ سرکار عبدالجبار بھی عشا کی نماز با جماعت ادا کرتا تھا۔

نہ جانے کہاں سے خدا کے برگزیدہ بندے ہر طرف منڈلانے لگے تھے جیسے اچانک آسمان سے فرشتوں کی طرح اتر آئے ہوں۔ لمبے لمبے گیسو، رات بھر جاگی ہوئی آنکھوں کا نشہ، ہونٹوں پر پپڑیاں، روحانی نور کی چمک، تہہ بند باندھے، ہاتھ میں ڈنڈا اور چمٹا۔ ڈنڈے کے مٹھ میں اژدہے کا سر، زبان کی دو شاخیں خوفناک انداز میں لٹکی ہوئی، کلائی میں لوہے کا کڑا، لکڑی کے کھڑاؤں پیروں میں ..... ایک ایسا پہنچا ہوا فقیر گاؤں کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ وہ بار بار مسجد کے سامنے کھڑا ہو کر دربار کی طرف دیکھتا، آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر سینہ پھلاتا اور سرمہ بھری آنکھوں کو بند کر کے چلاتا: "ہو حق! حق ہو!" لوگ ڈر جاتے۔ دور سے اس کی حرکتوں کو دیکھتے اور درود پڑھتے ہوئے دعا کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیتے۔ یہاں تک کہ آس پاس کے ہندو بھی سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے اور ان کے دلوں میں بھگوان کی مورتی جگمگانے لگتی جس سے پھوٹتی ہوئی روشنی خوف کی طرح سیاہ ہوتی اور اس کے اثر سے ان کی ٹانگیں کانپنے لگتیں۔ خدا کے بھیجے ہوئے اس فقیر نے لوگوں کو بتایا کہ اس گاؤں میں بہت گناہ ہوتا ہے۔ اگر اس کا کفارہ ادا نہ کیا گیا تو مسجد کا سب سے اونچا مینار شہید ہو جائے گا اور گاؤں پر ابابیلوں کا حملہ ہوگا، جو پچھم سے یعنی خدا کے گھر سے پورب کی طرف اڑ رہی ہیں، اور جب ابابیلیں گاؤں پر سے گذریں گی تو ان کے پنجوں سے پتھر ٹپکیں گے جو دراصل کالی بلائیں ہوں گی۔ یہ بلائیں ایک ایک گناہگار کے گھر کی زنجیریں ہلائیں گی اور ....

لوگوں کے دلوں کی حرکت بند ہونے لگی۔ لوگ سر شام اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے خاموش سونے لگے۔ سوتے کیا رات بھر جاگتے رہتے اور ہر آہٹ پر چونک جاتے اور منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے کیونکہ اگر بلاؤں کی آہٹ پر ان کو ٹوک دیا جائے یا ان کے پکارنے کے جواب میں کچھ کہہ دیا جائے تو پھر آدمی بلاؤں کے چنگل سے نہیں نکل سکتا۔

یک رات فقیر مسجد کے سائے میں کھلے آسمان کے شامیانے تلے لیٹا، "ہو حق" کے

نعرے لگا رہا تھا۔ اور دوسری طرف دربار کے کتے اس کی آواز پر تن تن کر بھونک رہے تھے کہ رئیس عبدالجبار خاموشی سے اس کے پاس آیا۔ اس کے ملازم نے ایک قیمتی کمبل، قیمتی کپڑے اور قمیص کی جیب میں دس دس روپے کے دس نوٹ رکھ کر فقیر کے قدموں پر ڈال دیئے۔ عبدالجبار نے سجدے میں گر کر فقیر کی کھڑاؤں کو چوما اور ملازم نے سرکار کے قدم چومے اور پھر دونوں آہستہ آہستہ اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں مسجد کی دیوار کے اندھیرے سے ایک سایہ اٹھا اور سامان سے لدے ہوئے خچر کی طرح چلتا ہوا باغ میں کھو گیا ..... "ہو حق" کا نعرہ بھی سو گیا اور کتے بھی۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ فقیر غائب ہے اور اس کے کھڑاؤں رکھے ہیں۔ انھوں نے گھبرا کر مسجد کے میناروں کو دیکھا سب سے اونچا مینار ایک بلند قامت حسینہ کی طرح سیدھا کھڑا تھا اور اس کا سنہری کلس سورج کی تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔ لوگوں کے سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی نمی دوڑ گئی اور اب انھوں نے آسمان میں اڑتی ہوئی ابابیلوں کو دیکھنے کے لیے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گھورنا بند کر دیا۔ ایک بار گہرے نیلے آسمان کی پرسکون وسعتوں کو دیکھا اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ رفتہ رفتہ بلاؤں کا ڈر، فقیر کی دھمکی، زلزلے کے بارے میں خوفناک پیش گوئی اور گناہ سے بچنے کی بے چینی پر روز مرہ کی فکریں بھوک اور پریشانی گرد کی موٹی تہہ کی طرح جمتی چلی گئیں اور زندگی اپنے پرانے دھرے پر آگئی۔

اور اب عبدالجبار مرحوم کے مزار پر چادر چڑھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ قبرستان کے پاس والی کھلی ہوئی زمین پر ایک بڑا سا شامیانہ تن گیا تھا۔ ایک خدا رسیدہ بزرگ کے مزار پر عرس تھا اور وہ بھی زلزلے کے بعد۔ شامیانے کا پچھلا حصہ قناتوں سے گھیر دیا گیا تھا جو سرکاری باغ سے ملا ہوا تھا۔ یہ باغ پردے دار عورتوں کا تھا، گاؤں کی عورتیں، لڑکیاں، بیاہے اور کنوارے پاک اور گنہگار جسم مچلتے ہوئے، عطر کی خوشبو اڑاتے ہوئے، پان کی پیک میں پگھلتی ہوئی ہنسی کو اندر ہی اندر پیتے ہوئے، اس باغ سے گذرتے تھے اور شامیانے میں پہنچ جاتے تھے ..... عرس کیا تھا ایک تہوار تھا۔

سورج ڈھل چکا تھا۔ کھیتوں میں جھینگر جھنجھنا رہے تھے۔ درختوں کے پتے سرسرا رہے تھے اور کوے شور مچا رہے تھے۔ شامیانے کے بائیں طرف بڑے خیمے کے سامنے باورچی بڑی بڑی دیگوں میں کفگیر ہلا رہے تھے۔ ان کے چہرے آگ کی تپش سے تمتمائے ہوئے تھے اور ان کی بیویوں کی آنکھیں پیاز کی جلن سے ڈبڈبا گئی تھیں اور ان کی چوڑیاں بج رہی تھیں۔ گوشت کی دیگ سے ایک ایسی خوشبو اڑ رہی تھی جو صرف شادی کی ہنڈیا کے مسالے میں ہوتی ہے۔

رات کا بسیرا ہوتے ہی قوالوں نے سفید چاندنی پر اپنا حلقہ جما لیا۔ گاؤں کے چھوکرے ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے ہوئے اور ماں بہن کی گالیاں بکتے ہوئے قوالوں سے زیادہ سے زیادہ قریب گھیرا ڈالنے کی کوشش میں سرکتے رہے۔ قناتوں کے پیچھے عورتوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں تیز ہونے لگیں۔ دودھ پیتے بچوں نے موقع کی نزاکت کی پروا کئے بغیر اعوں اعوں کے نعرے کے ساتھ دودھ کے لئے رونا شروع کر دیا۔ لیکن جلدی ہی منہ مانگی مراد سے ان کا منہ بھر دیا گیا۔ دربار کے لوگ آنا شروع ہوئے۔ اور مسندوں کے پاس بیٹھنے لگے۔ جہاں مراد آبادی اگالدان اور پان کے طشت چمک رہے تھے۔

سرکار عبدالجبار کے آتے ہی محفل پر سناٹا چھا گیا۔ اس نے مشکل سے گردن گھمائی اور شامیانے کے آخر تک لوگوں کو بیٹھا دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے بائیں طرف مولوی، ماسٹر شاہ عالم، ڈاک بابو نریش، کمپونڈر درگا پرشاد، ڈاکٹر جاوید اور تھانیدار کرن سنگھ بیٹھے تھے۔

"دیکھا ڈاکٹر کتنی شاندار محفل جمتی ہے ہر سال۔ امسال زیادہ زور ہے۔ دراصل زلزلے ...."

داروغہ کرن سنگھ نے اتنا ہی کہا تھا کہ قوالوں کی منڈلی میں طبلے کی تھاپ نے سب کو چونکا دیا۔

"ہم مزار محمد پہ مر جائیں گے ..."

موٹا قوال پان کی گلوریوں کو ایک طرف گال میں دباتے ہوئے گلا پھاڑ کر الاپنے لگا۔

اس کے ساتھیوں نے تالیاں بجائیں اور ہارمونیم کی آواز قبرستان کے پاس کھیتوں اور درختوں میں گونجتی چلی گئی۔

قوالوں کے سامنے ریزگاریاں اور روپے برسنے لگے۔ آخر میں رئیس عبدالجبار نے دس کا ایک نوٹ پھینکا جس پر جارج پنجم کی تصویر تھی۔ موٹے قوال نے جھک کر سلام کیا اور نوٹ اٹھا کر جارج پنجم کے تاج کو چوم لیا جس پر پان کی ایک بھدی لالی ابھر آئی۔

اب لوگوں پر وجد کا عالم طاری ہونے لگا۔

"ہو" ایک کرب ناک اور دلگیر چیخ نے قوالوں کی لے میں نئی آگ پیدا کر دی۔

مولوی اٹھ کر تھرکنے لگا۔ اس کی داڑھی اسکے سینے پر تھرک رہی تھی، عمامہ شامیانے کی چھت کی طرف اڑتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاتھ کبھی آسمان کی طرف اٹھتے کبھی سینے پر آگرتے .... ہو حق، ہو حق، ہو حق!

قوالوں نے جھوم جھوم کر رٹ لگانا شروع کی۔ "کالی کملی والے تم پر لاکھوں سلام .... تم پر لاکھوں سلام"

دیہاتیوں کا مجمع دم بخود تھا۔ گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے، دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ یہ آگ جیسے قوالوں کی لٹکتی ہوئی آہ واہ سے پھوٹ رہی تھی اور لوگوں کے دلوں کو گرماتی ہوئی پھر مولوی کے "ہو حق" سے ٹکرا رہی تھی۔ رقص بسمل کی تڑپ بڑھ گئی۔ "تم پر لاکھوں سلام ......" کے ٹکڑے میں جو معرفت کی بات تھی اس کی نزاکت سے مولوی کا دل خوب آشنا تھا۔ ہر سال چاہے کوئی قوال ہو، چاہے کوئی لے ہو، چاہے کوئی نعت، اس کو حال ضرور آتا تھا اور پھر محفل کا سارا رنگ اس کے قبضے میں آجاتا تھا.....

وہ چاہتا تو محفل چونک کر کھڑی ہو جاتی، وہ چاہتا تو لوگوں کے منہ سے بے ساختہ ہائے نکل جاتی، وہ چاہتا تو قوال گھنٹہ بھر ایک ہی مصرع الاپتا رہتا..... سال میں یہی ایک رات ایسی آتی تھی جب مولوی بادشاہ بن جاتا تھا۔ بہتوں نے کوشش کی کہ اس کے اس اعزاز میں حصہ بٹائیں لیکن ان کو شرمندگی اٹھانی پڑی۔

لوگ اٹھ اٹھ کر دوسرے کونے میں اس لیے دسترخوان کو دیکھنے لگے جس پر بڑے بڑے پیالوں سے گرم گرم خوشبودار بھاپ اڑ رہی تھی۔ بہتوں نے منہ چھپا کر منہ میں بھرے ہوئے پانی سے گلے کی خشکی تر کرلی۔

اچانک ایک عجیب ہنگامہ ہوا۔ ایک کونے سے جنگلی اچھلا اور گری کے بونڈر کی طرح لوگوں کے سر پر سے چکراتا، ناچتا اور، ٹھمکتا ہوا، بڑی ادا سے اس سفید چاندنی پر آگیا جہاں مولوی اب ذبح کئے ہوئے مرغے کی طرح پر پھڑپھڑا کر دم توڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور وہ "ہو حق" کے بجائے اب صرف "ہائے ہائے" کا وظیفہ کررہا تھا۔ طبلے پر زور دار تھاپ پڑی اور قوال کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔ جنگلی جا کر مولوی سے لپٹ گیا اور وہ بھی "ہو حق" کے نعرے لگانے لگا۔ اب دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ناچ رہے تھے۔ مولوی کے پیروں کی گردش تیز ہوگئی۔ جنگلی نے اپنا سر مولوی کے سر پر مارنا شروع کیا۔ اس کی دوپلی ٹوپی اڑی اور سرکار کے قدموں پر جاگری۔

"یہ کون ہے؟" سرکار نے آنکھوں میں تعجب بھر کر پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب کا نوکر ہے!" کرن سنگھ نے کہا۔

"اچھا" سرکار کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

جاوید مسکرایا اور کنکھیوں سے سرکار کو دیکھ کر پھر اس پُر لطف ناچ کے بڑھتے ہوئے جوش کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بھئی آپ کا ملازم تو بڑا پہنچا ہوا ولی نکلا!" ڈاک بابو نے بڑی معنی خیز ہنسی کو دباتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

جاوید نے جواب میں ڈاک بابو کو نہیں دیکھا۔ صرف آہستہ سے بولا "حال قال آنے کے لئے مولوی ہونا ضروری نہیں۔ اللہ رسول کی بات ہے۔ جس کے دل کو لگ گئی، لگ گئی!"

جنگلی کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا، وہ زور سے منہ کھولتا اور بند کرلیتا۔ مولوی نے ناچتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن جنگلی چمٹا رہا۔ لوگوں نے دیکھا کہ

مولوی کے چہرے سے وحشت برس رہی ہے اور وہ کانپ رہا ہے۔ منہ کھولنے اور بند کرنے میں جنگلی نے کئی بار مولوی کی نورانی داڑھی کے بال دانتوں میں دبا لیے اور اس کی بیخودی کی آنچ ٹھنڈی پڑنے لگی۔ شعلے کا رقص اور تیز ہوگیا اور بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے۔ دو تین اور سفید چاندنی پر اچھلنے لگے۔ انھوں نے اپنے کمبلوں کو ہوا میں دوپٹے کی طرح لہرانا شروع کر دیا۔ "ہو حق" کی آواز میں ایک تباہ کن وحشیانہ وجدان پیدا ہوگیا۔ ایک نے تو وجد کے عالم میں بنوٹ کے ہاتھ بڑھ بڑھ کے دکھانا شروع کیے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولوی تو ایک دلدوز چیخ مار کر چت لیٹ گیا اور باقی دیوانے جنگلی کی رہنمائی میں ناچتے رہے۔ آخر کار سرکار نے قوال کو اشارہ کیا۔ ہارمونیم کا نغمہ تھم گیا اور وجد میں آئے ہوئے خدا رسیدہ لوگوں کو قرار آگیا۔

"کالی کملی والے تم پر لاکھوں سلام"

مولوی اتنا بے دم ہوگیا تھا کہ وہ دسترخوان پر سب سے آخر میں پہنچا اور فرنی کی دو طشتریوں پر قبضہ نہ کرسکا۔ قورمے، باسمتی چاول کے پلاؤ، اور مٹی کی طشتریوں میں جمی فرنی کی خوشبو نے آخر مسیحائی کی اور وہ اپنی کمر کے درد اور داڑھی سے ڈھکی ہوئی ٹھوڑی کی جلن کو بھول گیا اور کھانے کا فرض عبادت کی طرح خشوع و خضوع سے ادا کرنے لگا۔

کھانے کے بعد قوالوں نے پھر چیخنا شروع کیا۔ طبلے کی گمک سنائی دی اور بڑی دھوم دھام سے رئیس عبدالستار کے مزار پر چادر چڑھائی گئی۔ پھولوں، آنسوؤں اور دعاؤں کی بارش ہوئی۔

مرد قوالوں کے گرد حلقہ باندھ کر شامیانے میں بیٹھ گئے۔ صرف عورتیں مزار پر رہ گئیں۔ سرکار نے فٹن میں جاوید اور کرن سنگھ کو اپنے ساتھ بٹھایا اور پہیے ایک بار چرچرائے اور گھوڑا دوڑنے لگا۔ بند سرکاری باغ میں بھی قدموں کی چاپ ابھرنے لگی۔ سائے سرکنے لگے اور چوڑیاں بجنے لگیں۔ عرس اپنے شباب پر تھا۔

دربار میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سڑک پر ایک چمکتی ہوئی کار کھڑی تھی۔

"اوہ۔۔۔ ایس ڈی او صاحب آگئے!" سرکار کی زبان سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔

آگے آگے سرکار اور پیچھے پیچھے کرن سنگھ اور جاوید زینہ چڑھ کر اس کمرے میں پہنچے جہاں جاوید اور عبدالجبار کی پہلی ملاقات ہوئی تھی:

ایک آرام کرسی کے سامنے جس کا رُخ الٹی طرف تھا دو سیاہ جوتے تپائی پر رکھے ہل رہے تھے۔ لوکس کی میم سگریٹ پی رہی تھی اور ایک گلدان کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

لوکس کا تعارف جاوید سے ہوا اور جاوید نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ اس کی میم میں جتنی نرمی اور دلربائی ہے اس کے شوہر میں اتنی ہی سختی اور کھردرا پن ہے۔ یہودیوں جیسی اونچی ناک ایک دیوار کی طرح اس کی آنکھوں کے درمیان ابھری ہوئی تھی اور باریک ہونٹوں تک جا کر گویا سجدے میں چلی گئی تھی۔ میم نے باری باری سے سب سے ہاتھ ملا کر مزاج پوچھا لیکن لوکس نے ہاتھ ملا کر دوبارہ جاوید یا اور کسی کی طرف نہیں دیکھا اور سخت لہجے میں انگریزی میں پوچھا۔

"ہندوستانیوں کو وقت کی پابندی کب آئیگی مسٹر عبدالجبار؟"

"حضور آپ کو کیا بتائیں .... جب مزار پر چادر چڑھتی ہے تو قوالی ہوتی ہے اور جب قوالی ہوتی ہے تو کچھ نیک بندوں کو حال آتا ہے اور جب حال آتا ہے تو وقت .... میرا مطلب ہے ...."

"سمجھا" لوکس نے مسکرا کر کنکھیوں سے ڈاکٹر جاوید کی طرف دیکھا جو اچکن کے بٹن کھول کر اب رئیس عبدالستار کی پرنور تصویر کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تمہیں مصوری کا شوق ہے ڈاکٹر؟"

جاوید چونک گیا "کوئی خاص شوق نہیں ہے"

"اچھا بتاؤ اس تصویر میں مصور نے کیا غلطی کی ہے؟"

"میں نے کبھی رئیس عبدالستار مرحوم کو نہیں دیکھا اس لئے ......"

"لیکن میں تو تصویر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

جاوید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لوکس نے پھر کہا: کتنے دنوں کا تجربہ ہے کام کا۔ یہ تمہارا پہلا ہسپتال تو نہیں ہے؟"

"پہلا ہی ہے۔"

"شکار کا شوق تو ہوگا۔ میں تو شکار پر جان دیتی ہوں۔ تمہارے علاقے کے جنگلوں میں شکار ہی شکار ہے۔" لوکس کی میم بولی۔

"شکار کا شوق ہے۔ لیکن فرصت کہاں ملتی ہے؟" جاوید نے میم سے کہا۔

"فرصت؟ ڈارلنگ شکار کا پروگرام بناؤ ایک دن۔ بہت دن ہوگئے۔ تمہارے سب ڈویژن میں اتنی بوریت ہوتی ہے۔ تم تو ٹینس کے دو ہاتھ کھیل لیتے ہو اور سمجھتے ہو سارا اسپورٹس ختم ہوگیا۔"

"او گاڈ۔" لوکس نے جیسے دانت پیس کر اپنے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ضرور پروگرام بناؤ۔ میں تو اس علاقے کے جنگلیوں کے چکر میں ایسا پڑا ہوں کہ مہذب آدمی کی زندگی ہی بھول گیا۔" اس نے بڑے شاعرانہ انداز میں ہونٹ لٹکائے "مجھے اپنا لندن بہت یاد آتا ہے۔"

جاوید نے سوچا سارے انگریز اسی طرح رنگ جماتے ہیں۔ خواہ لندن میں ان کی زندگی کسی میوزیم کے زینے پر جھاڑو دیتے ہی کیوں نہ گذری ہو ...... "یوں دیکھتا ہے ہر چیز کو حقارت سے جیسے سیدھا جارج ششم کے محل سے آرہا ہو۔" جاوید کو کلکتے کی زندگی میں انگریز پرنسپل اور طالب علموں کا جھگڑا یاد آگیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہر بھری مسکراہٹ ابھری۔ لوکس کی میم اسے بڑی پیاسی نظروں سے گھور رہی تھی۔ جاوید نے اس کی چبھتی ہوئی نظروں کو محسوس کیا اور گردن موڑ کر کرن سنگھ پر نظریں جمادیں۔ جو لوکس کی ہر اچٹتی نظر پر "اٹینشن" ہوجاتا تھا۔

"سر! میرا خیال ہے پندرہ بیس دن کے بعد اگلی چاندنی میں شکار کا پروگرام بنائیں۔ میں سارا انتظام کردوں گا۔ اور اب کے شیر ضرور ہاتھ آئے گا ...." سرکار عبدالجبار نے اپنے سینے پر گوشت کی چٹانوں کو اور بھی بلند کرتے ہوئے کہا۔ جیسے آن واحد میں چنگھاڑتے ہوئے شیر کو ایک گھونسے میں اجل کی نیند سلادے گا۔

"جی ہاں میم صاحب کا شوق اب کے ضرور پورا ہوگا۔" کرن سنگھ نے لقمہ دیا۔

لوکس کی میم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اف مجھے شیر کا شکار کرنے کا کتنا شوق ہے!"
بات صرف اتنی تھی کہ وہ اپنے پیشرو "صاحبوں" کی میموں کی طرح کسی دوسرے کے مارے ہوئے شیر پر اپنے پیٹنٹ کے جوتے اور بریجیز میں تصویر کھنچوا کر لندن کے کسی گھٹیا اخبار میں چھپوانا چاہتی تھی۔ چھ مہینے ہو رہے تھے لیکن اس کے علاقے کے کئی زمینداروں کی کوشش کے باوجود شیر تو شیر کوئی ریچھ بھی ہاتھ نہیں لگا تھا۔

جاوید نے بھی کبھی شیر کا تماشہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اندر بھی جانبازی اور بہادری کی سوئی ہوئی خواہش جاگ اٹھی اور وہ لپک کر ہاں میں ہاں ملانے سے خود کو بڑی مشکل سے روک سکا۔

"ٹھیک ہے" لوکس نے کرسی کے دستے پر ہاتھ مار کر پائپ سلگایا۔

کھانے کے دوران لوکس کی میم ڈاکٹر کے پہلو میں بیٹھی اور شرمائے اور گھبرائے ہوئے کرن سنگھ کو دیکھتی رہی جس کی نظریں پلیٹ پر جھکی ہوئی تھیں اور ٹانگیں ہل رہی تھیں۔

"ہندوستانی تھانیدار اتنے شرمیلے اور گھبرائے گھبرائے سے کیوں نظر آتے ہیں؟" لوکس کی میم نے جاوید کے کان سے اپنے منہ کو اتنا قریب کر دیا کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی بلی اس کا منہ چاٹنے کے لئے بڑھ رہی ہے۔

"مادام یہی وہ شرمیلے تھانیدار ہیں جن کو تاج برطانیہ کی شان کہنا چاہیے۔ قلعہ کی پہلی اینٹ........."

میم کی سمجھ میں جاوید کی بات نہیں آئی اور اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ "نو!"
لوکس نے انہیں آہستہ آہستہ باتیں کرتے دیکھا اور کھانس کر اپنی میم کی طرف دیکھنے لگا۔ میم نے اسے نظرانداز کر دیا اور جاوید سے پوچھنے لگی۔ "تم کو کلکتہ زیادہ پسند ہے یا یہ پچھڑا ہوا گاؤں؟"

"مجھے کلکتہ بھی پسند ہے اور یہ گاؤں بھی۔ اپنی چیزیں کسے پسند نہیں ہوتیں" جاوید نے اپنی پلیٹ میں پلاؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ لیکن پلاؤ سے کہیں زیادہ تیز خوشبو میم کے جسم اور کپڑوں سے آرہی تھی۔

"کرن سنگھ، اچھا ہوا تم مل گئے۔ تمھارے تھانے کے علاقے میں بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اس طرح کیسے کام چلے گا؟"

کرن سنگھ کے منہ میں مرغی کا گوشت تھا، وہ ہڈی سمیت اسے نگل گیا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "سر کچھ لوگ بدمعاشی پر تلے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے سن لیا ہے کہ نئے صاحب بہت نرم ہیں اور مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہیں ...."

"وہ میں سمجھتا ہوں" لوکس نے کانٹا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمھارے خلاف آئے دن شکایت کے خط آتے رہتے ہیں ......"

"جی ہاں، جب میں بدمعاشی ختم کرنے کے لئے کچھ کرتا ہوں تو میری شکایت اوپر بھیج دی جاتی ہے۔ اور سیدھی انگلی سے گھی نکلتا نہیں ...."

"تم ایک تجربہ کار تھانیدار ہو۔ جاتے ہوئے مسٹر ڈوگلس نے تمھاری تعریف کی تھی۔ میں اپنے علاقہ میں بدامنی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں کتنا نرم ہوں اس کا اندازہ بہت جلد ہو جائے گا بدمعاشوں کو۔" اس نے، کانٹے سے مرغی کی ران کچھ یوں اٹھائی جیسے نیزے پر دشمن کی لاش۔

"سر، ان بدمعاشوں کا سرغنہ پرمیشر سنگھ ہے۔"

"یہ پرمیشر سنگھ کل ہی چیرمین کی سفارش کا خط لے کر مجھ سے ملا تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔"

جاوید کو عبدالجبار کی انگریزی میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ وہ اکثر فعل کے بغیر ہی اپنا مدعا ادا کر رہا تھا۔

جب کبھی وہ کوئی ہمالیہ پیما قسم کی غلطی کرتا تو لوکس کی میم ہنسی چھپانے کی خاطر رومال منہ پر رکھ لیتی اور بڑی ادا سے جاوید کے گھٹنے سے گھٹنا ٹکرا دیتی۔

کھانے کے بعد وہسکی کے حسین گلاس چھلکنے لگے۔ جاوید نے صاف انکار کر دیا۔ کرن سنگھ نے بھی نہیں پی۔ صرف لوکس، میم اور عبدالجبار نے شغل جاری رکھا۔ تھوڑی دیر میں تکلف،

رعب اور گھٹن کے بادل چھٹنے لگے۔ جیسے روپے دیکھ کر کوئی فاحشہ لباس سرکانے لگے۔

"سر، آپ کے رہتے رہتے اگر اس علاقے میں ترقی ہو جائے تو آپ کا بڑا نام ہو گا اور ہم آپ کو ہمیشہ یاد کریں گے۔ یہ بڑا ہی وحشی علاقہ تھا، جو کچھ ہوا ہے "صاحبوں" کا فیض ہے .... اگر آپ یہ آخری کام پورا کر دیں تو ...."

"یس اِٹ اِز ٹرو، مسٹر جبار، یو آر وَنڈر فول!" لوکس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

میم نے نفرت سے اسے دیکھا اور جاوید کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی: "ڈاکٹر تم بھی ہمارے ساتھ شکار میں چلو گے نا .... آئی لو ایڈونچر ...."

"ضرور چلوں گا!" ڈاکٹر نے مختصراً کہا۔ اُسے بڑی اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے اجازت لی اور چلا گیا۔ "گڈ نائٹ ڈاکٹر!" میم کی آواز گونجی۔ لوکس اور عبدالجبار دونوں نے کرخت نظروں سے کرن سنگھ کو گھورا اور اس پر بجلی گر گئی... اس نے اچھل کر سلامی داغی اور وہاں سے نکل گیا۔ میم کی ہنسی کی آواز نے جاوید کو زینے پر جا لیا اور ساتھ ہی کرن سنگھ نے بھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اسنے جاوید کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "یار یہ صاحب بڑا کائیاں ہے۔ مجال ہے جو مسکرا دے اور اس کی میم .... ذرا ہوشیار رہنا۔ ڈس نہ لے۔ چیرمین نے زوروں کا چلا ہوا ہے سالی کا!"

کرن سنگھ اچھل کر گھوڑے پر بیٹھا اور باغ کے پاس والے راستے پر ڈُلکی چال سے گھوڑے کو بھگانے لگا۔ "ڈاکٹر کل پرسوں آجاؤ میرے تھانے پر۔ "تمہاری قسم!" میری بیوی رساول خوب پکاتی ہے!"

جاوید امام باڑے اور مکتب کے پاس بڑے بڑے برگدوں کے سائے تلے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہسپتال کی طرف جا رہا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ قبرستان کی طرف سے اکا دکا لوگ کمبلوں اور رضائیوں میں لپیٹے لپٹائے چلے آ رہے تھے۔ شامیانے میں اب تک ہنڈے جل رہے تھے اور طبلے کی تھاپ فضا میں گونج رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ گونج ایک کراہ کی طرح سُنائی دیتی۔

لوکس عبدالجبار کی بکواس سے بور ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ہوا میں لہرایا اور کھڑا ہو گیا۔

اس کی میم بھی کھڑی ہو گئی۔ عبدالجبار نے لوکس کی میم سے ہاتھ ملایا "اوہ! تمہارا ہاتھ ہے یا سلکن دستانہ!" لوکس نے کار کا دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے اسٹارٹر دبایا اور اس کی کرخت آواز سنائی دی "میں شکر مل کے بارے میں سوچوں گا!" گرد کی آندھی اٹھی اور عبدالجبار ناک پر رومال رکھتے ہوئے جو وہاں سے بھاگا تو پھر اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔

اس نے ایک جام بھرا اور فرانسیسی کارڈ نکال کر دیکھنے لگا۔

مکتب کے کمرے میں مولوی نے زور کی ڈکار لی اور نیند بھری آواز میں ماسٹر شاہ عالم سے کہا "ابھی اور زلزلے آئیں گے .... گناہ کا دریا چڑھ رہا ہے۔ ...." اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اس کے رخساروں پر چیونٹیاں دوڑ گئیں۔

شاہ عالم نے اس خوفناک بات کا جواب ایک خوفناک خراٹے سے دیا۔

10

آخر مارچ کی گلابی سردی کی خوشگوار خنکی، ڈوبتے سورج کی ترچھی شعاعوں کے تھرتھراتے پروں پر تیرتی ہوئی، درختوں اور پودوں سے کھیلتی ہوئی آہستہ آہستہ سر سرا رہی تھی۔ جاوید لمبی گھاس پر خراماں خراماں ٹہل رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک لمبا کش لیتا اور خنک ہوا میں پگھلتے ہوئے دھوئیں کو آہستہ آہستہ غائب ہوتے دیکھتا۔ دھان کی سنہری فصل کٹ چکی تھی اور دور کسان، کھلیانوں میں دھان، اور پیال کو پونج بناتے ہوئے نظر

آرہے تھے۔ عورتیں نیچے سے پیال اور دھان کی گانٹھ اٹھاتی تھیں، اور ہوا میں اچھال دیتی تھیں اور اوپر مردان کو ہوا میں ہی لپک کر تھام لیتے اور گانٹھوں کو تیزی سے سجادیتے۔ جاوید کے دیکھتے دیکھتے پونج اونچے ہوتے جارہے تھے اوران کے اوپر کا سرا چینی کسانوں کے تنکے والی ٹوپیوں کی طرح تنگ ہوکر چوٹی کی طرح ابھرتا جارہا تھا۔ کھیتوں میں فصل کٹنے کے بعد جو چھوٹی چھوٹی چبھنے والی کھونٹیاں رہ گئی تھیں۔ وہ بھی تیزی سے غائب ہوتی ہوئی سورج کی کرنوں میں، اب دھندلی پڑنے لگی تھیں۔ ریوڑوں کو گاؤں کی طرف ہانکتے ہوئے گاؤں کے کالے کالے چھوکرے لنگوٹی باندھے زور زور سے گارہے تھے اور ساتھ ہی مویشیوں کو ماں بہن کی کراری گالیاں بھی دیتے جارہے تھے۔

جاوید کے چہرے سے نرمی اور بچپن چھن گیا تھا اس کی آنکھوں میں ایک آزردہ اور بےچین فکرمندی کا رنگ تھا۔ وہ بار بار اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر گویا کچھ بھولنے کی، اپنے سر کو جھٹک کر کسی خیال سے بھاگنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے گال ذرا پچک گئے تھے اور چہرا لمبوترا ہوگیا تھا لیکن بھویں پہلے سے بھی زیادہ گھنی ہوگئی تھیں اور بال زیادہ لمبے خشک اور گھونگھریالے ...... اس نے دانت پیس کر اپنے آپ سے کہا: "یہ راستہ خودکشی کا ہے۔ کیا میں اس کمزوری کو شکست نہیں دے سکتا۔ کیا میں ....؟"

اسے کندھے پر ایک دوستانہ دباؤ محسوس ہوا۔

"رگھوناتھ!" جاوید اپنے دوست سے لپٹ گیا۔

رگھوناتھ دبلا پتلا نوجوان تھا مگر اپنے چہرے کی سختی اور خشکی سے زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں زیادہ بڑی نہ تھیں لیکن ان میں بلا کی تیزی اور بے قراری تھی۔ اس کے بال چھوٹے چھوٹے تھے اس نے اپنے پتلے سے ہاتھ میں ڈاکٹر کا ہاتھ لے کر پوچھا: "کہو کیسے ہو۔ اتنا قریب رہ کر اتنی جلدی بھول گئے۔ بڑے ظالم ہو!" اس نے اپنی تیز آنکھیں جاوید کے چہرے پر جمادیں جیسے کچھ پڑھنے کی جد و جہد کررہا ہو۔ دم توڑتی ہوئی زرد روشنی میں اسے دوست کی آنکھوں میں ایک جھلملاہٹ نظر آئی اور اس نے جاوید کے ہاتھ کو اور بھی زور سے دبایا "جاوید! خیریت تو ہے کیسے ہو تم؟"

رگھوناتھ نے اس کا بازو دبایا اور اسے لے کر پگڈنڈیوں کی طرف بڑھا۔ دونوں نے گاؤں کا چکر کاٹ کر چھوٹی چٹانوں پر چلنا شروع کر دیا۔ آخر وہ پہاڑی کی اس چٹان پر پہنچ گئے جہاں سے سارا گاؤں سویا ہوا نظر آرہا تھا۔ جھاڑیوں، بیر اور بیل کے پیڑوں سے بھرے ہوئے جنگل میں ببول کے ناٹے ناٹے پیڑوں کی بھرمار تھی۔ یہ جنگل بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں کی دیوار سے شروع ہو کر حویلی کے کھپریل کے چھپروں تک، اور ان آڑی آڑی، دور سے جھانکتی ہوئی پہاڑیوں تک چلا گیا تھا جن کے بیچ سے یہاں وہاں آسمان نظر آرہا تھا۔ لکڑہارے گدھوں پر لکڑیاں لادے جنگل سے نکل رہے تھے۔ انھوں نے غور سے ان دونوں کو دیکھا، جھک کر سلام کیا اور گاؤں کی طرف بڑھ گئے جہاں دربار کے آگے مسجد کے میناروں کو شکری ندی ایک سانپ کی طرح اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اچانک درختوں میں چڑیوں نے پھدکنا اور سیٹیاں بجانا بھی بند کر دیا۔ ندی میں روشنی کی ایک سرخ پھلجھڑی جلی اور بجھ گئی۔ پہاڑوں کا سرمئی رنگ سیاہی میں بدلنے لگا اور ایک آسیبی آنچل پہاڑوں سے لے کر دربار کی دیواروں تک پھیل گیا۔۔۔۔ وہ دونوں خاموش تھے۔

"چپ کیوں ہو رگھوناتھ؟ معاف کرنا تم سے ملنے نہ آسکا؟ بھابی کیسی ہیں؟"

"اچھی ہیں، تمھیں سلام کہا ہے۔ تم کیسے ہو میرے یار۔ کیا کسی ڈرامے کے ہیرو کا پارٹ یاد کر رہے ہو؟" وہ بڑی سادگی سے ہنسا۔

"تم میری حماقتوں کو اب تک نہیں بھولے رگھو؟ یار اب نہ وہ ڈرامے ہیں نہ زندگی کے خواب۔ میں تو دلدل میں پھنس گیا ہوں۔"

رگھوناتھ نے ہنس کر اس کے سینے پر ہاتھ مارا، "میاں ابھی تو ابتدائے عشق ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ میں نے کہا تھا عبدالجبار ناک میں دم کر دے گا۔۔۔۔ تمھارے جیسے موم کی ناک کا یہاں کہاں گزر۔۔۔۔"

"دیکھ لینا وہ بھی مجھے یاد کرے گا۔ لیکن مصیبت یہیں ختم ہو جاتی تو کوئی بات نہ تھی۔"

"کیوں اور کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ کمخواب کے کھیتوں کی فصل کیسی رہی؟" اس نے بات بدل دی۔

"سُنو جاوید، اس وقت میں تم سے ایک بہت ہی اہم بات کہنے آیا ہوں ... میرا ایک کام کرو گے ؟" اس نے پھر ایک بار اپنے دوست کا ہاتھ دبایا۔ جاوید نے بھی جواباً اس کا ہاتھ دبایا" لیکن کام بڑی ہوشیاری کا ہے۔ میں تم کو پوری بات نہیں بتا سکتا۔ مجھ پر بھروسہ کرو گے؟"

"رگھو، یار مجھ پر پورا بھروسہ کر سکتے ہو۔ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو میں للکتے کی زندگی اور تمہارے احسانوں کو نہیں بھولا ہوں!"

" چھوڑو یار ......دیکھو بات یہ ہے کہ آج تمہارے پاس رات گئے میرا ایک دوست آئے گا۔ وہ بہت بیمار ہے ... چند دن سے میرے گھر میں تھا۔ لیکن اب ایک دن بھی وہاں نہیں رہ سکتا۔ پولیس اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ تم اس کو اپنے یہاں رکھ کر ....اس کا علاج نہیں کرو گے ؟ چند دن کے بعد اس کا انتظام ہو جائے گا۔ بس چند دن کی بات ہے ..... سب کچھ راز ہے!" رگھوناتھ نے بے چینی سے کہا۔

"رات کو میں تمہارے دوست کا انتظار کروں گا" ڈاکٹر نے بہت بھاری آواز میں کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ دونوں کو اپنی گفتگو کی گونج سنائی دی۔ شاید درختوں میں سرسراتی ہوئی کچھ اجنبی آوازیں بھی سُنائی دیں۔ دونوں خود بخود وہاں سے لوٹ گئے۔ رگھوناتھ جنگل کے کنارے کنارے غائب ہو گیا اور جاوید واپس اپنے ہسپتال کے احاطے میں پہنچ گیا اور پھر گھنٹوں گھنٹوں لمبی گھاس پر ٹہلنے لگا۔ اُس نے سگریٹ سلگائی اور اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ 'رگھوناتھ کا یہ دوست کون ہے ؟ لیکن یہ راز کیوں ہے ؟ کیا قصہ ہے ... خیر مجھے رگھوناتھ پر پورا بھروسہ ہے۔'

جنگی سو رہا تھا۔ بوُا بیماری کے باوجود جائے نماز بچھائے بیٹھی تہجد پڑھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے ہونٹوں کے کھلنے بند ہونے کی آواز گہری خاموشی میں سرگوشی کی طرح اُبھر کر جاوید کو چونکا دیتی۔ وہ دبے پاؤں آنگن میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے آسمان کو دیکھا جو بچے کے

دل کی طرح صاف شفاف تھا اور ستاروں سے بھرا جگمگا رہا تھا۔ دوسری طرف تاڑ کے درخت سر اٹھائے اس کے آنگن میں جھانک کر جیسے کچھ راز معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دروازے کی طرف آہٹ ہوئی۔ جاوید دبے پاؤں ادھر گیا اور آہستہ سے دروازہ کھولا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ جنگی کی بکری کھلی رہ گئی تھی اب چھٹکی ہوئی چاندنی میں ٹہلنے کا لطف اٹھا رہی تھی۔

جاوید نے اندیشے بھرے دل سے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ کسی نے دروازے پر آہستہ آہستہ تین بار دستک دی ..... "رگھوناتھ نے کہا تھا تین بار!"

جاوید نے دروازہ کھول کر دیہاتی کپڑوں میں لپٹے ہوئے ایک آدمی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا ... چپکے سے ..... اجنبی نے سر سے دیہاتی پگڑی اتارتے ہوئے تھکن بھری سانس لی اور بغیر کچھ کہے جاوید کے بستر پر لیٹ گیا۔

معائنہ کے بعد اس کو مریض کی حالت کی طرف سے تشویش ہوئی۔ اس کے چہرے سے اس کمزوری کا اندازہ نہیں ہوتا تھا جو اس کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانسی کا زور کچھ کم ہوا تو اس کے چہرے پر تھکن کے ساتھ ساتھ اطمینان کی جھلک پیدا ہوئی۔

جاوید خود ہسپتال گیا اور دوا تیار کر کے لایا۔ اس کو انجکشن دینے اور دوا پلانے کے بعد کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مریض نے مسکرا کر کہا: "ڈاکٹر تم مجھے سگریٹ نہیں پلاؤ گے؟" اس کی آنکھوں میں ایسی ناقابل تسخیر التجا تھی کہ ڈاکٹر کا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب کے اندر گیا۔ لیکن باہر نہیں نکلا۔

"بھائی میرے کس نام سے یاد کروں آپ کو .... سگریٹ نہ پیجیے۔ یہ زہر تو دوں گا نہیں آپ کو؟"

"نام؟ جس نام سے چاہو!" مریض نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنا منہ لٹکا لیا: "جہاں جاؤ رگھوناتھ جیسے ظالم سے پالا پڑتا ہے!"

"ہاں یہ ظلم تو ہوگا۔ آپ کا نام سلیم ہے اور آپ کلکتے کے میرے پرانے دوست

ہیں۔۔۔۔ سمجھے ؟ آپ کو میرے کپڑے پہننے پڑیں گے ورنہ بوُا کہیں گی پتہ نہیں میں نے کس ہندو کو یہاں قید کر رکھا ہے!" ڈاکٹر جاوید نے مسکرا کر مہمان کا ہاتھ دبایا۔

"سُنو تمہاری بوُا گھبرائیں گی تو نہیں ؟" اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا اور بے تکلف ہو گیا۔

جاوید کو یہ بے تکلفی بھلی لگی۔ "بوُا تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی سلیم!"

دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھ ماری، ہاتھ ملایا اور ہنسنے لگے۔

سلیم نے اپنے تھیلے سے کچھ کتابیں اور کاغذات نکال کر تکیے کے نیچے رکھے اور جاوید کا کرتا پاجامہ پہن کر لیٹ گیا۔ جاوید نے دوسرا انجکشن لگایا۔ مریض کو نیند آگئی اور اس کی سانس کے تلاطم میں کچھ آہنگ سا پیدا ہو گیا۔ جاوید جھکا ہوا اس کی نبض دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں اس اجنبی دوست کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس کی تھکی ہوئی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے "بیچارا!۔۔۔۔۔۔ جانے کون ہے!" جاوید نے ٹھنڈا سانس لیا اور تپائی سے دودھ کا خالی گلاس اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اس رات بڑا طوفان آیا۔ کھڑکیاں زور زور سے کھلنے اور بند ہونے لگی۔ ہزاروں سانڈوں کے دوڑنے اور بھانت بھانت کے جانوروں اور درندوں کے چیخنے کی آواز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی اور ایک ایک چیز کو لرزا دیتی۔ بوُا نے جائے نماز بچھائی اور دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔ مریض کے کمرے کی لالٹین بجھ گئی تھی۔ جاوید نے دوبارہ لالٹین جلائی اور مریض کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اسی طرح بے خبر سو رہا تھا، دوستی اور اعتماد آدمی کو کتنا بے فکر بنا دیتا ہے، جاوید کو محسوس ہوا کہ یہ سارا طوفان اس کے مریض کو ڈھونڈھ رہا ہے۔

آخر طوفان تھم گیا۔۔۔۔ ہوا کی سیٹیاں تھوڑی تھوڑی دیر پر ابھر کر دور کہیں غائب ہونے لگیں اور درختوں کے اکھڑنے اور شاخوں کے ٹوٹنے کی چرچراہٹ بند ہو گئی۔ دعا کے لئے اٹھے ہوئے بوُا کے ہاتھ ان کی گود میں گر گئے اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ تب جاوید آہستہ سے اپنے بستر پر لیٹا اور تھوڑی دیر میں اس کی آنکھیں بند ہو کر کھل گئیں اور شام والی

بے چینی اور غم انگیزی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔
جاوید اچھل کر کھڑا ہو گیا وہ سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اسے فوراً رگھو ناتھ کی امانت کا خیال آیا۔ ۔۔۔ میں اس کو بچانے کے لئے کسی کو بھی گولی مار سکتا ہوں!" اس نے جاکر دروازہ کھولا۔ کرار خاں کے دانت چمک رہے تھے: "سکینہ بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بلایا ہے۔"
تھوڑی دیر میں جاوید قبرستان کی طرح خاموش اور اندھیری حویلی میں تھا، سکینہ زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ اس نے آنکھ نہیں کھولی بے ہوش پڑی رہی۔ جاوید کا گلا خشک ہونے لگا۔ اس نے جلدی جلدی انجکشن تیار کیا۔ اس کا ہاتھ پہلی بار کانپ رہا تھا۔ اس نے سکینہ کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ڈھیلی آستین کو بازو کے اوپر سرکایا اور اس کے نرم اور بے احتجاج گوشت میں سوئی چبھو دی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ سوئی خود اس کے دل میں پیوست ہو رہی ہے۔ وہ اس کی ٹھنڈی انگلیوں سے کھیلتا رہا اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی بھویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں جیسے کسی کی گستاخی پر حیران ہوں۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ تھرتھرائے اور جاوید کو لگا کہ اس کی ٹھنڈی انگلیاں گرم ہو رہی ہیں۔ وہ اور تیزی سے اس کی انگلیوں کو سہلانے لگا۔
سکینہ نے آنکھیں کھول دیں اور بڑی ممنونیت بھری، تھکی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھا اور رونے لگی: "ہائے مجھے موت کیوں نہیں آتی!"
"سکینہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ میری مہینوں کی محنت خاک میں مل جائیگی! تمہاری ایک موذی بیماری ختم ہو چکی ہے اور اب تم نے ایک دوسرا روگ مول لے لیا۔ جلدی سے اچھی ہو جاؤ!"

سکینہ نے سر ہلایا اور مسکرائی۔ اس کا ہاتھ اب تک ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچا اور تکیے پر اتری ہوئی گھٹاؤں جیسے بالوں کے گچھوں پر رکھ لیا۔ بالوں کی سیاہی میں اس کے کمزور ہاتھ کا رنگ اور نکھر گیا۔ جاوید نے بے اختیار اس کا گال تھپتھپایا اور کھڑا ہوا تو خود سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے سہم کر بڑی درد بھری حیرانی سے اس کو دیکھا اور اس کی آوارہ نگاہوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب وہ چلا گیا تو دیر تک وہ

چھت کو گھورتی رہی۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خواب دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی۔ اس کے بیمار چہرے پر رنگ کی چاندنی سی دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔

جاوید دیر تک اپنے بستر پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا یہاں تک کہ اس کی زبان، گلا اور کلیجہ تک پھنکنے لگا۔ اس نے سوچا ایک سگریٹ اور پی لوں پھر سو جاؤں گا۔ آنکھوں میں نیند ریت کی طرح چبھ رہی تھی اور باہر طوفان کے بعد ایک پرسکون فضا چھا گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کھولی اور جھکے جھکے دو تین کش لگائے تھے کہ ہسپتال کے پاس چنبیلی کی کیاری میں ایک سایہ ابھرتا ہوا نظر آیا۔ یہ سایہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے کوارٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سگریٹ جاوید کے ہاتھ سے گر گئی۔

وہ لپکا دوسرے کمرے میں گیا۔ مریض نے ابھی ابھی کروٹ بدلی تھی اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ "کیوں؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ جاوید نے اس کے شانے کو پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔ "خطرہ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی گھوڑے پر آرہا ہے۔ تم آرام سے لیٹے رہو۔ میں نپٹ لوں گا۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا!"

اس نے اپنی بندوق اٹھا لی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی مریض جھٹ سے اٹھا اور لالٹین کا شیشہ اٹھا کر کاغذ کے ٹکڑوں کو جلانے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ جاوید کی سانس رک گئی اور اس کے دل پر ایک گھونسہ لگا۔ اس نے بندوق میں کارتوس بھر لیے۔

"کیا گھوڑے بیچ کر سوئے ہو ڈاکٹر؟" کرن سنگھ گرجا۔

جاوید کی جان میں جان آئی ...... "تھانیدار اکیلا آیا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن اس وقت کیوں؟"

اس نے دروازہ کھولا تو کرن سنگھ کا گرد سے اٹا ہوا بھیانک چہرہ نظر آیا۔

"ارے کرن سنگھ ..... بھئی یہ کیا حلیہ بنایا ہے؟"

"مارا گیا ...... ایک بدمعاش چنگل میں آ کر نکل گیا ...... اور پھر رات بھر بھٹکنا اور

یہ طوفان!" وہ کرسی پر دھم سے گر گیا۔ اس نے ڈاکٹر کا تولیہ اٹھایا اور اس سے اپنا سر جھاڑنے لگا۔ گرد اڑنے لگی۔ اس نے آخری بار اپنی آنکھوں اور مونچھوں کو تولئے سے پونچھا اور ہنسا۔ "میں تو سمجھا کہ بیٹا کرن سنگھ آج مارے گئے۔ کیا طوفان تھا! بہت بھوکا ہوں۔ مگر اس وقت تو کپڑے تک اتارے بغیر بس سونا چاہتا ہوں!" اس نے پیٹی کھولی، پستول مسند کے پیچھے رکھا اور جاوید کے سامنے دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

جاوید دیر تک کھڑا اسے گھورتا رہا۔ جب اس کے خراٹے اس کے حلق کو چیرتے ہوئے سُنائی دینے لگے اور نیند میں اس کی مونچھیں پھڑکنے لگیں تو وہ باہر کا دروازہ بند کر کے مریض کے کمرے میں گیا۔

"سلیم تم فکر نہ کرو۔ تھانیدار مزے میں سو رہا ہے۔ اپنے دورے پر ہے صبح بھاگ جائے گا۔ تم سو جاؤ!"

مریض اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر لیٹ گیا۔ جاوید سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن خاموش فضا میں بھی طوفان کی آواز بار بار اسے چونکا دیتی۔ اور اسی طرح صبح ہو گئی۔

سویرے سویرے جب جاوید باہر کے کمرے میں گیا تو وہاں مسند پر گرد اور تیل کے نشان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کرن سنگھ جا چکا تھا۔ جاوید نے باہر جھانک کر دیکھا جیسے اسے شبہ ہو کہ وہ باہر مسلح کھڑا ہو گا۔ لیکن ہسپتال کے پاس صرف کمپونڈر تھا جو اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لئے ٹہل رہا تھا اور بار بار اس کی ناک اپنے کرتے کے کونے سے صاف کر رہا تھا۔

جاوید اندر پہنچا تو سلیم کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کتاب رکھ دی، "کہو کیسی نیند آئی ڈاکٹر، آنکھیں بتا رہی ہیں کہ جاگے ہو رات بھر!"

"اور تم؟"

"میں تو کلوروفارم سونگھ کر بھی اس ٹھاٹ کی نیند نہیں سو سکتا تھا۔ آدھی بیماری بھاگ گئی۔"

جاوید نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا "بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے، چھپ کر کچھ پیا نہ کرو۔"

"میں نے کچھ نہیں پیا..... تمہارے سر کی قسم!" سلیم کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔

"کیا میرا سر تمہاری بیڑی سے بھی زیادہ سستا ہے؟ یہ کمرے میں کاہے کی خوشبو بسی ہوئی ہے میرے دوست؟"

پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا تو کونے میں بیڑی کے جلے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے۔ اس نے سلیم کی جیب کی تلاشی لی آخر تکئے کے نیچے سے بیڑی کا بنڈل ہاتھ آیا۔ اُس نے بنڈل اٹھایا اور غصے سے کہا! "اس طرح کرو گے تو میں تمہارا علاج نہیں کر سکتا۔ میں آج ہی رگھو کے پاس جاؤں گا!"

"چلو بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ اب نہیں پیوں گا۔ آئندہ کبھی کسی ڈاکٹر کے گھر پناہ نہ لوں گا۔ بس ایک بیڑی اور دیدو۔ ناشتے کے بعد نہ پیوں تو مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔" وہ زور سے کھانسا۔

جاوید نے ساری بیڑیوں کو مسل کر اگلدان میں پھینکا اور بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ کانوں میں کسی کے تکئے میں منہ ڈال کر ہنسنے کی آواز آئی اور اس کے ہونٹوں پر بھی ایک فکر مند مسکراہٹ تیر گئی۔

11

جاوید اب وہاں کی فضا سے اچھی طرح مانوس ہو گیا تھا۔ دربار کی سازشوں، حرام خوری، ظلم اور بد معاشیوں کی قلعی کھل چکی تھی۔ اسی دربار کی وجہ سے اس کے بہت سے منصوبوں پر پانی پھر رہا تھا۔ وارڈ تو نہیں بن سکا۔ لیکن چیرمین کی بیٹی کے ٹائفائڈ کا علاج کر کے اس نے چیرمین کو خوش کر دیا تھا، اور راجہ صاحب نے ہسپتال کے ایک کمرے میں دور دراز کے

مریضوں کو رکھنے کی اجازت دیدی تھی۔ عبدالجبار بھی اس سے ایک حد تک مطمئن تھا کیونکہ اس کے علاج سے سکینہ اچھی ہو رہی تھی۔ اس نے ڈپٹی نصیرالدین کے بیٹے کو اپنے یہاں آکر کچھ دن ٹھہرنے اور سیر و شکار کی دعوت دی تھی جو خاصے تکلف کے بعد قبول کر لی گئی تھی۔ جاوید کو یہ سب کچھ تو معلوم نہیں تھا، لیکن وہ خوش تھا کہ اس کی مریضہ تیزی سے صحت مند ہو رہی ہے اور پہلے کی سی سہمی ہوئی کیفیت اور وحشت کی جگہ اب رنگ و روغن، خوش دلی اور زندہ دلی کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ کلیا کو اس نے ہسپتال کے مالی کی حیثیت سے رکھ لیا تھا اور اسے شہر سے ایک خوبصورت سی بانسری لاکر دیدی تھی، جس کی تان اکثر رات گئے تک اس کی بے خوابی اور بے چینی کا ساتھ دیتی رہتی تھی۔

کمپونڈر خوب چپک چپک کر ڈاکٹر کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ جاوید نے انجکشن دینے کا اور چھوٹی موٹی مرہم پٹی وغیرہ کا سارا کام اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس کو ہلکی پھلکی فیس مل جاتی تھی۔ پھر جاوید نے درگا پرشاد کو دربار میں بھی اس قسم کی خدمات کے لئے بھیجنا شروع کر دیا اور مہینے کے آخر میں اس سے کہا کہ فیس کا بل بنا کر سرکار کے پاس بھیج دو۔ اس نے ہمت کر کے بل تیار کیا اور ڈاکٹر کے دستخط کے ساتھ بھجوا دیا۔ کافی پوچھ گچھ ہوئی، مگر آخر منشی نے بل پاس کر دیا اور درگا پرشاد کو ڈاکٹر کی مقررہ رقم سے زیادہ رقم مل گئی۔ وہ ڈاکٹر کی شرافت اور دوستی کا قائل ہو گیا اور ہر جگہ موقع بے موقع ڈاکٹر کے گن گانے لگا۔ کبھی کبھی تو جوش میں ذرا تیز باتیں کہہ جاتا اور بعد میں پچھتاتا لیکن منہ سے نکلی ہوئی بات کبھی واپس نہ لیتا۔ جاوید اس کی دوستی کی بڑی قدر کرتا اور اپنے قریبی ساتھی کی طرح اس پر بھروسہ کرتا تھا۔

مولوی، ڈاک بابو، اور ماسٹر شاہ عالم کی محفل ہر شام ڈاکٹر کے یہاں جمنے لگی تھی۔ کبھی صرف گپ ہوتی اور کبھی تاش بھی کھیلا جاتا۔

جاوید کو اکثر سلیم کی یاد آتی اور جی چاہتا کہ وہ رگھوناتھ کے پاس جائے اور پوچھے کہ کون ہے وہ... وہ پراسرار، نڈر اور اچھا دوست۔

جب ایک رات اچانک سلیم نے جانے کا اعلان کیا تھا تو وہ گھبرا گیا۔ وہ اس دوست کا عادی ہو گیا تھا۔ بوا بھی اس کو اچھا سا بنگالی مسلمان لڑکا سمجھ کر اس پر اپنی محبت کی بارش

کرتیں۔ انہیں بھی اس کے جانے کا خیال نہیں بچا۔

"نہیں بوا اب میں اچھا ہوں۔ آخر میں کب تک یوں پڑا پڑا محض کتابیں پڑھتا رہوں!"

بوا تو ٹھنڈی سانس لے کر اور جائے نماز پر بیٹھ کر اس کی صحت اور اقبال کے لئے دعا مانگنے لگیں۔ جاوید نے اس کو رخصت کیا۔

رات، خاموش تھی، دو اجنبی، دوستوں کی طرح برگد کے درخت کے نیچے ہاتھ ملا رہے تھے۔ آسمان پر ہلکے پھلکے بادل منڈلا رہے تھے اور ہوا گرم تھی۔ جاوید کے مریض نے خاموشی سے اس کا ہاتھ دبایا، "ہم پھر کبھی ملیں گے!" اس نے کہا اور جاوید کو یہ آواز افق کے اس پار سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ایک پتلا دبلا سایہ دور ہوتا گیا۔ آخر جنگل کا سیاہ بازو بڑھا اور سایہ پھیل کر جنگل بن گیا۔ گرم سانس لیتا ہوا جنگل ..... جاوید کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اس نے تیس دن کے بعد پہلی بار اپنے آپ کو اتنا اکیلا محسوس کیا تھا۔ وہ رات بھر نہ سو سکا۔ بار بار اس کی آنکھوں میں ایک ایسے انسان کی تصویر ابھرتی جو انتہائی خطرے اور بیماری میں بھی صرف اتنا کہتا تھا: "یار سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اتنی آسانی سے دشمن کے پنجے میں نہیں آسکتا۔ یہ بیماری اور یہ پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ کیوں میں ٹھیک کہتا ہوں نا!" جاوید ہنس کر کہتا: "بالکل ٹھیک۔ لیکن ہوشیار رہنا چاہیے!"

"تم تو میری رکھوالی ایسے کرتے ہو جیسے مالی پھولوں کے پودے کی رکھوالی کرتا ہے۔ میں خزاں دیکھ چکا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا!"

ابھی وہ خزاں اور بہار کی اس جدوجہد کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ صبح صبح کرن سنگھ آ دھمکا۔ آج اس کے چہرے پر کوئی تھکن، کوئی بے قراری اور پریشانی نہیں تھی۔ بڑے اطمینان سے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا اور دیر تک اس کے ہاتھ پکڑے رہا پھر بولا: "کیوں ڈاکٹر تم کو یہاں کا پانی راس نہیں آیا۔ روز بروز دبلے ہو رہے ہو۔ کیوں ہو رہے۔ ذرا سامنہ نکل آیا ہے۔ سنا ہے تم بڑی محنت کرتے ہو۔ میاں جان ہے تو جہان ہے۔"

"داروغہ جی یہ چوروں اور ڈاکوؤں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے آپ کو پتا کا پاٹ کب سے کرنے لگے؟" جاوید مہمان کی چائے میں بے تحاشہ شکر ڈالتے ہوئے ہنسا۔

"اچھا تو تم اپنی سناؤ۔ تمہارے مریضوں کا کیا حال ہے؟" دفعتاً اس نے تیور بدل کر اور آواز کی تلخی کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کون سے مریض؟"

"میرا مطلب ہے تمہارے خاص مریض؟"

"میرے سارے مریض خاص ہوتے ہیں!" جاوید نے غصہ دباتے ہوئے پیالی زور سے میز پر رکھی اور تھانیدار کی آنکھوں میں دیکھا۔

تھانے دار نے آنکھیں روز کی تصویر پر جماتے ہوئے بات بدل کر پوچھا: "ارے تمہارا نوکر تمہاری میز کی گرد بھی صاف نہیں کرتا۔ ذرا دیکھنا اس فریم کے شیشے پر کتنی گرد جم گئی ہے۔ ایسی موہنی صورت اور ...." اس نے بات پوری کئے بنا کنکھیوں سے جاوید کو دیکھا جو اس سوال سے واقعی گھبرا گیا تھا۔ اس کی نگاہیں بھی گرد کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"میں خود ہی میز صاف کرتا ہوں" اس نے ٹالنے کے لئے کہا ......"داروغہ جی آپ سنائیے کیسی بسر ہو رہی ہے۔"

"اچھی بسر ہو رہی ہے بھائی۔ بھگوان کی دیا ہے!" اس نے بات چبا کر اور اپنے پستول کے خول پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "سنا ہے سرکار کی بہن کو تم نے اچھا کر دیا۔ تم نے کمال کر دیا۔ لوگ تو مایوس ہو چکے تھے۔ اور ہاں تمہارے کلکتے والے دوست کا کیا حال ہے؟"

جاوید نے نگاہیں اٹھا کر غور سے داروغہ کے چہرے کا جائزہ لیا جس کے لٹکے ہوئے ہونٹوں اور مونچھوں سے ایک شریر تمسخر جھانک رہا تھا۔

"کون کلکتے والا دوست؟"

"سلیم۔" کرن سنگھ نے گھورا! "ذرا ہم سے ملاؤ۔ سنا ہے دلچسپ آدمی ہے۔"

"آپ میرے دوست سلیم کا ذکر کر رہے ہیں؟ واقعی بہت دلچسپ آدمی ہے۔ تعلیم کے زمانے میں ہماری دوستی ہوئی تھی۔ چند دن رہ کر چلا گیا!"

"چلا گیا؟" داروغہ کرسی سے اچھل گیا۔

"ارے آپ اچھل کیوں گئے؟" جاوید کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ مجھے تو رات ہی معلوم ہوا۔ میں تمہارے دوست سے ملنا چاہتا تھا۔ کیا نام بتایا تم نے ..... سلیم؟ ..... مسلمان ہے؟"

"نام سے ظاہر ہے!" جاوید نے اطمینان سے طنزیہ کہا۔

"نو مسلم ہوگا؟" داروغہ نے جھلا کر پوچھا۔

"جی نہیں خاندانی مسلمان ہے۔ لیکن میں پوچھ سکتا ہوں آپ کو یکایک میرے دوست سے اتنی دلچسپی کیسے پیدا ہوگئی؟"

"کیا آپ کا دوست کلکتے واپس گیا ہے یا کہیں اور جانے کا ارادہ ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم؟"

"کیا آپ اپنے دوست کو اچھی طرح جانتے ہیں؟" داروغہ کرن سنگھ نے اپنی آواز میں کچھ تیزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میں اچھی طرح جانوں یا بری طرح جانوں لیکن آپ کو میرے ذاتی معاملات سے اتنی دلچسپی نہیں دکھانی چاہیے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میرے پاس ہر قسم کے مریض آتے ہیں۔ دوست بھی اجنبی بھی۔"

"تو تم اجنبیوں کو بھی اپنے گھر میں رکھ کر علاج کرتے ہو؟"

"میں اسے اپنی بے عزتی سمجھتا ہوں ..... اور آئندہ آپ کو مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی جرآت نہیں ہونی چاہیے۔ بس!" جاوید کھڑا ہوگیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ داروغہ کرن سنگھ کی پیشانی پر بھی شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے غور سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ "ناراض نہ ہو!" اس کا لہجہ بہت نرم اور ہمدردانہ ہوگیا۔ "میں تو تمہارے بھلے کو کہہ رہا ہوں۔ تم نہیں جانتے کہ تم نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ لیکن خیر چھوڑو۔ میں ہاتھ سے نکلے ہوئے شکار کے پیچھے نہیں بھاگتا۔" اُس نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ "لیکن کیا واقعی تمہیں اپنے مریض کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم۔ میں جانتا ہوں وہ تمہارا دوست نہیں تھا۔ اور کیا واقعی وہ اب تمہارے گھر میں نہیں ہے؟"

جاوید اٹھا اور کرن سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ "لیجیے دیکھ لیجیے!" بوا پردہ

کرتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بھاگیں اور جنگلی اپنے چہرے سے راکھ پونچھتا ہوا ان دونوں کو گھورتا رہ گیا۔

کرن سنگھ واپس آکر دھم سے کرسی پر گر گیا۔ "ڈاکٹر غصہ تھوک دو میں تو مذاق کر رہا تھا۔ خیر چھوڑو، بھئی جب تمہارے ہسپتال میں کمرہ ہے تو مریضوں کو وہیں رکھا کرو۔ اس طرح تم مصیبت سے بھی بچ جاؤ گے۔"

"شکریہ۔ میں آپ کی نصیحت پر غور کروں گا۔"

"ناراض ہی رہو گے یا کام کی بات بھی کرو گے۔ تم تو اس علاقے میں بہت اچھے ڈاکٹر مشہور ہوگئے ہو۔ لوگ تمہارا دم بھرتے ہیں۔"

جاوید نے خاموشی سے ایک پیالی چائے اور بنائی اور اس کے سامنے بڑھادی۔ لیکن داروغہ کرن سنگھ نے چائے نہیں پی اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ "تم میرے نوجوان دوست ہو۔ مجھے تمہاری دوستی کی ہمیشہ ضرورت ہوگی۔ اب منہ نہ پھلاؤ۔ میرے گھر آؤ۔ تمہیں بڑھیا چیز کھلاؤں گا۔"

وہ چلا گیا لیکن جاوید اپنے مریض کے بارے میں سوچتا رہا...... کمبخت یوں جرح کرتا ہے جیسے میں نے اپنے گھر کسی ڈاکو کو رکھ لیا ہو۔ اسے رگھوناتھ کا خیال آیا۔ سوچا رگھو سے اس کے بارے میں پوچھے لیکن پھر خود کو روک لیا۔

کلیا بڑے سلیقہ کا مالی ثابت ہوا۔ اس نے ہسپتال کے احاطے میں پھولوں اور پودوں سے بڑی رنگا رنگی اور شادابی پیدا کردی تھی۔ چماری اور ڈومنا کے پاس والی زمین پر تو اس نے پیاز اور مولی لگانے کا پروگرام بنایا تھا، اور دو تین بار زمین پر ہل چلا کر اسے برابر کر چکا تھا۔ ڈاکٹر کے سامنے والے احاطے میں اس نے گھاس کو بڑی قینچی سے کاٹ کر مخمل کے فرش کی طرح ہموار اور نرم بنا دیا تھا۔ چنبیلی، بیلے اور گیندے کی کیاریاں لہلہانے لگی تھیں۔ رات کی رانی مہکتی اور اس کی بانسری کی تان اڑتی تو ساری فضا نغمے اور خوشبو سے بس جاتی اور چاندنی راتوں میں جاوید کو اپنا احاطہ پرستان کا خطہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اکثر چھٹی کے وقت کرسی نکال کر باہر آ بیٹھتا کبھی کھیتوں پر، ندی سے آگے بادلوں کو اڑتے ہوئے دیکھتا اور

کبھی ان کتابوں کے ورق الٹتا رہتا جو اس کا مریض جانے سے پہلے اسے دے گیا تھا۔ کبھی محض سگریٹ کے کش اڑاتا ہوا آنکھیں بند کر کے خواب سے دیکھنے لگتا اور اس کے چہرے پر کسی شہید کے چہرے کا سکون اور مضمحل سا نور پیدا ہو جاتا۔ اچانک وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا اور کلیا کے پسینے پسینے ہوتے ہوئے جوان بدن کو دیکھتے ہوئے پوچھتا، "کلیا تجھے کبھی تھکن نہیں ہوتی؟" کلیا کی کھرپی رک جاتی۔ وہ ہنستا ہوا کھڑا ہو جاتا۔ ڈاکٹر کو دیکھتا اور پھر اپنے بازوؤں کو دیکھتا جس کی نم چمک سے گویا زندہ مچھلیاں تڑپ کر باہر آنے کو بے قرار تھیں۔

تھوڑے دن میں یہ باغ بن جائے گا،" جاوید سوچتا اور کلیا کی باغبانی پر خوش ہو کر کہتا:

"کیا بات ہے کلیا رات میں نے تیری بانسری کی تان نہیں سنی؟"

"حضور وہ جو اچلا گیا تھا ماں کو دیکھنے، کمپونڈر بابو سے پوچھ کر گیا تھا۔"

شام کو تاش کھیلنے والوں کی محفل جمتی تو کھانے کا ہوش بھی نہ رہتا۔ شروع میں جاوید نے بھی خوب دلچسپی لی۔ لیکن اب وہ کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔ ایک دن ڈاک بابو نریش نے ہنس کر پوچھ ہی لیا۔ "کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب کسی سے آنکھ لڑ گئی کیا؟"

جاوید کو یہ سوال بازاری سا معلوم ہوا۔ غصے میں جان بوجھ کر بالکل غلط پتا چل دیا۔ سب نے جھلا کر میز پر اپنے پتے پھینک دیئے ... "آخر کوئی تک بھی ہے!"

"نہیں کوئی تک نہیں۔ میں ہوں ہی بے تکا!" جاوید نے بگڑ کر کہا۔

سب اٹھ کر چلے گئے۔

جاتے جاتے صرف مولوی نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کہئے تو میں پڑھ کے پانی بھجوا دوں!"

"کیا؟" جاوید نے اس طرح غرا کر پوچھا کہ مولوی کے منہ سے "السلام علیکم" اس طرح نکلا جیسے لبلبی دبانے سے بندوق کی گولی نکلتی ہے۔

چند دن شام کو جاوید کے یہاں سناٹا رہا۔ البتہ کمپونڈر درگا پرشاد آجاتا اور مزے مزے کی باتیں کرتا رہتا۔

"صاحب کوئی تدبیر بتایئے کہ آدمی جتنے بچے چاہے اتنے ہی ہوں۔ نہ اس سے ایک کم

اور ۔ ایک زیادہ: "وہ اسی قسم کی بے تکی باتیں کرتا اور جاوید کو اس کی حماقت کی باتوں میں بھی لطف آتا اور وہ محض باتوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے الٹا سیدھا جواب دیتا چلا جاتا۔ "آپ نے سنا راجہ بہادر کی بکری کو آدمی کا بچہ پیدا ہوا اور جناب پیدا ہوتے ہی ہندی میں باتیں کرنے لگا۔ کسانوں نے بتایا کہ کمپونڈر صاحب بچہ پیدا ہوتے ہی مہاتما کی طرح بولنے لگا۔"

"کیوں کمپونڈر صاحب آپ نے بکری اور مہاتما کی زیارت نہیں کی؟"

"ہسپتال کے جھمیلے سے چھٹی ہی کہاں ملتی ہے وہ تو میری" گھر میں "کا خیال تھا ......" پھر اسے چھینک آتی اور ناس کی ڈبیہ کھول کر مزے سے سنا۔ "آئی ہو تو جی بھر کے آؤ۔" اور جاوید کو بے ساختہ ہنسی آجاتی۔

کچھ دنوں تو یہ سلسلہ رہا اس کے بعد جاوید اپنی ہر وقت کی خاموشی اور کمپونڈر کی بکواس سے گھبرا گیا۔ اور اسے ایسا لگا کہ اس کے آس پاس کی شادابی اصل میں بڑی خوفناک ویرانی ہے۔ آخر ایک دن اس نے خود جا کر شاہ عالم اور ڈاک بابو کو منالیا اور مولوی تو شام کو ان کے ساتھ کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔ پھر تاش کی محفل گرم ہوئی اور گپیں ہونے لگیں۔ دربار کی زندگی پر فقرے چست ہوتے، قہقہے لگتے، بوا اندر سے پان کی گلوریاں بنا کر بھیجتیں اور ماسٹر شاد عالم اور مولوی میں پیک کی پچکاریاں اڑانے کا مقابلہ بعض مرتبہ خطرناک صورت اختیار کر لیتا۔ دونوں بیک وقت اگالدان کے لئے ہاتھ بڑھاتے اور اگالدان ہوا میں معلق کبھی ایک طرف جھکتا اور کبھی دوسری طرف۔ اگالدان چھلک پڑتا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کا غصہ اور غصے کے ساتھ پیک چھلک جاتی ....

اچانک کچھ ایسا ہوا کہ جاوید کی خاموشی ایک دھماکے کی طرح پھٹ پڑی۔ اور اس کو اپنی زندگی ایک شکستہ کشتی کی طرح اتھاہ سمندر کی بپھری ہوئی لہروں میں تیرتی نظر آئی ..... ساحل کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ خود کو سنبھالے لیکن سنبھال نہ سکا۔ مریضوں کے دکھ درد میں کھو کر بھی وہ خود کو نہ بھول پاتا۔ اکثر اکیلا دور دور نکل جاتا۔ کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر۔ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا۔ پہاڑوں کی چٹانوں پر دوڑتا۔ ندی کے کنارے بیٹھ کر

پتھر پھینکتا رہتا۔ ڈاکٹری کی کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہاں بھی انسانی جسم کی ہڈیوں پر گوشت منڈھ جاتا، رگوں میں خون دوڑنے لگتا، آنکھیں چمکنے لگتیں، نبض تیز ہو جاتی اور ہاتھوں کا لمس دل کے تاروں کو چھیڑنے لگتا۔ وہ کتابیں پٹک کر اپنے آپ سے بھاگنے لگتا ..... وہ بھاگتا چلا جاتا اور جب رکتا تو معلوم ہوتا جہاں سے بھاگا تھا وہیں کھڑا ہے۔

ایک شام جب سورج ڈوب گیا اور شفق کے دہکتے ہوئے پھول تاڑ کے لمبے لمبے درختوں کے پیچھے نیلے رنگ کے گہرے اندھیرے میں غائب ہونے لگے تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ شفق ہے یا شعلوں سے لدی ہوئی کشتیاں جو ایک اوندھے ہوئے کالے سمندر میں ڈوب رہی ہیں۔ ہوا کے زور سے سوکھے ہوئے زرد اور بے جان پتے دن بھر درختوں سے گر کر ہسپتال کے احاطے میں سرسراتے رہے تھے۔ جاوید تھکا ہارا اپنے کوارٹر کے آگے ٹیلے پر کھڑا گولر کے درخت کو ہوا میں جھومتے دیکھ رہا تھا۔ یکایک درخت کی ڈالوں کا تھرکنا بند ہو گیا اور سرسراہٹ ختم ہو گئی جیسے پرندے نے اڑتے اڑتے اچانک اپنے پر سمیٹ لئے ہوں .....

"کیا ہوا کے پیروں میں بھی زنجیر ہے ..... بھاگتی ہے، .... بھاگتی ہے .... آخر ایک جگہ پہنچ کر زنجیر ختم ہو جاتی ہے اور ہوا وہیں تھم جاتی ہے! .... اور میں ..... میرے پیروں میں کیسی زنجیریں ہیں .... میں کیوں رک جاتا ہوں ...... بھاگتے بھاگتے ..... لیکن یہ زنجیریں ہیں کہاں .... کہاں سے شروع ہوتی ہیں؟ کہاں ختم ہوتی ہیں؟"

اچانک ہوا میں پھر حرکت ہوئی۔ ایک لہر آئی، دوسری آئی، اور پھر نرم نرم خنکی بھری لہریں آتی رہیں اور اس کے گرم چہرے کو چومتی ہوئی گذرتی رہیں۔ بہار کی پھوٹتی ہوئی ہری کونپلوں کی خوشبو اس کی روح میں اتر گئی اور دل کی گھٹن، کمزوری اور بے بسی کا ہر احساس دھل گیا جیسے پانی برسنے کے بعد آسمان دھل کر چمک اٹھتا ہے .. پرسکون، نیلا اور گہرا سمندر! ابھی وہ اس کیف میں پوری طرح ڈوبا بھی نہ تھا کہ ماسٹر شاہ عالم، نزیش اور مولوی کا قافلہ آن دھمکا۔

آن کے آن برآمدے میں میز کے چاروں طرف کرسیاں جم گئیں، بڑا لیمپ آگیا۔

مراد آبادی طشتری میں اندر سے پان کی گلوریاں آگئیں اور نزلیش کھٹا کھٹ تاش کے پتے پھینٹنے لگا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر آج منہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

"اگر اچھے پتے نہ دیے تو ......" جاوید نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ وہ تینوں ڈر گئے۔

"اپنی اپنی قسمت ...." نزلیش ڈاکٹر کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے چہکا۔

"نزلیش تم نے پھر قسمت کی رٹ لگائی ... اماں تاش کا قسمت سے کیا واسطہ؟" ماسٹر شاہ عالم نے ایک ساتھ دو گلوریاں کلوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"اور کیا جب میں پتے بانٹتا ہوں تو تمہاری قسمت کا ستارہ کیوں ڈوب جاتا ہے ......" مولوی نے داڑھی میں خلال کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ بعض لوگوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے .... کہ ستارے ڈبویا کریں۔"

"قسمت کا ستارہ نہ ہوا .... مولوی صاحب کی لٹیا ہو گئی .... ابھری کم اور ڈوبی زیادہ ...."

تھوڑی دیر میں کھیل جم گیا لیکن جیسے جیسے کھیل جمتا گیا جاوید کا دل اچاٹ ہوتا گیا۔

"یار یہ تاش سے کام نہیں چلے گا" ...... جاوید نے کہا "کچھ اور دلچسپی ہوتی تو ...."

"تو ہولی تو آنے والی ہے نا!" ...... نزلیش نے پتے پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہولی ...." ڈاکٹر کے منہ سے آہستہ سے نکلا اور وہ کھو گیا۔

"سنا ہے دربار میں ہولی کی تیاری زوروں پر ہے ...." ماسٹر شاہ عالم نے دو گلوریاں اور اپنے کلوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"کیوں .... کوئی خاص بات ہے؟" مولوی نے پوچھا۔

"کمال ہے ...... اتنا نہیں جانتے .... ڈپٹی نصیر الدین کے صاحبزادے ...... فخرالدین جو آنے والے ہیں ...."

ماسٹر شاہ عالم نے گالوں کے گوشت میں دھنسی ہوئی آنکھوں کو بند کرتے ہوئے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میاں فخرالدین آئیں گے تو یہیں کے ہو کے رہ جائیں گے۔"

"اچھا! ...." نریش نے نقلی حیرت سے کہا "ہاں میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے .... پچھلے دنوں دربار سے جتنے لفافے گئے سب کے سب عطر میں ڈوبے ہوئے تھے ....مزا آگیا ...."

"بابو جی مہر لگاتے ہو۔ یا خوشبو سونگھتے ہو ...." مولوی نے دھمکی کے انداز سے پوچھا۔

"خوشبو .... اپنی قسمت میں عطر کہاں .... کبھی کبھی اسی طرح .... ناک کی دھار آزما لیتا ہوں ...."

"اچھا .... شادی ہوگی تو بڑی رونق ہوگی ....دیکھنا کیسی برات آئے گی .....ڈنکا پٹ جائے گا"

جاوید اچانک اٹھ کھڑا ہوا "بس اب اور نہیں کھیلتے"

دوست چلے گئے۔ وہ دیر تک میٹھا لیمپ کی روشنی میں تاش کے پتوں سے کھیلتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ ہونٹ چباتا رہا .... پھر اٹھا لیمپ بجھایا اور جا کر گولر کے درخت کے سائے میں کھڑا ہوگیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اندر سے گرم گرم آنچ نکل رہی ہے.... کہاں ہے بہار کی وہ خنکی ہوئی ہوا جو سوکھے ہوئے پتوں کو اپنے آنچل میں سمیٹ لے جاتی ہے .... جو آتی ہے تو درختوں اور پودوں کو نئی ہری، پھوار کی طرح نرم کونپلوں سے بھر دیتی ہے۔ کہاں ہے وہ ہوا؟ اس کا دم گھٹنے لگا وہ تیزی سے کوارٹر کے پیچھے چلا گیا۔ اس نے اپنے سائیس کلیا کو نہیں جگایا جو بانسری بجا بجا کر سو چکا تھا.... بانسری اس کے سرہانے زمین پر پڑی تھی .... خاموش نغمہ کس میں ہے؟ اس بانسری میں یا کلیا کے دل میں؟ اس کا دل کیسے آہنگ سے دھڑک رہا تھا!

جاوید نے آہستہ سے اصطبل سے گھوڑا نکالا، خود ہی زین کسی اور سرپٹ جنگل کی طرف نکل گیا۔ دو گھنٹے بعد پسینے میں شرابور گھوڑا آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی چٹانوں سے اتر رہا تھا اور جاوید کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ چاند بھی نیچے اتر رہا ہے۔

یکایک چاند بجھ گیا۔ خوفناک بادل امڈنے لگے۔ جنگل میں اندھیرا ہوگیا۔ اور بوڑھی حویلی اور زیادہ بوڑھی اور پُراسرار نظر آنے لگی۔ نہ جانے وہ کیوں گھوڑے سے اتر گیا۔ اور گھوڑے کو ایک

چٹان کے پاس چھوڑ کر آہستہ آہستہ حویلی کی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ نچلی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یہ کس کا سایہ ہے؟ وہ اور آگے بڑھا۔ حویلی کی اوپر والی آسیبی چھت پر اندھیرے کا راج تھا۔ قبرستان کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں وہ جوتوں کی ٹھوکر سے لڑھکتے ہوئے پتھروں کی آواز پر چونک گیا۔

کمرے کے اندر والی دیوار پر سایہ اچھلا اور جاوید کا سانس رُک گیا۔ کھڑکی میں سے ایک سایہ جھانک رہا تھا۔ سایہ لالٹین لئے آگے کو جھکا ہوا تھا جیسے دوسرے ہی لمحے چھلک پڑے گا..... الجھے ہوئے بال، بڑی بڑی آنکھیں، سنہرہ رنگ ... اب تو وہ بیدار بھی نظر آ رہا تھا۔ اف وہ دیوار کے کتنا قریب آ گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ تلوار کی دھار پر چل رہا ہے۔ جس کے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف جہنم۔ وہ تیزی سے مڑا اور گھوڑے پر بیٹھ کر جنگل سے نکل گیا۔

12

تارے جھلملانے لگے اور ہوا کی دیوانگی اور شرارت کا زور کچھ تھما تو آہستہ آہستہ گاؤں کے چھوکروں اور من چلوں کا شور دبنے لگا..... رات بھر ہوری جلی تھی، چیخیں ابھرتی رہی تھیں اور لکڑیوں کے ڈھیر سے شعلے بھڑک کر آم، پیپل، برگد کے درختوں پر سنہری روشنی کا جال منڈھتے رہے تھے۔

رات بھر جاوید کی آنکھ نہ لگی "ہوری، ہوری!" کے نعرے رات بھر کانوں میں گونجتے رہے۔

جاوید بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ لکڑیوں کے الاؤ کھیتوں اور

میدانوں میں نہیں بلکہ اس کے دل میں بھڑک رہے ہیں۔ آخر اس نے سونے کا ارادہ چھوڑ دیا اور کرسی کھڑکی کے قریب کھینچ لی۔ تاروں بھرے آسمان کے سائے میں سنہرا دھواں اوپر اٹھتا اور شعلے لہرانے لگتے۔ جیسے کسی نے اوپر سے سیاہ لباس کھینچ لیا ہو۔ اور کوئی بے قرار پیکر اپنی تمام شعلگی کے ساتھ ناچنے لگتا۔ یہ دھواں تازہ خون میں رنگی ہوئی مخمل کی ساڑیوں کی طرح لہراتا ہوا جنگلوں کے پیچھے پُراسرار اندھیرے میں کھو جاتا۔ اس کا جی چاہا کہ لپک کر ان رنگین ساڑیوں کا سرا پکڑ کر انہیں اپنے چاروں طرف لپیٹ لے..... اس نے کھڑکی کی سلاخوں کو زور سے پکڑ لیا جیسے کوئی قیدی زندگی کی حسرت بھری یادوں اور دل کی ہوک سے بچنے کے لئے سلاخوں سے سر ٹکرا رہا ہو۔

"ہوری، ہوری، ہوری!"

شور تھم گیا۔ ہوا کی لہروں میں ایک عجیب چبھن اور خوشبو تھی۔ کیا یہ مسرت کی لہر تھی؟ ایسا لگتا تھا کہ دل کی گہرائی سے لہر اُٹھتی ہے اور لپک کر ہوا کے بے چین ہونٹوں پر اپنے گرم ہونٹ رکھ دیتی ہے۔ چنگاریاں اڑتی ہیں اور رگوں میں تیرنے لگتی ہیں۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

دور گرد اڑی اور مویشیوں کی گھنٹیاں بج اُٹھیں۔ گالیوں کی گونج نے صبح کا دل چھید دیا۔ آبرکی طرف چراگاہ پھیلی ہوئی تھی ..... اور اب مویشی سڑک کی چڑھائی پر پہنچ کر چراگاہ کی طرف اترنے لگے تھے۔ جہاں سے مویشی چراگاہ کی طرف اتر رہے تھے وہاں سرُخ کرنوں کا ایک جھرنا زمین پر گر رہا تھا جیسے سرُخ کرنوں سے روشنی کا ایک تلاطم پیدا ہو رہا ہو اور یہ سارے مویشی اس تلاطم میں بہتے جا رہے ہوں۔ ابھی روشنی کا یہ تلاطم ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دور سے گاڑی کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

وہ چونک گیا۔ ہولی ہو یا دیوالی مریض تو آئیں گے۔ تیزی سے تیار ہو کر جب وہ ہاتھ میں آلہ لئے باہر نکلا تو چار کہاروں کے کندھے پر سوار ایک کھلی ڈولی تیز تیز دربار کی طرف جاتی نظر آئی۔ پیچھے پیچھے دو پیادے دوڑ رہے تھے۔ سب سے آخر میں منشی اپنے اڑیل ٹٹو پر سوار تھا۔ ٹٹو اپنی پرانی عادت کے مطابق آڑے ترچھے انداز میں دلکی چل رہا تھا

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو ہی جھٹکے میں سوار نیچے آرہے گا۔

اسپتال میں مریض بہت کم تھے۔ زیادہ تر عورتیں اور بوڑھے تھے۔ تھوڑی دیر میں مریض چھٹ گئے اور ڈاکٹر کی آنکھیں بڑے دروازے سے دور کھیتوں پر منڈلانے لگیں۔ گاؤں کے چھوکرے ایک دوسرے پر دھول پھینک رہے تھے۔ رنگ نہ سہی دھول سہی ...... رنگ تو دل میں ہے پچکاریوں میں کیا رکھا ہے۔ یکایک نگاہوں میں شہر اگ آیا...... شہر کی سڑکیں، گھٹی گھٹی گلیاں، دوڑتے بھاگتے ٹرک، فٹن، بگھیاں ...... اور رنگوں میں رنگے ہوئے مرد اور عورتیں ...... پچکاریوں سے مسلح بچے، ان کے رنگے ہوئے چہروں سے جھانکتی ہوئی شریر آنکھیں، ہونٹوں سے لپکتے ہوئے قہقہے اور پچکاریوں سے لپکتی ہوئی دھنک کی دھاریاں ...... دیواروں پر رنگ اور بلاؤزوں اور شلوکوں پر رنگ ...... جھکے ہوئے سر میں صندلیں مانگ، تڑپتی ہوئی سانولی کلائیاں، ٹوٹ کر ہزاروں رنگ میں بکھرتی ہوئی چوڑیاں ...... دانتوں تلے دبتے ہوئے ہونٹ ...... ایک پھول سا جسم لپکا اور کونے میں چھپ گیا ...... نوجوان کے ہاتھ میں پچکاری ہے اور اس کی چونچ سے رنگ ٹپک رہا ہے۔ اس کی قمیص اور پتلون رنگ میں بھیگی ہوئی ہے اس کے رنگ میں روشنائی بھی شامل ہے۔ دوات اب تک لڑکی کے ہاتھ میں ہے "ماردوں گی" نوجوان پچکاری پھینک دیتا ہے اور کانپتی ہوئی قوس قزح کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ قوس قزح بھرے بھرے بازوؤں میں سمٹ آتی ہے۔ رنگ میں رنگ مل رہا ہے۔ گدرایا ہوا سیاہ جوڑا کھل جاتا ہے اور سانسوں کی خوشبو بکھر جاتی ہے ...... رنگ کے سحر میں رنگ گرفتار ہو رہے ...... یہ جادو کہاں سے شروع ہوتا ہے کہاں ختم ہوتا ہے ...... کون جانے!

ہسپتال کے زینے پر جوتوں کی آہٹ ہوئی اور کھیتوں نے شہر کو نگل لیا، اور ڈاکٹر نے اپنی آنکھیں ہتھیلی سے پونچھ لیں۔

نزہت کے ہاتھ میں پچکاری تھی۔

"ڈاکٹر صاحب ہوشیار!"

جاوید دوڑ کر نزہت سے لپٹ گیا اور اس سے پچکاری چھیننے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا بانده کے آپ کا سوٹ خراب ہو جائے گا" نریش نے ہنس کر کہا۔

"ہونے دو!"

نریش ایک جھٹکے سے پچکاری چھڑا کر ہسپتال سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "باہر آیئے ڈاکٹر صاحب ہو جائیں دو دو ہاتھ!"

نریش نے میدان میں کھڑے کھڑے پچکاری کے سارے ارمان نکال لئے اور اس کی سفید قمیص اور پتلون پر رنگ کے ایسے تانے بانے بنے کہ جاوید کو بھی مزا آگیا۔ جاوید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ بالٹی اٹھا کر ٹھنڈا پانی نریش پر انڈیل دیا۔

"مان گیا ڈاکٹر مان گیا!"

"ابھی کہاں ذرا دیکھتے جاؤ کتنی زوردار ہولی منتی ہے آج!"

دن بھر بڑی دھوم دھام رہی۔ ڈاکٹر گھر ہی پر تھا۔ اس کے دوست احباب آتے رہے اور اس کی پیشانی پر ابیر ملتے رہے۔

شام ہونے کو آئی۔ ہوا تیز ہو گئی اور جھنڈولے درختوں میں پھنس پھنس کر سیٹی بجانے لگی۔ کچی سڑک پر رنگوں سے نہائی ہوئی خستہ حال لاری گذری اور گرد سیدھی اس کے برآمدے تک لہراتی چلی آئی۔

جیسے جیسے شام گہری ہوتی گئی ہولی کا رنگ دبتا گیا اور ہوا میں ایک اداس اداس گیت تیرنے لگا۔ نریش کا چیچک بھرا چہرہ بار بار چمک اٹھتا اور منہ سے گولی کی طرح ایک قہقہہ نکلتا۔ "ڈپٹی نصیر الدین کے صاحبزادے فخرالدین آن دھمکے .... میں نہ کہتا تھا .... کچھ تو ہے کہ ڈپٹی نصیر الدین کے ہاں جتنے خط جاتے ہیں عطر میں بسے ہوئے جاتے ہیں۔"

جاوید کے دل میں ایک ٹھنڈی لہر اٹھی اور اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری زرد کرنیں درختوں سے چھانک کر چھپ گئیں۔ اس کے چہرے پر ایک ویران سی زردی بکھر گئی۔ نجانے یہ مرتی ہوئی روشنی کا عکس تھا یا اس کی روح کی تھکن، یادوں میں پلتے ہوئے بے نام غم کی چمک۔

آخر میں چاہتا کیا ہوں؟ کیا نہیں ہے میرے پاس؟ کس چیز کی پیاس ہے مجھے؟ لیکن

میں کیوں بھاگ رہا ہوں ؟ کس چیز کی تلاش میں ہوں ؟ کس سے بھاگ رہا ہوں ؟ کہاں بھاگ رہا ہوں ؟ کیا میری منزل کا کوئی نام ہے ؟ رنگ اڑتا ہے اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے گرد بن جاتا ہے۔ میں روشنی کی طرف لپکتا ہوں اور روشنی ریت کی لہر بن جاتی ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہوں روشنی کی طرف لپکتا رہا ہوں۔ لپکتا ہوں اور کرنوں کو مٹھی میں پکڑنا چاہتا ہوں، پل بھر کو مٹھی جگمگاتی ہے، پھر مٹھی کھولتا ہوں تو اس میں ایک سیاہ سورج چمکتا نظر آتا ہے ..... اندھیرا ہر طرف اندھیرا .... لیکن مجھے روشنی چاہیے، اے روشنی تو .... کہاں ہے تو .... زندگی میں .... یا خواب میں .... میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں یا خواب دیکھ رہا ہوں .... یہ کیسی کرنیں ہیں .... ان کرنوں میں پھول گندھے ہیں اور پھولوں سے شہد ٹپک رہا ہے .... شہد ہے یا ایک معصوم دل کی خوشبو .... یہ دل کس کا ہے .... نہیں، نہیں یہ دل نہیں ہے، انسان کا دل اتنا کمزور، اتنا ٹھنڈا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ دل ہے کیا بکواس .... کتنا اچھا ہو جو یہ دھڑکنا بند کر دے ...."

"اے مہاتما بدھ .... کچھ روشنی ملی ؟"

رگھوناتھ کی آواز تھی کہ چابک، جاوید اچھل پڑا۔ لیمپ کی زرد روشنی میں رگھوناتھ کا رنگوں میں کھویا ہوا حلیہ جاوید کی سمجھ میں نہ آیا۔ حیرت کی طنابیں ٹوٹیں تو آہستہ آہستہ جاوید کے چہرے سے روکھی زردی دور ہونے لگی، جیسے کیاریوں میں دوڑتے ہوئے پانی نے آہستہ آہستہ مٹی کو بھگو دیا ہو۔

"یار ہولی کے دن بھی اکیلے بیٹھے ہو۔ میں نے دن بھر تمہارا انتظار کیا، مانا بڑا کام ہے تمہارے سر پر۔ پھر بھی تہوار میں تو دوست کو .... یار تم رہے وہی گھامڑ کے گھامڑ۔"

"اچھا، اچھا بکو مت .... شرم نہیں آتی .... نہ بھنگ پلائی نہ اور کچھ .... الٹا چور کو توال کو ڈانٹے ...."

رگھوناتھ نے فوراً تھرمس کھولا "ابھی لو ..... چلو منگواؤ گلاس۔"

جنگلی نے گلاس رکھے اور رگھوناتھ کو سلام مارتے ہوئے تھرمس کو سونگھا۔

"سو نگھومت جنگلی ہمارا مزا کر کرا کر دو گے!" رگھوناتھ چیخا۔

"رگھوناتھ بابو یہ ہے کیا؟"

"جنت کا دودھ ہے، جنت کا دودھ!"

جنگلی نے شک بھری نظروں سے اپنے مالک کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ جنگلی بھی ہنسنے لگا...... نہ جانے کتنے دن بعد جاوید کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک دیکھ کر جنگلی کا دل خوش ہو گیا۔ "لگتا ہے سچ مچ جنت کا دودھ ہے!" وہ ہنسا۔

دونوں دوستوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور رات گئے تک بھنگ پیتے اور گپ کرتے رہے۔

"جانتے ہو رگھو کلکتے میں ہر سال ہولی میں خوب بھنگ پیتا تھا......"

"بھنگ تو پیتے تھے مگر رہتے تھے آدمی کے آدمی......"

"اور اب؟"

"اب......اب تو لگتا ہے خوش نہیں ہو......ویسے تو ہنستے بھی ہو......کام بھی کرتے ہو......لیکن......"

"رگھوناتھ......بس اس لیکن سے میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ تم لوگوں کی لیکن میری جان لے کر رہے گی......میں اس لیکن سے بھاگ رہا ہوں......اور تمہاری لیکن ہے کہ پیچھے جھاڑ کر......"

رگھوناتھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بجھ گئی۔ جاوید اپنی کرسی پر بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور لیمپ بجھا دیا۔ اندھیرے میں اس کا جسم آہستہ آہستہ ہلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کچھ مبہم سی آواز نکل رہی تھی۔ جیسے دانت بھینچ کر آواز کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہو "میں کیا کروں......کیا کروں میں......کوئی راستہ نہیں!"

رگھوناتھ اٹھا، دوست کے ماتھے کو ٹھنڈی انگلیوں سے چھوا "جاوید بیمار معلوم ہوتے ہو......جاؤ سو جاؤ......میں کل پھر آؤں گا......" اس کی آواز رندھ گئی۔

رات سنسان ہو گئی اور وہ برآمدے میں بیٹھا تصور اور یادوں کی لہروں میں بہتا رہا۔ اور اونچی نیچی لہروں کے گیت سنتا رہا ...... یہ گیت کتنے اداس تھے۔ جیسے شام کا دھواں دھواں سا غبار! جانے وہ کب تک اس غبار میں خاموش بیٹھا سانس لیتا رہا۔

کوارٹر کے پیچھے اس کا گھوڑا ہنہنا رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر پر کلیا کی بانسری کی تان پھوٹ رہی تھی بھنگ اور تاڑی کے نشے میں مست کلیا آج گانے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

بربا کا گیت تھا۔ عاشق کا کلیجہ پھنک رہا تھا۔ جابر اور کٹھور زمیندار نے سانولی سجنی کو گھاس کاٹنے کا حکم دے رکھا ہے۔ اگر اس نے صبح ہونے تک گھاس کاٹ کر چبوترے پر گوری مٹی سے لیپ پوت نہ کی تو اس کو ننگا کر کے املی کی ٹہنی سے پیٹا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کے گدرائے ہوئے پھول جیسے نرم، آگ جیسے گرم، مرمر جیسے چمکتے اور برسات کی پہلی پھوار سے نہائی ہوئی کالی مٹی کی طرح مہکتے ہوئے بدن پر خون کی دھاریاں ابل پڑیں گی ...... جیسے برساتی نالوں میں پانی دوڑنے لگے۔ کاش یہ بربا کی رات لمبی ہو جائے اور کام نمٹ جائے اور پو پھٹتے پھٹتے اسے آزادی مل جائے ...... اور وہ اپنے بالم کے لئے پیتل کے چمکتے ہوئے پیالے میں ٹھنڈا پانی، بیسن کی روٹی، بھنی ہوئی مرچ اور پیاز کی پوٹ لے جائے اور اپنے آنچل سے اس کے ماتھے پر چمکتے ہوئے موتی رول لے ...... کلیا کی آواز جیسے ہچکیوں میں بدل گئی۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اب صرف گھوڑا ہنہنا رہا تھا ...... اور رات کا دل دھڑک رہا تھا۔

یکا یک کرار خاں کی آواز گونجی تو رات کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی: "ڈاکٹر صاحب جلدی کیجیے، سکینہ بی بی کا جی بہت کھراب ہے۔ جلدی جلدی ......" وہ ہانپ رہا تھا، چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ جاوید کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اس کے کانوں میں اب تک بربا کا گیت گونج رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سینہ چاک ہے اور سر بلند چھتنار پیڑ کے آدھ کھنچتے ہوئے ہرے پتوں سے اوس، بوند بوند اس کے دل میں ٹپک رہی ہے ... برف جیسی بوند ٹپکتی اور دل میں ٹھنڈی آگ سی بھڑک اٹھتی ..... رگ رگ میں ٹھنڈی چنگاریاں دوڑ جاتیں۔ احساس کے اس بھنور سے نکلنے میں خاصی دیر لگی۔ "کیا ہوا

سکینہ بی بی کو؟" تھوڑی دیر بعد دونوں لپکتے ہوئے حویلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مسجد کے سامنے سے گزرتے ہوئے کرار خاں اور جاوید دونوں نے ایک ساتھ دائیں ہاتھ پر دربار کی طرف دیکھا جہاں ہنڈا جل رہا تھا اور طبلوں کی تھاپ گونج رہی تھی۔ گلی کے اندھیرے میں قدم رکھتے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"شیطان کے گھر میں شیطان ہی مہمان ہوتا ہے!"

"کون شیطان؟"

"وہ شیطان .... ڈپٹی کا جنا .... خبیث .... فخرالدین" کرار خاں نے زور سے تھوک دیا۔

"کون فخرالدین بھئی؟" جاوید نے گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی ... جو دربار کا داماد بنے گا۔ نہیں، ڈاکٹر بابو، اب نہیں بچیں گی سکینہ بی بی!"

"کیا کہہ رہے ہو کرار خاں۔" جاوید نے ڈانٹا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں ڈاکٹر .... وہ بکری ہے جسے بھرے چھری رستے حلال کیا جا رہا ہے!" حویلی کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے کرار خاں نے گمچھے سے آنکھیں پونچھیں۔

جاوید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "کرار خاں تمہاری سکینہ بی بی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

وہی آسیبی اندھیرے، وہی خاموش اور سازش کرتے ہوئے ستون، وہی ویران آنگن .... وہی ناک پر رکھے ہوئے آنچل اور، لالٹین کی روشنی میں چمکتی، بجھتی آنکھیں .... اور سب آنگنوں سے گزر کر پچھواڑے کا وہ چھوٹا سا گھٹا ہوا اکیلا آنگن جس کے کمرے کی کھڑکی پر لالٹین کی لو بھڑک رہی تھی۔ بوڑھی ماما چلمن اٹھا کر کمرے سے نکلی اور بیچ آنگن میں کھڑی ہو کر دعا کے لئے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔

سکینہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ ململ کی گلابی ساری مسلی ہوئی پنڈلیوں تک چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے گھنے گھونگھریالے بال برف کی طرح سفید شلوکے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی .... شلوکے کے نیچے سے جھانکتی ہوئی گندمی کمر تھوڑی

تھوڑی دیر پر لرزاٹھتی تھی اور ساتھ ہی گھٹی گھٹی سبکیاں۔
جاوید نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ٹھنڈے ریشم جیسے بالوں کے لمس سے انگلیوں میں چنگاریاں سی دوڑنے لگیں۔
"سکینہ، کیسی ہو؟"
سکینہ کا پورا جسم لرزنے لگا۔ تکیے کو اور زیادہ زور سے دبالیا اور سسکیاں گھٹی گھٹی چیخ میں بدل گئیں جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ جاوید آہستہ آہستہ اس کے شانے کو انگلیوں سے تھپتھپاتا رہا اور اس کے ریشمیں بال اس کی انگلیوں سے الجھتے رہے...... تھوڑی دیر میں سبکیاں دبنے لگیں اور جسم کی کپکپی بھی مٹنے لگی۔ جیسے طوفان جنگل کو جھنجھوڑ کر گزر گیا ہو۔
"سکینہ کیا بات ہے؟"
سکینہ نے اچانک زور سے کروٹ لی اور چت لیٹ کر دہکتی ہوئی انگارے جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں اور زرد ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "ڈاکٹر تم جنگل میں مارے مارے کیوں پھرتے ہو؟"
جاوید کا ہاتھ شانے سے ہٹ گیا اور وہ اپنی انگلیوں کو گھورنے لگا جیسے یہ انگلیاں نہ ہوں انگارے ہوں۔ اور اس کے سامنے لڑکی نہ ہو بلکہ آتش دان دہک رہا ہو...... کوئی اپنی انگلیاں انگاروں پر رکھ دے تو......!
جاوید نے مشکل سے آواز پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس کی کنپٹیوں کی ہڈیاں ابھر آئیں، جیسے لوہے کے چنے چبا رہا ہو۔
"تمھیں تکلیف کیا ہے سکینہ؟" یہ کسی آزاد انسان کی آواز تھی، آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی اور لرزاں۔
"تم جنگلوں میں کیوں مارے مارے پھرتے ہو، ڈاکٹر؟" سکینہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے دہرایا۔
"میں جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہوں یہ کس نے کہا تم سے؟" آخر پرندہ دام میں آہی گیا۔
جاوید کی آنکھیں کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ لہراتے ہوئے سیاہ سایوں کے پیچھے سے ستاروں کا

جھرمٹ جھانک رہا تھا۔ یہ ستارے اتنے روشن تو کبھی نظر نہ آئے تھے۔ اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ جنگل کی چٹانوں پر پتھر لڑھک رہے تھے۔ جیسے کوئی چل رہا ہو۔ وہ کھڑا ہوگیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہاں صرف سناٹا تھا۔ "کھڑکی کے باہر کیا ہے ڈاکٹر؟" سکینہ نے دھیرے سے پوچھا۔ اور اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے آنسو پی لئے ..... وہ مسکرائی تو اس کے زرد ہونٹوں پر ایک گلابی سی روشنی دوڑ گئی۔ جاوید کی آنکھیں جھلملا گئیں اور اس نے پھر فرضی فرمائشی کھانسی روکنے کے لئے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"کھڑکی کے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوا بھی نہیں، پتھر بھی نہیں ستارے بھی نہیں۔"

جاوید اس کی بہکی بہکی باتوں سے گھبرا گیا: "سکینہ بتاؤ، تمہیں کیا تکلیف ہے؟" پہلی بار جاوید کی آواز میں وہ گھرج پیدا ہوئی جو اس میں اعتماد پیدا کرتی تھی۔

آنگن سے کانپتی ہوئی صدا سنائی دی: "یا اللہ میری بچی پر رحم کر!"

"تکلیف؟" سکینہ نے آنکھیں بند کرلیں اور اس کی بڑی بڑی کالی اور نم پلکوں کا سنہرا سایہ اس کے نمکین زرد گالوں پر پڑنے لگا۔ یکایک ڈاکٹر کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم پر ہزاروں آنکھیں کھل گئی ہیں، جن میں حیرت، التجا اور پشیمانی کے ہزاروں چراغ جھلملا رہے ہیں۔

اس کا دم گھٹنے لگا۔ جاوید نے گھٹن سے بچنے کے لئے سکینہ کی کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ نبض تیز چل رہی تھی اور کلائی جل رہی تھی۔ دیکھنے میں وہ کتنی ٹھنڈی معلوم ہوتی تھی جیسے اوس میں بھیگی ہوئی ڈالی اور چھوؤ تو آگ!

"میری تکلیف یہ ہے ڈاکٹر کہ میں ہوا نہیں ہوں!"

"کیا کہا، ہوا؟"

"ہاں تم ابھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے نا۔ جنگل میں تمہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ مگر مجھے بہت کچھ نظر آتا ہے، کتنے بہت سے گھنے درخت ہیں۔ چاہو پھل نوچ لو، چاہو شاخیں توڑ لو، اور جی میں آئے تو ......"

جاوید نے اس کی بند آنکھوں اور ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا اور لرز گیا ......

"اور جی میں آئے تو درخت کو کاٹ کر گرا دو ....." سکینہ نے تڑپ کر کہا۔

"اچھا!"

"اچھا کیا ڈاکٹر ..... ان درختوں میں ہوا چیخ رہی ہے۔ ..... بولو کیا تم اس ہوا کو مٹھی میں پکڑ سکتے ہو؟ تلوار سے کاٹ سکتے ہو ...."

سکینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اب ان کی سرخی کم ہو گئی تھی اور ان میں خشک چمک پیدا ہو گئی تھی۔ "چاہو تو تلوار سے میرے دو ٹکڑے کر سکتے ہو مگر ہوا ....."

"تمہیں تکلیف کیا ہے سکینہ ....." آواز کی کھرج پھر غائب تھی۔

"تکلیف، تکلیف، تکلیف ...... میں درخت ہوں مگر ہوا بننا چاہتی ہوں۔ درباری باغ کے درختوں میں ہر سال پھل آتے ہیں۔ کچھ پھل کھائے جاتے ہیں۔ کچھ بک جاتے ہیں ... درخت بھی بکتے ہیں ...... لیکن ہوا کو نہ بیچ سکتے ہیں نہ خرید سکتے ہیں ....."

"میں سمجھا نہیں!"

"نہیں سمجھے تو جاؤ ...... مگر میں پوچھتی ہوں پھر جنگلوں میں کیوں مارے مارے پھرتے ہو"؟

"سکینہ ....." سکینہ نے جواب میں اپنی آنکھیں دو تین بار جھپکائیں اور نگاہیں چھت پر گاڑ دیں۔ آنکھوں کی چمک میں نمی سی کانپنے لگی۔

"تم مجھے اچھا نہیں کر سکتے .... میں تو یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر رہی تھی، تم نہ جانے کہاں سے آ گئے اور مجھے لگا تم مجھے اچھا کر دو گے۔ مجھے لگا کہ میرے پر نکل آئے ہیں۔ میں اڑ کر بہت دور جا سکتی ہوں .... جنگلوں اور پہاڑوں سے آگے، بادلوں کے اوپر ستاروں سے آگے، ...... لیکن نہیں .... میں تو درخت ہوں۔ بک جاؤں گی۔ کٹ جاؤں گی اور بس۔ یہ حویلی ہے میری قبر ...... جاؤ ڈاکٹر، تم جاؤ ...... میں تو جاہل اور بیوقوف دیہاتن ہوں، مجھے اپنے جنوں بھوتوں سے کھیلنے دو ....."

"سکینہ ..... یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔ لیکن ناامید کیوں ہوتی ہو۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ دربار کی اور لڑکیوں سے الگ ..... کمزور ضرور ہو مگر وقت آنے پر طاقت بھی آ جائے گی ....."

سکینہ پھر اوندھے منہ لیٹ گئی اور اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔
جاوید باہر نکلا اور ایک لمحے کو آنگن میں رکا۔
"ڈاکٹر بابو کیا حال ہے میری بچی کا؟" بوڑھی آیا سسکی۔
"ٹھیک ہے۔ دوا بھجوا رہا ہوں۔"
اس نے پلٹ کر سکینہ کے کمرے کی طرف دیکھا اور تیزی سے دوسرے آسیبی آنگنوں کی طرف نکل گیا۔ ایک ستارہ ٹوٹا اور جنگل کی ہواؤں میں کھو گیا۔

13

جاوید سارا دن ہسپتال سے باہر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں مریضوں کے ہاں دوڑتا رہا تھا۔ آخر شام ہوتے دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد اس نے گاؤں کا رُخ کیا۔ تو اسے لگا کہ وہ دن بھر بادلوں سے اوپر ہواؤں میں اڑتا رہا تھا، اور اب اسے محسوس ہوا جیسے اب اچانک اس کے پر ٹوٹ گئے ہیں اور وہ ایک بھاری پتھر کی طرح خلا میں گر رہا ہے۔
لمبی گھاس ندی کے کنارے سرسرا رہی تھی۔ ندی کی لہریں خنک ہوا میں گنگنا رہی تھیں... "کیا میں لمبی گھاس کی ان خاموش وادیوں میں دفن ہو جاؤں گا؟" وہ اپنے وہم سے ڈر گیا۔ اس کے کانوں میں بار بار کوئی آہستہ سے پھونک جاتا۔
"خواب دیکھتے رہو دیکھتے رہو .... نیند سے چونکو گے تو خواب کی لہریں کہیں کھو جائیں گی۔ دیکھتے ہیں تم اپنی شیشے کی ناؤ چٹانوں سے بھرے ہوئے دریا میں کیسے کھیتے ہو۔"

"بہت وہمی ہو گیا ہوں۔ زمانے سے ہارے ہوئے بڈھوں کی طرح سوچنے لگا ہوں!" وہ جھنجھلا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک دہکتا ہوا الاؤ ہے اور اوپر سے اولے برس رہے ہیں۔ اولوں کی بارش جتنی تیز ہوتی جاتی ہے الاؤ کے شعلے اور بھڑکتے ہیں۔ وہ کانپ گیا۔ اس کے جسم کی کپکپی گھوڑے کے جسم میں دوڑ گئی۔

"بچہ مر گیا تو ......" یکایک اس کی نگاہوں میں ڈھائی سال کا ایک بچہ ہمکنے لگا۔ بچہ مسکرایا پھر اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ زردی پر سبز پانی سا پھر گیا جس پر آہستہ آہستہ نیلاہٹ چھا گئی۔ اس کی ماں مٹی کی دیوار کے پاس پھوس کے چھپر کے نیچے کھڑی دیکھ رہی ہے ... اس کے ہاتھ گوبر سے سنے ہوئے ہیں۔ وہ گوبر بھرے ہاتھ سے ساری کا آنچل اٹھا کر آنکھوں پر رکھ لیتی ہے۔ آنچل کے اٹھتے ہی اس کے ڈھیلے سینے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا ہے .... تین بچے پہلے ہی مر چکے ہیں اور یہ چوتھا بچہ ہے وہ ہر سال خون پلا پلا کر نو مہینے اپنی کوکھ میں ایک جان کی پرورش کرتی رہی ہے۔ پھر ہیضے کی آندھی آئی تو اس کی گود سے تین بچے چھین لے گئی۔ اور اب یہ چوتھا .... اس کا رنگ زرد پڑا پھر کائی کی طرح سبز اور پھر ہونٹ نیلے پڑ گئے .... ماں کے ہاتھ گوبر میں سنے ہوئے ہیں .... درختوں میں ہوا چیخ رہی ہے۔ پھوس کا چھپر سانس لے رہا ہے .... اور دیواریں کانپ رہی ہیں ...... اب گریں، اب گریں .... دیواروں پر چیچک کے دانوں کی طرح اوپلے تھپے ہوئے ہیں۔ مگر عورت کے ہاتھ اب تک گوبر میں سنے ہوئے ہیں .... گوبر بھرے ہاتھ سے آنچل میں آنسو جذب کر رہی ہے۔ گوبر اور آنسو .... بچے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ .... ایک سنہری چڑیا اڑ گئی ...... کیوں اڑ گئی .... کس کا قصور تھا .... ماں کیا کرتی .... وہ اوپلے نہ تھاپتی تو کیا کرتی ...... اسے کیا معلوم تھا سانپ اس کے ڈھائی سال کے لال کو ڈس لے گا .... سانپ بچے کی طرف لپکا اور بچہ سانپ کی طرف ..... سانپ تو بچے کو پیار کر کے گھاس میں سرسراتا ہوا نکل گیا مگر بچہ ...... اس کا رنگ زرد پڑا ..... پھر نیلا پڑ گیا .... بچہ مسکرا رہا ہے ..... بازو پھیلا رہا ہے ..... خوشی کے بازو ..... معصومیت کی مسکراہٹ .... میں نہ اس مسکراہٹ کو چوم سکتا ہوں، نہ ان بازوؤں

کو تھام سکتا ہوں! یہ ننھا سا پھول اکیلا آندھی سے لڑ رہا ہے۔ بچہ لپکتا ہے اور سانپ کو کھلونا سمجھ کر اس کے منہ میں انگلی ڈال دیتا ہے اور بڑا آدمی ....

گھر پہنچتے ہی جنگلی نے ایک لفافہ دیا۔ سرکاری دعوت نامہ تھا۔ رات کو کھانا دربار میں کھانا تھا۔ اس نے لفافہ ایک طرف پھینک دیا اور تخت پر لیٹ گیا۔

"میں نہیں جاتا کہیں ....بکواس!"

تھوڑی دیر بعد کونے میں رکھی ہوئی میز پر نظر پڑی۔ روز کی تصویر لیمپ کی زرد روشنی میں مسکرا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ تصویر پھر بھی مسکراتی رہی ....."مسکراتی ہو۔ مسکراؤ۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔ تباہ ہو جاؤنگا۔ لیکن ہار نہیں مانوں گا۔ میں وہ پتھر نہیں ہوں جو پہاڑ کی بلندی سے لڑھکے تو وادی تک پہنچتے پہنچتے ریزہ ریزہ ہو جائے ...."

اچانک جیسے سلے ہوئے ہونٹوں سے مسکراہٹ مٹ گئی۔ آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

اب ہر چیز اسے ڈسنے کو دوڑ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے گرد سے اٹے ہوئے کپڑے اتارے۔ کالی اچکن پہنی اور دربار کی طرف روانہ ہو گیا۔

عبدالجبار اپنی مخصوص کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف تھانیدار بیٹھا تھا اور دوسری طرف ماسٹر شاہ عالم پان چبا رہا تھا۔ مولوی اور پرنسپل دونوں آنکھیں پھاڑے سرکار کی طرف دیکھ رہے تھے ...... مہمان سے اس کا تعارف ہوا۔ فخرالدین نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کی عمر کوئی تیس بتیس کے لگ بھگ ہوگی ... پیشانی چوڑی اور گورا رنگ۔ اس کے لمبے بال انگریزی فیشن کے مطابق کٹے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے عیار چہرے پر کچھ عجیب سی یتیمی چھا گئی تھی۔ اس کی لمبی ٹھڈی جوتے کی نوک کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ خنجر نما باریک مونچھیں بھوری تھیں اور ان میں وہی چمک تھی جو تیل میں بھیگے ہوئے بالوں میں تھی۔ وہ سفید کرتے، پاجامے اور سلیم شاہی جوتوں میں بیٹھا اپنی انگلی کی انگوٹھی سے کھیل رہا تھا۔ کپڑوں سے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے اپنے جانتے آہستہ مگر دراصل پھٹی پھٹی سی آواز میں کہا۔ "آپ سے تو میں خاص طور پر ملنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ سنا ہے آپ کے بارے میں!" جاوید کو فوراً اس سے چڑ سی

ہو گئی۔ کتنی بے جان آواز ہے۔ "اتنی جلدی آپ نے اتنا زیادہ سُن لیا؟" جاوید نے کہا اور فخرالدین نے جواب میں دانت نکال دیے۔ ان دانتوں پر پان، تمباکو کا رنگ جما ہوا تھا۔ جاوید نے اس کے دانتوں کی سیاہ چمک کو دیکھا تو جیسے کسی نے اس سے سرگوشی کی: "اس آدمی کے دل کا بھی یہی رنگ ہے۔" اسے اپنی جلد بازی پر حیرت ہوئی۔ وہ اتنی جلدی کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے کے خلاف تھا۔

اس اثنا میں عبدالجبار اپنی نیم وا آنکھوں سے دونوں کا جائزہ لے رہا تھا... "بھئی تم دونوں نوجوان ہوئی روشنی کے، خوب چھنے گی۔"

"جی آپ نے ٹھیک کہا ماموں جان، ویری ویل سڈ۔" فخرالدین نے داد دی۔

"کچھ شکار وکار ہو جائے۔ کیوں نریش..... ماسٹر صاحب؟"

"ضرور ضرور ...." پوری محفل نے اپنی غوغوں سے کمرے کی فضا میں ایک عجیب گونج پیدا کر دی۔

"کیوں ڈاکٹر...؟" عبدالجبار نے آنکھیں کھولیں جیسے تو ان کا خمار دور ہو گیا۔

"دیکھتے ہیں، ہسپتال اور مریضوں سے ...."

"ہسپتال .... مریض .... ارے یار ہا ہا ہا!" فخرالدین نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

جاوید کو اس قہقہے میں اپنی، اپنے پیشے اور جذبات کی بڑی ہتک محسوس ہوئی۔

کرن سنگھ نے خاکی نیکر سے جھانکتے ہوئے روئیں بھرے تنگے گھٹنوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر کہا:

"شکار کا بندوبست تو ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے صاحب اور میم صاحب بھی .... جیسا حضور مناسب سمجھیں۔ بڑے جنگل میں ان دنوں ہرن خوب چوکڑیاں بھر رہے ہیں۔ .... ڈاکٹر جنگل بہت سندر ہے۔ اتنی گھنی اور ہری بھری جھاڑیاں اور کہیں نہیں ہوتیں۔ خرگوش اور تیتر بھی ملتے ہیں۔" اس نے تیزی سے سیٹی بجائی۔

عبدالجبار نے اپنے دونوں موٹے موٹے ہاتھ اٹھا کر تعریفاً کرن سنگھ کو دیکھا۔

"یہ ٹھیک ہے ۔ صاحب کو بھی بلا لیا جائے ۔ وہ کب سے کہہ رہے ہیں کمبخت کا کیا نشانہ ہے ...."

"جی ہاں حضورن، سُنا ہے صاحب اندھیرے میں ہوا کی سرسراہٹ سُن کر لبلبی دبا دیتا ہے اور کیا مجال کہ شکار سانس بھی لے پائے:" مولوی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"سانس تو سانس پانی بھی نہیں مانگتا .... بیچارا!" نریش نے ہنس کر چوٹ کی۔

مولوی کو خوب معلوم تھا کہ لوکس اور اس کی میم نے کبھی بھی کوئی شکار نہیں کیا تھا.... ہمیشہ دوسروں کی کاٹی ہوئی فصل موٹر میں لاد کر لے جاتے تھے۔ مولوی کھسیا گیا۔

"واہ مولوی صاحب اسے کہتے ہیں بے پر کی .... لوکس نے آج تک ایک شکار بھی ....." پھر اس نے کنکھیوں سے جاوید کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیوں ڈاکٹر تمہارا نشانہ کیسا ہے؟ بھاگتے ہوئے ہرن کو گولی مار کر گرا سکتے ہو؟"

"کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ لیکن میرا نشانہ برا نہیں۔ ایک مرتبہ جھپٹتے ہوئے ریچھ کو ٹھنڈا کر دیا تھا .... اور اب بھی ...."

"اور اب بھی ....." عبدالجبار نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دہرایا۔

"جی ہاں اب بھی اگر ریچھ یا اور کوئی درندہ جھپٹے تو..."

"تو؟"

"تو اس کے سینے میں گولی ٹھنڈی کر دوں گا ...." جاوید نے دانت پیس کر کہا۔

عبدالجبار مسکرایا اور جاوید قالین پر چمکتے ہوئے سنہرے ہرن کو دیکھنے لگا جس کے سینگوں پر اگربتی کا ہلکا دھواں بھاپ کی طرح تیر رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد پورا قافلہ دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ عبدالجبار مسند کے سہارے بیٹھا بند ہوتی اور کھلتی ہوئی آنکھوں سے کہیں دور دیکھ رہا تھا اور کسی بھیانک سوچ میں غرق تھا۔ کبھی گالوں میں تھرکن ہوتی۔ کبھی چہرے کی سیاہی میں چمک پیدا ہو جاتی اور کبھی آنکھوں سے سیاہ بھاپ تہہ در تہہ اٹھتی اور پورے چہرے پر پھیل جاتی اور وہ فخرالدین کی پلیٹ کی طرف دیکھتا جو جاوید کے پہلو میں بیٹھا اسے ہرن کے کباب کھانے کی دعوت دے رہا تھا ......

"یار ہرن کا گوشت کتنا خستہ ہوتا ہے اور چڑیوں میں ہریل کا .... کیوں ڈاکٹر؟"
"شاید ...." جاوید نے ایک کباب لیتے ہوئے کہا۔
اُسے اس ماحول میں گھٹن ہو رہی تھی اور یہ چٹپٹا اور لذیذ کھانا بھی حلق سے اترنا مشکل تھا۔

"یار میں اس جنگلی علاقے اور ہری بھری وادی کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"
"ضرور، ضرور،" ماسٹر شاہ عالم اور نزلیش نے بیک آواز کہا۔
"فخرالدین میاں، یہ وادی سونا ہے سونا، شیشم اور دیودار کے جنگل ہیں .... ایک ایک درخت، ایک ایک پتہ سونا ہے۔ اور گنے کی جیسی فصل یہاں ہوتی ہے علاقے بھر میں کہیں نہیں ہوتی۔ ڈاک گھر، ریلوے اسٹیشن، تھانہ ...... کیا نہیں ہے۔ بس ایک چینی مل کی کسر ہے .... کیوں کرن سنگھ؟"
"بالکل حضور، آپ کا اقبال قائم رہے چینی مل بھی کھل جائے گا ...... پھر اس سڑک پر اتنی تیل پیس ہوگی کہ شیر شاہ کی کلکتہ سے پشاور والی سڑک بھی منہ تکتی رہ جائے ...... ایسی مات ...... ایسی مات ......"
"ہمیشہ شطرنج کی چال میں بات کرتے ہو .... مات سے مطلب؟"
کرن سنگھ نے مرچوں والی چھاچھ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "شطرنج اقبال والوں کا کھیل ہے سرکار ...... پہلے بادشاہ کھیلتے تھے اب انگریز بہادر کے سائے تلے وہ لوگ کھیلتے ہیں جن کے آگے بادشاہوں کے پر جلتے ہیں" کرن سنگھ کا منہ بھی چل رہا تھا اور زبان بھی۔
عبدالجبار نے زور سے قہقہہ بلند کیا۔
"ڈاکٹر مجھ سے دوستی کرو گے؟" فخرالدین نے آہستہ سے کہنی مارتے ہوئے سازشی لہجے میں جاوید سے پوچھا۔
"ضرور، میں دشمن کے سوا سب سے دوستی کرتا ہوں،" جاوید نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔
"اچھا" فخرالدین نے ٹھنڈی سانس لی تو عبدالجبار گھبرا کر چونک گیا۔

"بھئی یہ کیا سرگوشی ہو رہی ہے؟ ہم کوئی ایسا بوڑھے بھی نہیں ہیں کہ تم لوگوں کی رنگین باتیں سننے سے بھی رہ جائیں!" اس نے لہجے کو بے وجہ معنی خیز بنا دیا اور نرلیش سے بولا۔ "ڈاک بابو کیا بات ہے آج منہ میں گھنگھنیاں کیوں بھر رکھی ہے......"

"جی نہیں۔ کوفتے ہیں" نرلیش چُوکنے والا نہیں تھا۔ کوفتہ بے خیال گلے میں پھنسا تو آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ کوفتے کاہے کے ہیں؟"

نرلیش ہکا بکا رہ گیا۔ گھبرا کر سرکار کا منہ دیکھنے لگا۔ "جی جی......یہی ہرن کے ہوں گے۔"

"واہ۔" عبدالجبار نے نعرہ بلند کیا۔ "ڈاک بابو ہرن اور بکری میں بہت فرق ہے......ریل کے ٹکٹ اور ڈاک کی مہر کی طرح۔"

"جی ہاں حضور شیر اور بکری میں بھی بڑا فرق ہے......" نرلیش نے ہنس کر چوٹ کی۔

"حضور میں اور ڈاک بابو میں بھی بڑا فرق ہے......شیر اور بکری تو......" کرن سنگھ نے نرلیش کو ذلیل کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی!" مولوی نے لقمہ دے کر دھار پر سان ڈال دی۔

عبدالجبار کا پہاڑ سا جسم قہقہے کے تلاطم سے ہلنے لگا......سب ہنس رہے تھے۔ صرف جاوید اور فخرالدین اپنے اپنے خیال میں کھوئے کھوئے خاموش تھے۔ نرلیش ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ گھبرایا ہوا سا ضد ملنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر کھانے کے بعد میرے کمرے میں چلو گے؟"

"جی نہیں۔ مجھے افسوس ہے لیکن مجھے جانا ہے۔ بوا بیمار ہیں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے!"

کھانے کے بعد جاوید سیدھا گھر چلا آیا۔ اس نے پان بھی نہیں کھایا اور سگریٹ بھی نہیں پی۔ پھر عبدالجبار کے ولائتی کتوں نے بھونک کر خدا حافظ کہا اور اسے مسجد کے مینار اندھیرے میں بہت لمبے معلوم ہوئے۔ جیسے کوئی لمبے ہاتھوں سے ستارے توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس کو اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ نریش اسکے برابر سر جھکائے چل رہا تھا۔۔۔
"آدمی کو کتنی ذلت اٹھانی پڑتی ہے جینے کی خاطر!" نریش نے اتنے ہولے سے کہا کہ جاوید کو یہ آواز خود اپنے دل سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"صرف ذلیل لوگ دوسروں کو ذلیل کرتے ہیں۔ جو لوگ کیچڑ میں کھڑے ہوئے ہیں وہی دوسروں پر کیچڑ پھینکتے ہیں!" جاوید نے اس کا شانہ دبایا۔
"کیا کہا ڈاکٹر۔" نریش کو اپنی آواز اتنی تیز لگی کہ وہ خود ہی چونک گیا۔
"کچھ نہیں نریش، چلو!" جاوید کی آواز بہت بھاری تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ ہسپتال کی طرف چلتے رہے کوارٹر کے برآمدے میں لالٹین کے گرد ایک انتھک پتنگا اڑ رہا تھا۔ کئی پتنگے جل کر زینے پر ٹھنڈے ہو گئے تھے، جاوید اور نریش نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نریش ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور جاوید کی بڑھائی ہوئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "ڈاکٹر ...... آپ بڑے شہر میں رہے ہیں، دنیا دیکھی ہے۔ میں جنم جنم سے اس کنوئیں میں بند ہوں۔ یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں بھئی بھاگتے تو بزدل ہیں۔" جاوید نے کہا۔
"اگر ظلم و ستم کا شکار کوئی بے گناہ قیدی جیل کی دیوار پھاند کر نکل بھاگے تو کیا آپ ......"
"نہیں وہ بزدل نہیں!" جاوید نے کش لے کر کہا "لیکن قید کی بات دوسری ہے۔ تم تو اس کو کنواں کہہ رہے ہو ......"
"میں جاہل ہوں۔ پڑھنے لکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ بڑے بڑے خواب تھے۔ میرے مجبور ماں باپ میرے خوابوں کو سنتے، سر دھنتے ...... ماں روتی اور ایک اداس گیت گاتی اور باپ بیلوں کو گالی دیتا اور کھیتوں کی راہ لیتا۔ مگر میں خواب دیکھتا رہتا ...... نہ چاند ملا، نہ سورج ...... روز خطوں پر مہر لگاتا ہوں اور بس، کاش میں اس اندھیرے سے نکل سکتا ......"
نریش کی سانس پھول رہی تھی۔ آخر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ جاوید جھلملاتی ہوئی دھندلی روشنی میں نریش کو غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کو اچانک نریش

کی ناک بڑی تیکھی، پیشانی بہت اونچی، بھویں گھنی اور آنکھیں انگاروں کیطرح دہکتی ہوئی نظر آئیں۔ فضا میں روشنی سی تیر گئی۔

"یہ آدمی اندھیرے سے نکلنا چاہتا ہے،" جاوید نے سوچا اور بولا: "زندگی میں روشنی چاہتے ہو تو اندھیرے سے لڑو،" اسے یاد آیا کہ اس نے یہ للکارتا ہوا رجزیہ فقرہ کسی کتاب میں پڑھا تھا یا طالبعلمی کے زمانے میں کسی دوست نے اس سے یہ کہا تھا۔

"ڈاکٹر اندھیرے سے کیا لڑوں۔ روشنی کے بغیر آدمی کیسے لڑے؟"

"روشنی آدمی کے دل میں ہوتی ہے۔ آدمی کے ضمیر میں۔" پھر اس کو احساس ہوا کہ اس کے منہ سے کوئی کتابی نسخہ نکل گیا ہے۔

جاوید نے کھانس کر گلا صاف کیا اور جلتی ہوئی سگریٹ گھاس میں پھینک دی۔ گھاس میں چنگاری بجھتی رہی اور وہ اسے دیکھتے ہوئے بھاری آواز میں بولا:

"نریش ...... تم بہت جوشیلے نوجوان ہو۔ تمہارے دماغ میں بہت سے سوال گونجتے ہیں۔ میرے دماغ میں بھی گونجتے ہیں۔ مگر جواب تمہارے پاس ہے نہ میرے پاس۔"

"تمہارے پاس بھی نہیں! ...... مگر تم نے تو بہت کتابیں پڑھی ہیں ......"

"نہیں میں نے بہت کم کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے بہت سی موٹی موٹی کتابیں پڑھی ہیں لیکن وہ سب کی سب انسان کے جسم کی کہانی کہتی ہیں۔ ایک آدھ کتاب دوسری قسم کی بھی پڑھی ہے۔ میری ایک دوست تھی ...... بنگالی لڑکی ...... وہ ان کتابوں پر جان چھڑکتی تھی اور خیالی اور ہوائی باتیں کرتی تھی ...... میں نے ایک آدھ کتاب پڑھی ...... لیکن وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ روح کے زخموں کا علاج وہاں بھی نہیں ملا۔ بڑے بڑے لفظ ...... لفظ کیا چٹانیں ...... گردن میں لٹکا لو تو گردن ٹوٹ جائے ...... لیکن وہ! ، چٹانوں سے کھیلنا جانتی تھی۔ انہیں اپنی پتلی اور نازک گردن میں یوں پہنے رہتی تھی جیسے یہ جوہی کی کلیاں ہوں ...... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کتابوں میں روشنی نہیں ہوتی ...... یہ جھوٹ ہے۔"

نریش ایک دم سے کھڑا ہو گیا "ڈاکٹر ......" اس کی آواز تھر تھرا رہی تھی، "تو روشنی کہاں ملے گی ...... کیا میں ہمیشہ اندھیرے میں بھٹکتا رہوں گا۔ یہاں سے نکلنا چاہتا

ہوں۔۔۔۔ میں کسی بڑے شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔ وہاں روشنی ہوتی ہوگی ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔ روشنی۔۔۔۔۔"

جاوید نے یکایک اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ نریش ڈر گیا اور جنگلی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔۔۔۔

"ارے۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔۔۔ میں سمجھا کہ گھوڑا ہنہنا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ دھت سسرا!" اس نے ہوا میں ہاتھ مار کر ایک خیالی مچھر کو مسل دیا اور ناک کھجاتے ہوئے اب کے فرش پر یوں ہی لمبا ہو گیا۔

"میرے بھائی، بڑے شہر میں بھی اندھیرا ہے۔ آدمی جہاں نہیں رہتا وہاں اسے روشنی نظر آتی ہے۔ ان ستاروں کو دیکھو دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں نا۔ کون جانے وہاں بھی کوئی نریش، کوئی جاوید بیٹھا ہو۔۔۔۔۔ اور ان کو وہاں سے ہماری یہ اندھیری دنیا ایک چنگاری نظر آ رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ سوچ رہا ہو۔۔۔۔۔"

"آپ کی باتوں سے تو میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا ڈاکٹر، میری زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔۔۔۔ یوں ہی دکھ درد بھرے خطوں پر مہر لگاتا رہوں گا، کبھی کبھی خوشبودار خطوں کو سونگھوں گا اور ایک دربار سے دوسرے دربار کی طرف بھیجتا رہوں گا۔ میری اپنی زندگی میں کوئی خوشبو نہیں ہوگی۔ گالیاں سنوں گا اور کباب کھاؤں گا۔ اور ایک دن میری کہانی ختم ہو جائے گی۔ دربار کی کہانی چلتی رہے گی۔ مجھے شکری ندی کے کنارے جلا دیا جائے گا، میری راکھ میں گدھے اور گنجے کتے لوٹ لگائیں گے۔۔۔۔۔۔" نریش نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے برآمدے سے کودا اور لپکتا ہوا تاڑوں اور کھجوروں کی پرچھائیوں میں غائب ہو گیا۔

کلیا کی سرلی بھی سو گئی تھی۔ صرف ہوا دبے پاؤں چل رہی تھی اور درخت سرگوشیاں کر رہے تھے۔ دور کہیں جھینگر ٹرا رہے تھے اور آسمان میں ان گنت زخم دہک رہے تھے۔

جاوید آہستہ سے اٹھا اور جنگلی کے اوپر سے پھلانگتا ہوا اندر چلا گیا۔ صحن کی کڑی سے لٹکی ہوئی لالٹین دم توڑ رہی تھی۔

"ہائے!" ایک ٹھنڈی سانس ابھری۔

جاوید دوڑا ہوا بوا کے کمرے میں گیا۔ جانماز ٹیڑھی بچھی ہوئی تھی اور بوا سجدے میں پڑی تھیں۔ اس نے جا کر بوا کو چھوا۔ بوا کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔

اس نے جلدی سے بوا کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور دروازے سے صحن کی طرف دیکھا۔ لالٹین بجھ چکی تھی اور اندھیرا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اسنے بوا کو گود میں اٹھایا اور چارپائی پر لٹا دیا اور سر سے پاؤں تک سفید دلائی اڑھا دی۔ اور ان کے قدموں پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگا۔

"آج میں کتنا اکیلا ہو گیا بوا! درخت کی سوکھی ہوئی آخری پتی بھی جھڑ گئی آج!"

14

ایک چھوٹا سا پتھر ٹھوکر سے اڑا اور پہاڑی کی بلندیوں سے لڑھکتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا پھر درختوں کے درمیان ایک سایہ ابھرا اور ڈھلان پر کھڑا ہو گیا۔ گاؤں جنگل کے دامن میں انگڑائیاں لیتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کیسی انگڑائیاں تھیں!۔ موذن کی درد بھری آواز دیر ہوئی وادی میں گونج کر سو چکی تھی۔ مسجد کے مینار دو فریادی ہاتھوں کی طرح گھنے درختوں کے درمیان اٹھے ہوئے تھے۔ تاڑ اور کھجور کے بڑے بڑے پیڑوں کے درمیان کوئی چیز موم کے کھلونے کی طرح جھانک رہی تھی۔ یہ ہسپتال تھا۔ ریل شکری ندی کے پل پر سے گذر چکی تھی۔ ۔۔۔ سایہ ایک قدم اور آگے اترا۔ سوئے ہوئے آبر

میں ہزاروں سرخ بجلیاں تڑپ کر بجھ گئیں اور ایک سرخ گیند دہکتی اور پگھلتی ہوئی زمین کے کوکھ سے اُبھری اور ایک بڑا سا آئینہ بن گئی۔ اتنا بڑا آئینہ کہ اس میں روشنی کی پوری ایک جھیل کسمسا گئی۔ جنگل کے پیچھے سے ایک سرخ تھالی ناچتی ہوئی اُبھری جس میں سے نارنجی رنگ کی آگ چھلک چھلک کر ہوا کے پروں پر اڑتی ہوئی آئی اور انگڑائیاں لیتے ہوئے گاؤں، جنگل، چراگاہ پر برسی اور پوری وادی کو جگمگا گئی۔ ڈھور ڈنگروں اور بھیڑوں کی گھنٹیوں کا نغمہ جل ترنگ کی طرح گنگناتا ہوا پہاڑیوں سے گھرے ہوئے جنگل کی گہرائیوں میں کھو گیا۔

سایہ مٹ گیا اور جاوید نے گرم گرم سورج کی کرنوں کو اپنے چہرے پر لوٹتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے اپنی سفید پتلون کی جیب سے دونوں ہاتھ نکالے اور تیز تیز قدموں سے ڈھلان سے اترتے ہوئے وادی میں آ گیا۔ ببول اور گولر کے پیڑوں سے گھرے ہوئے قبرستان میں ایک نئی قبر نے اس کے قدم تھام لئے۔ اس کے سرہانے ایک نیا گھڑا اوندھا رکھا تھا۔ بوا کی قبر پر جاوید نے پچھلے دن بیلے اور گیندے کے جو پھول ڈالے تھے اب تک اسی طرح تروتازہ نظر آ رہے تھے۔ قبر کے کنارے اسے جانوروں کے پنجوں کے نشان نظر آئے۔ اس نے جھک کر مٹی برابر کی۔

"بوا میں کتنا اکیلا ہوں ـــ تم بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں!"

املی کے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ایک گوریا اڑتی ہوئی آئی اور بوا کی قبر پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد دوسری چڑیا بھی اسی قبر پر پر سمیٹ کر اتر گئی۔ تین چار کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے اوپر سے گذرے اور ایک چیل اڑتی ہوئی نظر آئی جس کے پنجوں میں ایک چڑیا پھنسی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ قبر پر بیٹھی ہوئی چڑیوں نے اوپر دیکھا اور پھر سے اڑ کر املی کی ننھی ننھی پتیوں میں جا چھپیں۔

"چیل!" جاوید دم بخود چیل کو دیکھتا رہا۔ وہ اب اپنے پنجوں پر بار بار چونچ مار رہی تھی ـــ قبرستان میں چڑیوں نے جو زندگی پیدا کر دی تھی اچانک ختم ہو گئی اور جاوید سر جھکائے ہوئے قبرستان سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

ایک فٹن تیزی سے اس کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ لیکن چند ہی قدم جا کر فٹن رک گئی ایک نوجوان کود کر اس سے اترا۔ جسم پر سفید قمیص اور پتلون اور ہاتھ میں ہنٹر۔

"ڈاکٹر کہاں سے آ رہے ہو؟ سویرے سویرے سیر ہو رہی ہے۔ ایں؟" فخرالدین نے اپنے ہنٹر کو کڑکاتے ہوئے کہا۔ اس کے پورے جسم میں ایک بجلی سی تڑپ رہی تھی۔ آنکھوں سے عقابی چمک جھانک رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔"

"آؤ چلو فٹن میں بیٹھو، سیر کریں!"

"نہیں، ہسپتال پہنچنا ہے! پھر کبھی۔"

"ارے ہسپتال میں ابھی دیر ہے۔" فخرالدین نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور اس کو فٹن کی طرف کھینچا۔

"اچھا تو آپ فٹن چلتی کر دیجئے۔ آیئے یہیں پاس ہی شیشم کے جنگل میں ٹہلتے ہیں۔"

دونوں تھوڑی دور جا کر درختوں کے ایک جھنڈ میں سرخ رنگ کی ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ فخرالدین کا کتا بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بہت غمزدہ معلوم ہوتے ہو۔ پھوپی تمہیں بہت چاہتی تھیں؟"

"وہ میری پھوپی نہیں ماں تھیں!"

فخرالدین ہنٹر سے بجری جیسی سرخ مٹی کریدنے لگا، پھر یکایک زور سے اپنا ہنٹر دور پھینکا۔ "ٹائگر .... شو۔" کتا بے تحاشا ہنٹر کے پیچھے بھاگا۔

فخرالدین نے جیب سے چھوٹی سی سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ دونوں نے ایک ایک سگریٹ جلائی۔ فخرالدین نے چاندی کی ڈبیہ زور سے کتے کی طرف پھینکی۔ کتے نے ڈبیہ زمین پر گرنے سے پہلے ہی منہ میں پکڑ لی۔

"سور!" فخرالدین نے ہنس کر کہا۔ "دیکھا ڈاکٹر کتنا حرامی ہے یہ؟"

"دیکھا!" جاوید نے دھواں پیتے ہوئے بڑی نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر تم میرے دوست نہیں بنو گے تو اس جنگل میں اکتا کر مر جاؤں گا؟"

"دوست؟ مگر کیوں؟"

فخرالدین کا منہ کھلا رہ گیا۔۔۔ سگریٹ کا دھواں پیچ کھاتا ہوا اس کے منہ سے نکلا اور چٹان پر اگی ہوئی لمبی لمبی گھاس پر تیرنے لگا۔

"ایک بات پوچھوں ؟" فخرالدین نے اپنے ہونٹوں کو چوستے ہوئے پوچھا اور بڑی شرارت اور سازش بھری معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

جاوید کا دم گھٹنے لگا جیسے وہ چور ہو اور کوئی اس سے جرم کا اقرار کرا رہا ہو۔

"ڈاکٹر .... سچ بتانا .... بتاؤ گے نا؟" اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ دبایا۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک زہر بھری مسکراہٹ پر تولتی نظر آئی۔ "تم کو دیکھتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگتا ہے!"

"ڈر؟ کیسا ڈر؟"

"اچھا بتاؤ سکینہ کو جانتے ہو۔ سُنا ہے تم نے اس کا علاج کیا ہے۔۔۔۔"

"میں تو پوری حویلی کا علاج کرتا ہوں۔ میرا کام ہی کیا ہے۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن میں نے سُنا تھا سکینہ کو کوئی ایسی ویسی بیماری ہے۔ تم تو ڈاکٹر ہو۔ بتا سکتے ہو۔"

"کوئی ایسی ویسی بیماری نہیں۔" ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ کہہ دے "ہسٹریا ہے!" اس کی نگاہوں میں ایک لڑکی کا چہرہ اُبھرا۔ پسینے میں ڈوبتا اور اُبھرتا ہوا کالا تل نظر آیا۔ بھنچے ہوئے زرد، تھرتھراتے ہوئے ہونٹ، کھلتی اور بند ہوتی ہوئی آنکھیں، دھڑکتی ہوئی جوان چھاتی ۔۔۔ "مجھے بچاؤ .... درخت کو کاٹ کر گاڑ سکتے ہو .... لیکن ہوا کو .... ہوا کو تو مٹھی میں نہیں بند کر سکتے ہو نا ...."

"فخرالدین صاحب،" جاوید نے گلا صاف کرتے ہوئے سیدھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔ صاف کہئے۔ بیمار تو سبھی پڑتے ہیں۔ کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے!"

"اچھا اچھا۔ میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔۔۔"

فخرالدین نے اچھل کر اپنا ہنٹر اٹھایا، دو تین بار زور زور سے دائیں بائیں گھمایا۔ سڑاپ

سڑاپ! اور پھر دونوں ٹانگیں چیر کر کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے چٹان پر کھڑا ہو کر ڈاکٹر کو گھورنے لگا۔ جاوید کو وہ ایک ڈرامائی ڈاکو لگ رہا تھا جو ڈاکے مارنے سے پہلے گھات میں ہو اور اندازہ لگا رہا ہو کہ کون سادا اور زیادہ بڑھیا رہے گا۔

"یار تم مسکرا کیا رہے ہو۔۔۔ حیران ہو کہ اس جنگل میں یہ شہری بانکا کہاں آن پھنسا۔ لیکن یقین جانو مجھے تو ہمیشہ چڑھتے دریا میں تیرنے، جنگل میں کھونے اور دلدل میں پھنسنے میں مزا آتا ہے!"

"واقعی؟" جاوید نے بہت ہی طنزیہ حیرت کا اظہار کیا۔

"کیوں یقین نہیں آتا؟"

"یقین کی بات نہیں ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا خیر چھوڑو دوست۔ اس میں کیا رکھا ہے۔"

"جاوید کھڑا ہو گیا۔ دونوں ایک بڑی سی چٹان کا چکر کاٹ کر دوسری طرف نکل گئے۔

"خوبصورت ہے!" فخرالدین نے نیچے دوڑتی ہوئی شکری ندی کی طرف اشارہ کیا۔

"بڑی رومانی وادی ہے، ڈاکٹر .... بھئی کچھ تو کہو۔ یہ کھلی وادی، ہرے بھرے درخت، جھلملاتا ہوا پانی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ...... ہم شہریوں کو یہ سب کہاں ملتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی اور حسرت بھری نظر سے جاوید کو دیکھا۔

"اچھا بتاؤ تمہیں شہر زیادہ پسند ہے یا گاؤں؟"

"اگر میں پوچھوں آپ کو رات زیادہ پسند ہے یا دن، چاند زیادہ پسند ہے یا سورج، پانی زیادہ پسند ہے یا آگ، نیند زیادہ پسند ہے یا بیداری ......"

"بس بس ...... ارے مار ڈالا یار مار ڈالا!"

جاوید کو بھی ہنسی آگئی۔ "ہاں ہاں بتایئے آپ کیا جواب دیں گے؟

"اور میں پوچھوں کہ تمہیں شراب زیادہ پسند ہے یا دودھ تب تو بتاؤ گے نا؟"

"نہیں میں جب بھی نہیں بتاؤں گا۔"

فخرالدین نے کندھے جھٹک دیئے جیسے کہہ رہا ہو۔ "تمہاری مرضی!"

مدرسے سے بھاگا ہوا ایک چھوکرا چٹان پر کھڑا پائجامہ اوپر چڑھائے نیچے جنگلی پھولوں

سے ڈھکے ہوئے ایک پودے پر چھڑکاؤ کر رہا تھا اور بڑے لحن سے قوالی کی دھن میں گا رہا تھا۔ "حاجت روا محمد۔ مشکل کشا محمد!" اس نے کھڑبڑ جو سنی تو جھٹ بستہ دبا ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا بھاگا۔ ان دونوں کو ہنسی آگئی۔

فٹن پر بڈھا کوچوان بیٹھا اونگھ رہا تھا اور لگتا تھا کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا نہیں کہ بڈھا پکے ہوئے آم کی طرح ٹپکا۔

فخرالدین نے جاوید کا ہاتھ پکڑا اور بہت ہی گمبھیر صورت بنا کر پوچھا۔ "ڈاکٹر! ایک بات بتاؤ ......کیا سکینہ سے شادی کسی کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے؟"

جاوید ایک لمحہ سوچتا رہا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا "نہیں!"

"اور خود اس کے لئے؟"

"یہ میں نہیں جانتا!"

"ڈاکٹر۔" جاوید نے اس کی التجا بھری آنکھوں میں دیکھا۔ شکاری کمان پر تیر چڑھاتے ہوئے شکار کو اسی نظر سے تو دیکھتا ہے۔ جاوید خاموش رہا اور سڑک پر چڑھنے لگا۔

"ایک بات اور بتاؤ دوست...... لڑکی خوبصورت ہے نا؟"

"کیا؟" جاوید نے دانت بھینچ کر پوچھا۔

"میں تمہارا دوست ہوں نا؟" فخرالدین کھسیا کر ہنسا۔

"نہیں جانتا میں۔ اتنی جلدی آدمی نہ دوست ہو سکتا ہے نہ دشمن!"

"اچھا چھوڑو۔ جب دلہن بنے گی اور رونمائی ہوگی تو دیکھ لوں گا۔ ہا ہا ہا!" جاوید تیزی سے مڑا اور ہسپتال کی طرف چل دیا۔

"ارے فٹن میں آ جاؤ نا!" فخرالدین نے پکار کر کہا اور جب جاوید نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تو اس نے ہنٹر سے اپنے جوتے کی گرد اڑائی اور اچھل کر اتنے زور سے فٹن میں بیٹھا کہ کوچوان چونک پڑا اور لڑھکتے لڑھکتے بچا۔

"اونگھ رہا ہے!"

"نہیں سرکار ...... چل بیٹا ہٹ ٹ ٹ! ......" کوچوان نے شال سے چھینک کو

دباتے ہوئے کہا اور لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا۔

دور ہریالی ڈھلان پر دیودار کے پیڑوں تلے دو سوار نظر آئے۔ گھوڑوں کا رُخ ایک دوسرے کی الٹی سمت میں تھا اور دونوں سوار سر جوڑ کر باتیں کرتے نظر آ رہے تھے۔

اگر فٹن کے پہیے آثار پر لڑھکے بنا گھومتے چلے جاتے اور گھوڑے کے کھر روئی کے بنے ہوئے ہوتے تو فخرالدین اطمینان سے جھاڑیوں کے پیچھے جا کر دم لیتا، اور دونوں سواروں کی گرم گرم باتیں سن لیتا۔

ان میں سے ایک تو اس کا نیا دوست تھا۔ تھانیدار کرن سنگھ۔

"پرمیشر سنگھ سُنا نہیں سو سنار کی، ایک لوہار کی!"

"کرن سنگھ خوب سُنا ہے اور یہ بھی سُنا ہے کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کیسا؟"

پرمیشر سنگھ نے اپنی بڑی سی گلابی پگڑی کو زور سے پیچھے جھٹکا دیا۔ اور ہنس کر بولا۔

"پھر........"

"بس سانپ کے بل سے نکلنے کا انتظار ہے اور تمہارے اشارے کی تاک میں ہوں!"

"لیکن پرمیشر سنگھ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے....."

"کرن سنگھ.... چاندی کی بات کرو.... کھرے روپے دیئے تھے میں نے، مگر۔"

"پرمیشر سنگھ جتنے تم نے دیئے تھے۔ اس سے زیادہ تمہارا کام بن چکا۔ میری تو نوکری کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ تو دربار نے بچا لیا۔" کرن سنگھ نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

"دربار.........دربار.........دیکھنا کوئی تلوار کا دھنی آئے گا اور تمہارے حرامی دربار کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا!" اس کی آنکھوں سے راجپوتی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ موٹے کپڑے کی دھوتی گھٹنوں تک چڑھی ہوئی تھی اور بالوں سے بھری موٹی موٹی پنڈلیاں گھوڑے کے پیٹ میں چپکی ہوئی جیسے پھڑک رہی تھیں۔

"جب آگ بھڑکے گی تو تاپنے والے ہاتھ تاپ لیں گے!" کرن سنگھ نے آنکھ ماری اور زور سے ہنسا۔ اس کی ہنسی کی آواز چٹانوں پر کانسی کے ٹوٹے ہوئے برتن کی طرح لڑھکتی چلی گئی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اپنے چوکیدار کو ذرا سمجھا دو۔ سالے بہت بھونکتے ہیں۔ سر پنچوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں ...."

"اچھا اچھا .... لیکن تم بھی ہوشیار رہو پرمیشر سنگھ پانی سر سے اونچا ہوا تو ...... تم جانو ...."

"جانتا ہوں،" اس نے بڑی بے پروائی سے سر جھٹکا۔

"بھگوان کا آسرا ہے۔ کرن سنگھ! .... تمہاری دعا سے میرا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔ پہاڑی جھرنے پر بند کون باندھے گا؟ اتنا بوتا کس میں ہے؟"

"سچ کہا، میں ابھی دربار جا رہا ہوں۔ چینی مل کی کھچڑی پک رہی ہے ......"

"مجا تو جب ہے کرن سنگھ کہ کھچڑی ہانڈی ہی میں پڑی رہے پروسی نہ جائے ......"

کرن سنگھ نے زور سے قہقہہ لگایا، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پتھریلے راستے پر چڑھتا ہوا سڑک کی طرف چل دیا۔

"پرمیشر سنگھ نے دانت پیس کر کہا۔ "سانپ .... تیرے کاٹے کا منتر نہیں۔ شطرنج کی چال چلتا ہے۔ حرامی کو معلوم نہیں کہ پرمیشر سنگھ کی لاٹھی میں کیسا جادو ہے۔ نہ جانے کتنے تھانیدار اس راجپوت کے موت میں بہہ گئے اور پلوں کو تنکے کا سہارا نہ ملا۔ دیکھ لیں گے۔ تجھے بھی دیکھ لیں گے حرامی!"

اس کا گھوڑا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور ندی کی طرف دلکی چال سے دوڑنے لگا۔ پرمیشر سنگھ کا سڈول جسم آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور وہ یوں تنا ہوا تھا جیسے کوئی ویر پانی پت کے میدان میں دشمن پر ٹوٹ رہا ہو۔

کرن سنگھ سڑک پر پہنچا تو پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ گھوڑا موڑ کر گاؤں کی طرف دوڑانا چاہتا تھا کہ سڑک پر بوڑھے برگد کے سائے میں سرکاری فٹن کھڑی نظر آئی۔

"فخرالدین بابو ...." کرن سنگھ کی دبی ہوئی آواز میں گھبراہٹ تھی

فخرالدین نے سیٹی بجائی۔ کرن سنگھ مسکرایا اور فٹن کے پاس لگام کھینچتے ہوئے پوچھا:

"سیر ہو رہی ہے۔ میں تو جناب ہی کو سلام کرنے جا رہا تھا ...."

فٹن بھی گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ اور کرن سنگھ کا گھوڑا بھی۔ اچانک فخرالدین نے کہا۔

"کرن سنگھ رات چڑھ گئی تھی نا؟"

"ہا ہا......چڑھ گئی تھی جناب۔ مگر اب کے میں چڑھ بیٹھوں گا..."

"اچھا نیت نیک نہیں ہے۔ چلو چلو ......رات والی بوتل تمہارا انتظار کر رہی ہے......" فخرالدین نے اپنے ہنٹر سے اشارہ کیا۔ "اتنی اچھی زمین خالی کیوں پڑی ہے؟"

"یہی تو وہ زمین ہے ......مل والی۔ دیکھئے چاروں طرف گنے کی کھیتی ہوتی ہے۔ پھر اسٹیشن وہ رہا۔ سڑک اتنی قریب ......"

"یہاں تو مزدور بھی سستے مل جائیں گے ......علاقے کی پہلی مل ہوگی۔ سالے بھوکے مرتے ہیں۔ دوڑ کر آئیں گے۔ سرکار کو خوب سوجھتی ہے۔"

"اقبال والے کو ہمیشہ دور کی سوجھتی ہے، فخرالدین بابو! بس ایک دفعہ شکر مل بن جائے پھر دیکھئے گا... یہ علاقہ آپ لوگوں کے جان و مال کو دعائیں دے گا۔ چھوٹے سرکار!"

"دعائیں ......دعائیں ......" فخرالدین نے منہ بنایا۔

فٹن دربار کے سامنے رکی تو فخرالدین کے ساتھ ساتھ کرن سنگھ بھی مہمان خانے میں چلا گیا۔ اس نے صندل کا پنکھا اٹھایا اور فخرالدین نے رومال نکالا اور دونوں پنکھا جھلنے لگے۔ پل بھر میں کمرے میں صندل اور سینٹ کی خوشبو بس گئی۔

چلمن اٹھی اور سڈول بدن کی سانولی سلونی، بڑی بیباک اور ساتھ ہی نیند کی ماتی کٹار سی آنکھوں والی ایک لڑکی خوان پوش سے ڈھکی ہوئی سینی کندھے پر رکھے کمرے میں آئی۔ صندل اور سینٹ میں کیوڑے اور گلاب کی خوشبو بھی شامل ہوگئی۔ جیسے ہی لڑکی پلو کو دانت سے دبائے ہوئے چلمن اٹھا کر نکلی فخرالدین نے گاؤتکئے پر اڑتے ہوئے کرن سنگھ سے کہا۔

"بڑی کراری چھوکری ہے تھانیدار صاحب۔ جو سلونا پن گاؤں کی چھوکریوں میں ہے وہ اپنے یہاں شہروں میں بھولے سے نظر نہیں آتا ......"

"بات یہ ہے جناب کہ آپ جوان ہیں۔ خون گرم ہے۔ آپ کی نظر بھی گرم ہے۔ ویسے کیا رکھا ہے۔ سرکار کی خاص خادمہ ہے۔ وہ خاندانی ملازم ہے نا۔ کرار خاں۔ اسی کی لونڈیا

ہے۔ اس اکھڑ کو تو دیکھا ہوگا آپ نے۔ لوگ کہتے ہیں پٹھان غریب ہے پر ہے ننگی تلوار!"
کرن سنگھ نے معنی خیز نظر سے فخرالدین کو دیکھا اور مونچھوں میں چمکتا ہوا پسینہ جھاڑا۔
"اچھا!" فخرالدین نے کتھئی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ "جن ہے بھائی ناراض ہو جائے گا!"

"لائیے اس جن کو ابھی پی لیں!" کرن سنگھ نے چاندی کی طرح چمکتی ہوئی شراب دو گلاسوں میں انڈیلی "آپ کی صحت ......"
کرن سنگھ نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ فخرالدین نے لپک کر گلاس اٹھایا اور بولا "نہیں چینی مل کے نام ......" اور غٹ غٹ چڑھا گیا۔ اس نے اپنے ہونٹ چاٹ کر دانت اکلتے ہوئے کہا: "رات تم نے جتنی باتیں بتائیں۔ میرے کام کی ہیں۔ خوش رہو!"
"آپ کو کبھی مجھ سے دھوکا نہ اٹھانا پڑے گا ......"
"دھوکا ...... دھوکا تو نمک ہے زندگی کا!"
"آپ یہاں کے داماد بننے والے ہیں۔ ایک طرح سے ہمارے سرکار۔ سو بات آپ نے پتے کی کہی۔ آج رات کو خود ہی دیکھ لیجئے گا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ حسن بھی ہے، دولت بھی ہے، عزت بھی، سبھی کچھ ......"
"ارے ہاں، یہ ڈاکٹر تو آپ کا بڑا سنکی ہے!"
"کیوں کیا ہوا؟" کرن سنگھ نے اچھل کر پوچھا۔
"کچھ نہیں،" فخرالدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "کچھ نہیں۔ سنکی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ اسے کیا معلوم۔ ہم شہر میں ڈاکٹروں کو یوں خریدتے ہیں جس طرح پان اور بیڑی ...... خیر دیکھا جائے گا ......"
"میں کب سے کہہ رہا ہوں سرکار سے۔ بستر گول کرو اس کا۔ سیدھی انگلی سے کہیں گھی نکلا ہے ...... پر ...... مصلحت ہوگی کوئی ......"
"مصلحت ......" فخرالدین نے پھر گلاس خالی کیا اور سینی کی طرف دیکھ کر زور سے ہنسا ...... "کیوڑا، گلاب ...... شربت!"

منشی کان میں سرکنڈے کا قلم اٹکائے ہوئے آیا۔ جھک کر دونوں کو سلام کیا" داروغہ صاحب سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے ......" وہ ران کھجاتے ہوئے بولا۔

کرن سنگھ فوراً کھڑا ہو گیا۔ فخرالدین گاؤ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بہت ہی بھونڈی اور بے سری آواز میں گنگنانے لگا۔

کاہے بھرے تورے نین ...... ہاں ...... کاہے بھرے تورے ....

15

رات خوبصورت تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ہر چیز سے جیسے سنہرے آنسو ٹپک رہے تھے۔ درختوں اور چٹانوں کے سائے سے کچھ روشن روشن ہیولے سے طلوع ہوتے اور پھر تھرتھراتی ہوئی سنہری دھند جیسی خاموش چاندنی میں پگھلتے اور پسیجتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کبھی ہوا کا کوئی جنوں خیز جھونکا آتا، کانوں میں سیٹیاں بجتیں، ان دیکھے چھاگل چھم چھم کرتے اور ان دیکھے کڑیل بازو، ان دیکھے البیلے پیکروں کو بھینچتے۔ ہوا کے تیز جھونکے آتے تو جنگلی درختوں، بن پھلکوں اور جھاڑیوں کی خوشبو پھیل جاتی۔ اس فضا میں ندی سرد آہ کھینچتی ہوئی بہہ رہی تھی ..... کٹا کٹا سا چاند ٹوٹ کر ندی میں گر گیا تھا۔ پانی کی لہریں اس پر سے گزرتیں تو لگتا کہ خود اس دہکتی تھالی سے پگھلا پگھلا سونا چھلک رہا ہے۔ نیل گگن میں چاند تیر رہا تھا اور اڑتے ہوئے سیاہ بادلوں کی فوج اس سے بہت دور تھی۔ ان بادلوں کے کالے

ہاتھ بہت لمبے تھے۔ ململ کے کالے کرتوں کی آستینوں کی طرح جن میں ہوا بھری ہوئی ہو۔ چاند مسکراتا رہا۔ ہاں یہ لمبے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے!

اچانک کالی چٹان پر ایک سفید چٹان اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیوں سرکار؟" منشی کی آواز نے خاموشی کا سینہ چھلنی کر دیا۔

"رات بھیگ گئی ہے۔ چاند دمک رہا ہے، دیکھو ...... دیکھو ...... اب تو مچھلیاں تیرتی نظر آ رہی ہیں بھئی ..... شکار شروع ہونا چاہیے ....."

فخرالدین اور جاوید پاس ہی ایک دوسری چٹان پر کھڑے سگریٹ کے کش اڑا رہے تھے۔ نریش ان کے قدموں میں بیٹھا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ کنکریاں پھینک رہا تھا۔ کنکریاں گرتیں اور غائب ہو جاتیں۔ سرکار کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

"اوہو ...... ذرا دیکھنا تو من بھر کی مچھلی ہے ...... کس شان سے تیر رہی ہے ..... ٹھیر جا ســـــری ....." کرار خاں نے کالی نیام سے تلوار کھینچی دیوانگی سے ہنسا اور چھچھلے پانی میں کود گیا۔

"آجاؤ ماسٹر صاحب ......" ماسٹر شاہ عالم نے بے بسی سے سرکار کی طرف دیکھا ......

"سرکار! ...... آپ کا حکم ہو تو میں بھی اوکھل میں سر ......"

سرکار نے اشارہ کیا اور ماسٹر شاہ عالم نے اپنی لنگی لنگوٹ کی طرح کس لی۔ اس کی گوری اور موٹی رانیں درخت کے بے چھال تنے کی طرح چمکنے لگیں اور وہ بولا۔ "میں پانی میں اتر لوں تو منشی جی تلوار تھما دینا ......"

شاہ عالم پانی میں اترتے اترتے پھسلا اور چاروں خانے چت پانی میں تیرنے لگا ......

"باپ رے!" کرار خاں نے زور سے قہقہہ لگایا اور چاندی کی مچھلیاں بھاگتی ہوئی نظر آئیں۔ منشی جی نے تلوار بڑھاتے ہوئے ماسٹر شاہ عالم کی طرف دیکھا۔ "ارے کیا غضب کرتے ہو؟ میان میں ڈال کر دو نا! میں خود ...... میں خود ......" اتنی دیر میں وہ دو تین گھونٹ پانی پی گیا۔ منشی نے تلوار نیام میں واپس ڈال کر بڑھائی۔ ماسٹر شاہ عالم کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ وہ تلوار کو نیام سے نکالے بغیر ہانپتا کانپتا کھڑا رہا اور تیرتی ہوئی مچھلیوں پر وار کرنے کے لئے

میان میں چھپی ہوئی تلوار کو ہوا میں تولتا رہا۔ کبھی کبھار مچھلی آکر اس کے پیروں سے چھو جاتی تو اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی، ساتھ ہی سرکار کے منہ سے زور کا قہقہہ چھلانگ لگا کر نکلتا۔

"اچھا کھیل ہے!" فخرالدین نے ڈاکٹر کو ٹھوکا مارتے ہوئے کہا۔

"کھیل یا مذاق!" جاوید کو اس کھیل میں بڑا مزا آرہا تھا۔ اس کا بھی جی چاہا کہ تلوار لے کر پانی میں کود جائے۔ یہ گھات، یہ سناٹا، یہ چاندنی بہتے ہوئے پانی میں قدم جما کر کھڑے ہونا اور بھاگتی ہوئی مچھلی کو سنہرے آئینے میں دو ٹکڑے کر دینا ...... یہ خیال اسے بڑا پُرکشش معلوم ہوا۔ اس کا دل چھپی ہوئی ترنگ سے لرز گیا۔ وہ اسی طرح پتلون پہنے ہوئے پانی میں کود گیا۔ ماسٹر شاہ عالم کو محسوس ہوا کہ جیسے کوئی شیر اس پر ٹوٹ پڑا ہو۔ "باپ رے باپ!" جاوید نے اس کے ہاتھ سے تلوار لی اور گھبرا کر بھاگتی ہوئی ایک بڑی سی مچھلی پر بجلی سی گری۔ کرار خاں نے بڑھ کر مچھلی کے تڑپتے ہوئے دونوں ٹکڑوں کو کچھے میں سمیٹ لیا۔ اس کے دانت چمک رہے تھے۔ "کمال کر دیا ڈاکٹر صاحب!"

"شاباش ڈاکٹر شاباش!"

سب نے داد دی لیکن فخرالدین خاموش رہا۔ جلتی سگریٹ پانی میں پھینک دی ......

جاوید کو اپنی نسوں کی کسی ہوئی گرہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوئیں، جیسے راحت اور نشاط سے گنگناتا ہوا خون رگوں میں دوڑنے لگا ہو۔ وہ گھٹنوں تک پانی میں تھا اور جب اس نے ندی کے اس پار جنگل کی طرف دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "مزا آگیا۔ کیسی بھبن ہے، واہ! ......" اس کا جی چاہا کہ ایک اور تیرتی ہوئی مچھلی کے دو ٹکڑے کردے۔ اب کوئی مچھلی نہ تھی اس نے تلوار اٹھالی اور پانی کی ایک لہر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

"جوانی کا کھون ہے ......!" کرار خاں نے مچھلی کے ٹکڑوں کو اونچے کنارے پر پھینکتے ہوئے کہا۔ مچھلی کے ٹکڑے فخرالدین کے چمکتے ہوئے سیاہ جوتوں کے پاس گرے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "ارے یہ تو اب تک نہیں مری!" فخرالدین نے گھبرا کر کہا۔ "آدمی تو آدمی مچھلی بھی سالی پھٹ سے نہیں مرتی حجور ...... تڑپتی چھڑپتی ہے! ......" کرار خاں بولا۔

ایک مچھلی تیرتی ہوئی بڑھی اور جاوید کے پاس سے کتراتی ہوئی نکلنے لگی۔ جاوید لپکا۔

تلوار ہوا میں لہرائی مگر لہراتے لہراتے وہیں رک گئی۔ کیونکہ چماری کی گھبرائی اور لرزتی ہوئی آواز ندی کے پورے پاٹ پر دوڑتی چلی گئی

"ڈاکٹر بابو ...."

جاوید جلدی سے مڑا اور کنارے پر چڑھ گیا۔ چماری ہانپتا ہوا اس کے پاس آکر رک گیا ..."کھترناک کیس ہے .... کھون .... کھون ...."

"کس کا خون؟" جاوید نے تلوار کو نیام میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"لوگ باگ پرمیشر سنگھ کو ہسپتال میں لائے ہیں .... اس کا سر پھٹ گیا ہے ...... کھون ...."

ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔

"پرمیشر سنگھ ...... وہی بدمعاش ...... ڈاکو ......" سرکار نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"جی سرکار .... کان تک کٹ گیا ہے ...."

"کون پرمیشر سنگھ .... کون ڈاکو ...."

جاوید لپکتا ہوا چماری کے ساتھ چل دیا۔ اس کی بھیگی ہوئی پتلون پھڑپھڑا رہی تھی۔ دونوں کے سائے درختوں کے پیچھے غائب ہوئے تو سرکار نے فخرالدین کا ہاتھ پکڑ لیا۔" چلو چلیں۔"

فخرالدین اور باقی کارواں ساتھ ہو لیا۔

عبدالجبار کے جبڑے زور سے بھینچے ہوئے تھے اور وہ اپنی شہادت کی انگلی مروڑ رہا تھا ..... گوشت اور چربی کے نیچے سرکار کے خوش اور ساتھ ہی خائف دل کے دھڑکنے کی آواز رات کی خاموشی میں ایسی سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی ریت پر دوڑ رہا ہے۔ موسم سرد نہیں تھا مگر ماسٹر شاہ عالم کے دانت بج رہے تھے اور وہ سب کے پیچھے پیچھے کراہتا کھانستا، تھوکتا چل رہا تھا۔

ہسپتال کے باہر بیل گاڑی کھڑی تھی بیل کھلے ہوئے تھے اور بجری پر چر رہے تھے۔ آپریشن روم میں کمپونڈر بار بار اسٹوو پر کھولتے ہوئے پانی میں جھانک کر چمکتے ہوئے اوزاروں کو دیکھ لیتا۔ وہ آپریشن ٹیبل کی طرف دیکھنے سے کترا رہا تھا۔ میز پر ادھیڑ عمر کا ایک لمبا شحیم کڑیل راجپوت لیٹا تھا۔ اس کے دونوں گھٹنے کٹے ہوئے، درخت کے ٹھنٹھ کی طرح اٹھے ہوئے تھے اور سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ وہ چھت پر جالے میں پھنسی ہوئی مکھی کو دیکھ رہا تھا۔ مکھی جالے سے نکلنے کے لئے پھڑپھڑا رہی تھی اور مکڑی اس کے گرد جالا تان رہی تھی۔

"پرمیشر سنگھ، گھبراؤ مت ...... سب ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب بس آ ہی رہے ہیں ......" کمپونڈر نے عینک کی کمانی کو کان پر جماتے ہوئے کہا۔ کمانی بڑی تھی اور بار بار پھسل کر ناک کی چونچ تک آ رہی تھی۔

"میں ضرور ڈاکٹر کی راہ دیکھوں گا ...... میں مر نہیں سکتا ...... پانی پانی۔" پرمیشر سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں۔

کمپونڈر نے اس کا کرتا اتار دیا تھا جو خون میں لتھڑا ایک کونے میں پڑا تھا۔ پرمیشر سنگھ کے کٹے ہوئے سر سے خون بہہ کر کانوں کو بھگوتا ہوا گردن کے نیچے آپریشن ٹیبل پر ٹپک رہا تھا۔

جاوید جھپٹتا ہوا ایک ہی چھلانگ میں ہسپتال کے برآمدے میں چڑھ گیا۔ دو تین لمبے تڑنگے راجپوت ڈنڈے سنبھالے ہوئے ڈاکٹر کی طرف لپکے لیکن وہ سیدھا آپریشن روم میں گھس گیا۔ چماری نے راجپوتوں کو روکا۔ "بھئی آپریشن روم سے دور رہو ...... ڈاکٹر صاحب کھپا ہوتے ہیں ......" اور پھر وہ بھی آپریشن روم میں گھس گیا۔

کمپونڈر لیمپ اٹھا کر پرمیشر سنگھ کے قریب لے آیا۔ ڈاکٹر نے جاتے ہی لیمپ کی روشنی میں سر کا زخم دیکھا۔ اس کی گہرائی، لمبائی اور چوڑائی کی جانچ کی اور کمپونڈر سے کہا "صاف کرو ...... اوزار ......"

کمپونڈر کے ہاتھ سے لیمپ چماری نے لے لیا۔ جاوید نے کھولتے ہوئے برتن میں جھانک کر دیکھا اور اوزاروں کو دیکھ کر اسے پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی یاد آ گئی۔ اس کے زخم کا منہ اور کھل گیا اور خون پھر رسنے لگا جیسے بھرے ہوئے منہ سے پان کی پیک نکل رہی

ہو جاوید کو سرکار کا پان کی پیک سے بھرا ہوا منہ یاد آگیا .... "سور......!"

ٹانکے لگا کر مرہم پٹی کرنے میں گھنٹہ نکل گیا۔ ڈاکٹر نے کاربولک صابن سے ہاتھ دھوئے اور مسکرا کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھا۔ "زخم گہرا ہے۔ لیکن تمہارے خون کا سوتا سوکھنے والا نہیں ..... اچھے ہو جاؤ گے .... پرواہ نہ کرو .... گرتے ہیں شہسوار ہی ...."

پرمیشر سنگھ نے ہلکی بیہوشی سے چونکتے ہوئے آنکھیں کھولیں اس کا سر کپڑوں کی سفید گیند معلوم ہو رہا تھا۔ ٹنکچر آئڈن اور خون کا ملا جلا رنگ دائیں کان کے اوپر روئی، گاؤز اور پٹی کی تہوں کو چیر کر ایک بھیگے ہوئے داغ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ٹنکچر اور اسپرٹ کی بو ہر چیز میں بس گئی تھی۔ پرمیشر سنگھ کو لگا کہ اس کی سانس میں بھی یہی بو بسی ہوئی ہے۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو خون کے سیاہ دھبے ہوا میں اڑتے اور چمکتے ہوئے نظر آئے۔

جب پرمیشر سنگھ کو برابر والے کمرے میں لٹا کر لالٹین کی بتی کم کی گئی اور کمپونڈر نے اس سے سو جانے کو کہا تو اس نے مشکل سے اپنا ہاتھ اٹھا کر ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے اچھا کر دو ڈاکٹر تو انعام دوں گا .... ایسا انعام ...... ایسا انعام ...... دشمن کا سر کاٹ کے تمہارے آگے ڈال دوں گا ......"

"اچھا اچھا .... سو جاؤ ...." جاوید نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ کمپونڈر نے پٹیوں سے جھانکتے ہوئے سیاہ ہونٹوں میں لال رنگ کی دوا ٹپکائی اور بازو میں انجکشن لگا دیا۔ ڈاکٹر بڑی سی میز پر بیٹھ کر رپورٹ لکھنے لگا۔ اس کے سر کے اوپر رئیس عبدالستار کی تصویر اپنی نشیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

جاوید کو کرسی پر بیٹھ کر اپنی بھیگی ہوئی پتلون اور ننگے پیروں کا خیال آیا۔ اسے ہلکی سی جھرجھری آئی اور آنکھوں میں جلن محسوس ہوئی۔ زرد کاغذ پر رپورٹ لکھنے سے پہلے اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ایک بھیگی ہوئی سگریٹ کھینچ کر سلگائی۔ دھواں اڑا .... اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ باہر سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔

دوسری طرف کمرے میں پرمیشر سنگھ اب زور زور سے بڑبڑا رہا تھا۔ "کاٹ کر رکھ دوں گا .... کتوں کو .... بیٹے لانا میرا گنڈاسا .... لانا میری تلوار .... کتے بھونک رہے

ہیں ــــ کھون کھون کھون ــــ لال لال ــــ دریا چڑھے ــــ کھون کا دریا ــــ ناؤ ڈوبی ــــ کتو ایک ایک کرکے آجاؤ ــــ کون ہے منیا کا لال ــــ ایک ایک کرکے ــــ ارے ارے ــــ تیری ماں ــــ میں مٹی کا دیا نہیں ہوں کہ پھونک سے بجھ جائے ــــ ہٹ تیری بہن کی ــــ"

جاوید نے کمپونڈر کو پکارا۔ اتنے میں کرن سنگھ پستول کا خول ٹٹولتا ہوا اندر آگیا۔

"کیا حال ہے پرمیشر سنگھ کا؟" اس نے آنکھیں جھپکائیں اور جاوید کو ہسپتال سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ "ابھی ابھی سُنا۔ بھاگا چلا آرہا ہوں۔ ــــ ارے یہ تمہارا کیا حلیہ ہو رہا ہے لگتا ہے سیدھے ندی سے بھاگے آرہے ہو ــــ"

باہر نیم کے درخت کے سائے میں مہندی کی کیاری کے پاس کرن سنگھ نے جاوید کو روکا۔ "بھئی جوتے تو پہن لیتے ــــ"

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے ــــ" جاوید نے رکھائی سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ پرمیشر سنگھ ایک گروہ کا سرغنہ ہے ــــ"

"تو پھر ــــ"

چاند کی چاندنی درخت سے چھن کر دونوں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ گھاؤ گپتی کا ہے ــــ"

"بالکل!"

"لیکن ہو سکتا ہے کہ گھوڑے پر سے گر کر پتھر و تھر سے ــــ اور یہ سالے یوں ہی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہوں ــــ"

"داروغہ صاحب ــــ حملہ جان بوجھ کر قتل کرنے کے لئے ہوا ہے ــــ"

"ڈاکٹر فیصلے میں جلدی نہ کرو ــــ اس وقت چاہو تو ــــ" کرن سنگھ نے اس کا ہاتھ تھام کر شانہ تھپتھپایا۔

میں سمجھا نہیں ــــ آپ کے اشاروں کا مطلب ــــ لیکن دیکھئے میں رپورٹ لکھنے جا رہا ہوں۔"

"رپورٹ تو مجھے بھی لکھنی ہے، اسی لئے تو کہہ رہا تھا کہ دونوں کی رپورٹ ....."

"میں سمجھتا ہوں .... ٹھیک ہے آپ اپنی رپورٹ لکھئے اور میں اپنی ...."

"اچھا تو یہ بات ہے ...." وہ بڑی مشکل سے اپنے کھولتے ہوئے خون کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ڈاکٹر خاموشی سے ہسپتال کی طرف چل دیا۔ کرن سنگھ تھوڑی دیر کھڑا اپنے پستول کے خول سے کھیلتا رہا ....دو قدم ہسپتال کی طرف چلا، پلٹا اور اچھل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور گرد اڑاتا ہوا مسجد والی سڑک پر چل دیا۔

جاوید نے کمپونڈر سے کہا: "ایک آدمی ہر وقت ہسپتال میں رہے کا مریض پر نظر رکھے۔ پرمیشر سنگھ کو بچانا ہے ...."

وہ بیٹھ گیا اور رپورٹ لکھنے لگا۔

کرن سنگھ دربار کے اندر والے زینے پر دو دو سیڑھیاں اکٹھی چڑھ رہا تھا۔ اس وقت عبدالجبار اپنی بیٹھک میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا..... ہولے ہولے جیسے شیشے کی چادر پر چل رہا ہو۔ وہ بار بار چونک رہا تھا۔ قالین کے نیچے اپنے قدموں کی چاپ رینگتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ ڈر گیا اور آرام کرسی میں دھنس گیا۔ اس نے حقے کی طرف دیکھا جس کے قلم پوش سے خمیرے تمباکو کی بجھتی ہوئی آگ جھانک رہی تھی۔ کمرے میں سوندھا سوندھا نشہ آور دھواں بسا ہوا تھا۔ ایک بار پھر اس نے حقے کی نے منہ میں لے کر دھواں کھینچنے کی کوشش کی اور پانی گڑگڑا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہونٹ چاٹتے ہوئے نے کو اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ چلم الٹ گئی اور راکھ اور چنگاریاں قالین کے پاس بکھر گئیں۔ وہ چلایا "رمضانی ..... سور، حرام خور .... جانے کہاں مر جاتے ہیں ...."

کرن سنگھ کا ہاتھ پردہ اٹھانے کے لئے بڑھ چکا تھا۔ لیکن وہ دم سادھ کر کھڑا رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پسینے کے قطرے گردن پر چیونٹیوں کی طرح لپٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رمضانی داڑھی کھجاتا ہوا کمرے میں گیا۔ تھپڑ کی آواز گونجی۔ تھوڑی دیر میں وہ چلم

اور حقہ سمیت کر سکیاں بھرتے ہوئے نکلا اور غائب ہو گیا۔ کرن سنگھ نے پلٹ کر مہمان خانے کی طرف دیکھا۔ فخرالدین کے کمرے میں روشنی تھی اور چلمن سے ایک سایہ ادھر ادھر پھرتا نظر آ رہا تھا۔

کرن سنگھ کھانستا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ جاتے ہی جھک کے سلام کیا۔ عبدالجبار نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھولیں اور چیخا،" یہ سب کیا ہو رہا ہے کرن سنگھ .... تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا!" وہ بپھرا۔

کرن سنگھ نے پلٹ کر دروازہ بند کیا۔

"نہیں یہاں نہیں .... سونے والے کمرے میں چلو۔"

کرن سنگھ نے سرکار کو اٹھنے میں سہارا دیا اور دونوں سونے کے کمرے میں چلے گئے۔

دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ رمضانی حقہ تازہ کر کے لایا اور سر دھنتا ہوا واپس چلا گیا۔

سرکار نے مسہری سے ریشمیں غلاف والا پیازی تکیہ ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف پھینک دیا اور ٹہلنے لگا۔ اس کے نتھنے پھول رہے تھے اور ہاتھ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے، بایاں زیادہ دایاں کم۔ بگنی ازار بند پیٹنٹ کے جوتوں تک لٹک رہا تھا

"کس کی کارستانی ہے یہ؟ بولتے کیوں نہیں؟ سانپ سونگھ گیا ہے کیا؟"

"سرکار .... کیا بتاؤں .... جانے کن بدمعاشوں کا کیا دھرا ہے یہ سب .... مگر"

"مگر .... مگر کیا"

"وہ .... وہ .... پرمیشر سنگھ کے بیٹے اور سالوں نے تھانے کی رپورٹ میں دربار کا ...."

"جانتا ہوں ...." عبدالجبار نے بپھر کر زور سے اپنی ہتھیلی پر گھونسا مارا۔" میں جانتا ہوں .... اچھے گھر نیوتا دیا .... اب یہ حرامزادے نیند حرام کر دیں گے .... اور ایسے وقت جبکہ .... میں کرتا ہوں کچھ اور ہوتا ہے کچھ۔ سب سازش کرتے رہتے ہیں۔ تم بتاؤ اب کیا ہو گا .... جانتا ہوں پرمیشر سنگھ بچ گیا تو سیدھے ہمارے آدمیوں کا نام بتا دے

گا۔ سالوں نے ہاتھ اٹھایا تھا تو سر الگ کر دیتے ۔ دھڑ الگ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو خودکشی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ سراسر حرمزدگی!"

"سرکار جو ہو گیا سو ہو گیا ۔۔۔۔۔۔۔ اب تو کوئی راستہ ڈھونڈنا چاہئے ۔ میرے بھی خلاف ہیں سالے ۔۔۔۔۔۔۔ رنگ بے ڈھب معلوم ہوتا ہے!"

"ہر وقت اپنی پڑی رہتی ہے ۔۔۔۔ ذرا سوچو یہ دربار کا سوال ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ بھی ایسے وقت جب چینی مل ۔۔۔۔۔۔۔ فخرالدین ۔۔۔۔۔۔۔"

"اب بھی سب ٹھیک ہو سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ مگر یہ ڈاکٹر ۔۔۔۔۔۔۔"

"ڈاکٹر لوہے کا چنا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔ کیا کہتا ہے۔ تم اس کی مٹھی گرم کرو اور اس مقدمے کو ۔۔۔۔۔۔۔"

"اس کی مٹھی گرم نہیں کی جا سکتی۔ آپ نے تو سانپ پال لیا ہے۔ کب ڈس لے کا کہا نہیں جا سکتا ۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو بھرا ہوا ہے۔ جیسے پریشر سنگھ اس کا ہوتا سوتا ہو ۔۔۔۔۔۔۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔ سوچو، بتاؤ!" سرکار نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"سرکار" کرن سنگھ کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ "سرکار ۔۔۔۔۔۔۔ اگر پریشر سنگھ کا ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔۔۔۔۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا جس کا مطلب تھا قصہ پاک!

"پاگل ہو گئے ہو کیا۔ اس وقت پریشر سنگھ کو مرنا نہیں چاہئے۔"

"لیکن وہ زندہ رہا تو میرا کام تمام سمجھئے ۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ بیکار ڈرتے ہو۔ بس کسی طرح ڈاکٹر کو داؤ پر لے آؤ اور گواہوں کو توڑ لو۔ میں لوگوں سے ملوں گا ۔۔۔۔۔۔۔"

دونوں کے سر جڑ گئے۔ آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ دیوار کے کان بھی نہ سن سکیں۔

"اس کے بعد ۔۔۔۔۔۔۔ ہاں اس کے بعد ۔۔۔۔۔۔۔ بس جاوید کا قصہ پاک ۔۔۔۔"

سرکار کی آواز سانپ کی سرسراہٹ میں بدل گئی

فخرالدین نے چلمن سے جھانک کر دیکھا سناٹا چھایا ہوا تھا ۔۔۔۔ باہر کتے اونگھتے

چونکتے ۔ ایک دو بار غراتے اور اپنے لگے پیروں میں منہ چھپا کر آنکھیں بند کر لیتے ۔ فخرالدین نے کینٹس پہن رکھے تھے ۔ وہ دبے پاؤں نکلا اور چھجے پر چلتا ہوا پچھلے زینے پر پہنچ گیا۔ چپکے سے لکڑی کا پھاٹک کھولا ۔ اور نیچے باغ میں اترا اور حوض کے پاس سے کافی چکر کاٹ کر بانس کے جنگل کے قریب چھوٹی چھوٹی چٹانوں پر چلتا ہوا حویلی کے قریب پہنچ گیا۔ گھپ اندھیرا تھا ۔ شاید گھٹائیں چھا رہی تھیں۔

"ہاں وہی کھڑکی ہے! ٹھیک بالکل ٹھیک .... سب سے روشن کھڑکی ...... یہی ہے ۔ .... یہی ہے! ..."

وہ دبے پاؤں سب سے روشن اور نیچی کھڑکی کی طرف بڑھتا رہا۔ کھڑکی کے قریب اس کا دایاں پیر پھسلا اور وہ چٹان سے لڑھک سا گیا ۔ چھوٹے چھوٹے پتھر پھسل کر دور تک جھنجھناتے چلے گئے ۔ وہ دم سادھے پڑا رہا پھر آہستہ سے اٹھا..... جی چاہا پلٹ کر بھاگے اور مہمان خانے میں جا کر دم لے ۔ اس نے ایک بڑی سی چٹان پر قدم جمائے اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ اوپر اٹھا ۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے جانی پہچانی سی سردانہ آواز سُنائی دی! اسنے جھانک کر دیکھے بغیر سر جھکا لیا۔ پھر جی چاہا کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہو۔ "ڈرپوک!" اس کے دل میں تھانیدار بول رہا تھا ۔ اس نے پھر سر اٹھایا ..... تھوڑا سا ۔ ..... پھر اور ...... پھر اور زیادہ ۔ جاوید کی انگلیاں سکینہ کی کلائی پر تھیں اور آنکھیں اس کھڑکی پر جس سے فخرالدین چندھیائی ہوئی آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے دعا مانگتی ہوئی جمراتن نظر آئی ۔ اس کے بعد اوندھی لیٹی ہوئی سکینہ ..... وہ جو کالی ساری میں لپٹی ہوئی اتنا ہولے ہولے سانس لے رہی تھی کہ جسم میں ہلکی سی جنبش بھی نہیں تھی۔

"ڈاکٹر اگر میں زندہ نہیں ہو سکتی تو مر کیوں نہیں جاتی ...... کبھی کبھی لگتا ہے بھیڑیئے مجھے کھانے کو بڑھ رہے ہیں ......" اتنا کہہ کر اس نے کروٹ بدلی اور چت لیٹ گئی ۔ اس کی وحشی آنکھیں سوجی ہوئی دہک رہی تھیں۔

"بھیڑیئے ہمیشہ گھات میں رہتے ہیں پھر بھی آدمی جیتا ہے اور سامنا ہو جائے تو بھیڑیئے سے لڑتا ہے ......"

وحشی وحشی سی احتجاج کرتی ہوئی آنکھوں میں کھوئے ہوئے فخرالدین نے یہ آواز سُنی اور چونک گیا۔ ڈاکٹر کی نظریں اس پر تھیں اور ہونٹوں پر ایک عجیب زہر خند کانپ رہا تھا۔ فخرالدین چٹان سے کود گیا۔۔۔ کھڑبڑ کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ جمراتن چونکی اور چلمن اٹھا کر کرار خاں کے پاس جا کر کھسر پھسر کرنے لگی۔ سکینہ کی آنکھیں جاوید کی آنکھوں سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ جاوید نے اس کی کلائی چھوڑ کر نازک ٹھنڈا ہاتھ دبایا اور ہنسا۔۔۔۔۔۔

"سکینہ گھبراؤ مت۔ سو جاؤ۔ تم ذرا ڈر گئی ہو اور بس۔"

"نہیں میں ڈری نہیں۔ میرا ڈر تو دور ہو رہا ہے۔ اسی لئے تو ڈاکٹر کو بلوایا تھا۔" جاوید نے چونک کر سکینہ کو دیکھا۔ ایک روشنی سی ایک سایہ سا سکینہ کے چہرے پر تیر گیا۔ سکینہ نے بہت زور سے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ جاوید کو محسوس ہوا کہ وہ ایک اونچی چٹان پر کھڑا ہے۔ نیچے دریا بہہ رہا ہے اور ایک لڑکی اس کا ہاتھ پکڑے لٹک رہی ہے اور چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔ بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ۔۔۔۔۔۔

جاوید نے زور سے سکینہ کا ہاتھ دبایا، چلمن اٹھائی اور اس کو دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔

فخرالدین ہانپتا ہوا پچھواڑے کے زینے پر چڑھا جس پر سوکھی ہوئی کائی جمی تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی وہ مسند پر گر گیا۔ چند منٹ آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ ایک خوبصورت چہرہ اس کی آنکھوں میں کھلنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ساتھ ہی کانوں میں ڈاکٹر کی آواز بھی اُبھری۔۔۔ مسکراہٹ مٹ گئی اور چہرے پر بادل تیر گئے۔ اس نے میز سے جن کی بوتل اٹھائی۔ گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا کہ ٹاپوں کی آواز سُنائی دی اور کتے بھونکنے لگے۔ کھڑکی کے باہر گھوڑے پر بیٹھا ہوا ایک سایہ ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ساتھ دور ہوتا چلا گیا

سالے تھانیدار نے ٹھیک ہی کہا تھا۔۔۔۔ ہاں!

جاوید بار بار کروٹ بدلتا رہا۔ نیند آتی، اس کے گرم ماتھے کو چومتی اور دور جا کر، ہنستی اور گھنگھرو بجاتی ہوئی غائب ہو جاتی۔ آخر وہ جھنجھلا کر اٹھا اور پہلو والے کمرے میں گیا۔ وہاں جنگلی سجدے میں گرا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ کھڑکی میں ایک اگر بتی جل کر بجھ رہی تھی۔

جب وہ دبے پاؤں لوٹ کر لیٹا اور آنکھیں بند کیں تو ایک کونے سے بوا دعا پڑھتی ہوئی اس کی طرف بڑھیں ...... وہ بیلے کے پھول کی طرح سفید لباس میں تھیں ...... ساتھ میں ایک چکنا ڈنڈا تھا اور آگے آگے دو بیل سر جھٹکتے ہوئے چل رہے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو یہ سارے سائے مٹ گئے۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب کے خوشبو کی لپٹیں آئیں۔ خوشبو اس کی سانسوں میں بسنے لگی۔ چاروں طرف درختوں کا باغ اگ آیا اور چھوٹے سے تالاب میں لہریں اٹھنے لگیں۔ ہوا کی انگلیوں نے جوڑا کھول دیا اور زلفیں اس کے شانوں پر بکھر گئیں، سادہ سی بنگالی لڑکی کا چلبلاتا ہوا جسم تڑپا اور کسمسایا، باہیں کس گئیں، آنکھیں بند ہو گئیں، ہونٹ یوں کھل گئے جیسے کلی کھل رہی ہو، ایک بھونرا کانپتے ہوئے پروں کے ساتھ چٹکی ہوئی کلی پر بیٹھ گیا، کچھ زہر ٹپکایا، کچھ شہد چوسا .... کلی مسکرائی اور بولی ..... بھونرے تم پھول پھول پر جاتے ہو رس چوستے ہو، اور اڑ جاتے ہو ..... مدھ میں رس بھر دیتے ہو اور ..... کیوں؟

جاوید نے تکیہ اٹھا کر پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنے بال نوچے اور پھر لیٹ گیا۔ جھینگروں کے بولنے کی آواز آئی۔ جنگلی بطخوں کی چیخ اور پروں کی سنسناہٹ سنائی دی ..... "اف صبح ہونے کو آئی!" اس نے آنکھیں زبردستی بند کیں۔ وہ بار بار انگلیاں مروڑ رہا تھا۔ یکایک ایک ٹھنڈا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ نرم پسیجتا ہوا لرزتا ہوا ہاتھ..... ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی "بچاؤ! بچاؤ! بچاؤ!" ایک حسینہ بپھرے ہوئے دریا کی لہروں میں تیر رہی تھی۔ اس کے بال ریلتی پیلتی لہروں کو ڈس رہے تھے۔ اس کا تل چمک رہا تھا۔ وہ ڈوب رہی تھی۔ کولتار کی طرح چمکتا ہوا ایک سیاہ گھڑیال اس کی طرف بڑھ رہا تھا..... گھڑیال بار بار منہ کھولتا تھا اور قہقہہ لگاتا تھا۔ پھنکاروں سے پانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ "بچاؤ!" وہ پہاڑ کی بلندی سے دریا میں کود گیا۔ اچانک دریا تک پہنچنے سے پہلے اس کی ٹانگ میں

بندھی ہوئی زنجیر جھنجھائی اور وہ ہوا میں لٹکنے لگا۔ ہر چیز ناچنے لگی۔ پہاڑ۔ دریا۔ لڑکی۔ گھڑیاں۔۔۔۔۔۔۔

جاوید اٹھ کر سیدھا باہر نکل گیا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ ہوا میں ہیجانی خنکی بسی ہوئی تھی۔ اس نے دو تین بار انگلیوں سے بالوں میں کنگھا کیا اور ہوا اسے سکون بخشنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ گھاس پر ٹہلنے لگا اور حیرت سے دیکھا کہ بیلے، جوہی، اور گیندے کے پھول کھل رہے تھے۔ آخر اب تک اس نے کلیا کی محنت کے ان پھولوں کو کیوں نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ہسپتال کا ایک چکر لگایا۔ بجری پر اس کی چپلوں کی چرمراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ وہ ایک کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

"کمپونڈر ۔۔۔۔۔۔ گھبراؤ مت ۔۔۔۔۔۔ میں کتے کا سر کاٹ کے تمہارے پیروں پر ڈال دوں گا۔"

"نہیں بھائی میرے پیروں نے کیا بگاڑا ہے ۔۔۔۔۔۔" کمپونڈر کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی ۔۔۔۔ ایک جماہی اور پھر خاموشی!

جاوید مسکرایا اور پھر گھاس سے بھرے ہوئے احاطے میں ٹہلنے لگا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ نریش بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔

"ارے تم؟ ۔۔۔۔ کھانس رہے ہو؟ ۔۔۔۔۔۔۔ سویرے سویرے کہاں؟"

"ڈاکٹر صاحب رات بھر نیند نہیں آئی بس کسی کے کراہنے کی آواز چونکاتی رہی!"

"کس کے کراہنے کی آواز،" جاوید سورج مکھی کے پودے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"پرمیشر سنگھ کی!"

ارے نریش یار،" اس نے سر کی طرف اشارہ کیا، "کچھ چول ڈھیلی ہو گئی ہے کیا؟"

"ڈاکٹر پرمیشر سنگھ کو دیکھ سکتا ہوں؟"

"کیوں؟" جاوید نے پوچھا، "تم جانتے ہو پرمیشر سنگھ کو؟ کہتے ہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سرغنہ ہے ۔۔۔۔"

نریش کے ہونٹ بھینچ گئے: "برا نہ مانتا ڈاکٹر۔ ان پہاڑوں اور جنگلوں میں ایک سے

ایک بے رحم اور خونی ڈاکو چھپے ہیں۔ پرمیشر سنگھ ان میں سے نہیں ہے۔ جانتا ہوں لوگ اسے ڈاکو کیوں کہتے ہیں ۔۔۔ وہ کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ لاٹھی کا دھنی ہے۔ کوگمار میں ایک ہی تو آدمی ہے ۔۔۔۔۔۔ دل گردے والا ہے ۔۔۔۔۔۔"

"دل گردے والا ۔۔۔۔۔۔ اس پر حملہ کس نے کیا ہوگا؟"

" ڈاکوؤں نے اور کس نے ۔۔۔۔۔ ان ڈاکوؤں نے جو دن میں ڈاکوؤں کو کوستے نہیں تھکتے اور رات ہوتے ہی ڈاکہ ڈالنے کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں، اور ۔۔۔۔۔۔" نریش کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

سڑک پر فٹن دوڑا چلا جارہا تھا۔ فٹن میں سرکار کا بھاری بھرکم جسم ہل رہا تھا۔ پیچھے ٹٹو پر منشی تھا ۔۔۔۔ وہی آڑی ترچھی چال!

"پیروی شروع ہوگئی ۔۔۔۔۔۔ سنا تھا گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتے ہیں اب یہ کہاوت پرانی ہوگئی۔ اب ایسا نہیں ہوتا ڈاکٹر اب امتحان کی گھڑی آن پہنچی۔ میں نے پہلے کچھ نہیں کہا، پر اب کہتا ہوں۔ اب امتحان شروع ہورہا ہے۔"

"کیسا امتحان؟"

نریش کے ہونٹوں پر ایک بجھی بجھی تھکی تھکی سی مسکراہٹ ابھری اور اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ تھام لیا۔ "لوگ پرمیشر سنگھ کو مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے کیوں کہ بہادر ہے، شیر ہے۔ سر نہیں جھکاتا۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کرن سنگھ اور سرکار ۔۔۔۔۔۔"

وہ بات پوری نہ کرسکا کیوں کہ۔ سامنے سے فخرالدین آرہا تھا۔ جاوید نے آہستہ سے کہا "نریش مجھے اپنا راستہ معلوم ہے ۔۔۔۔ ڈگمگاؤں گا نہیں!"

فخرالدین آتے ہی ڈاکٹر سے بے تکان باتیں کرنے لگا۔ کبھی کبھی نریش کو کنکھیوں سے دیکھتا، چٹکیاں بجاتا اور ہنٹر کو سورج مکھی کے نیچے گرد پر مارتا جاتا۔

"ڈاکٹر ۔۔۔۔ آنکھیں بتارہی ہیں کہ جاگے ہو رات بھر ۔۔۔۔۔۔"

"فخرالدین صاحب اگر آپ یہ بات آئینے سے کہتے تو آئینہ آپ کو سچ بتا دیتا۔"

"جاوید کا تیکھا جواب سن کر فخرالدین نے پینترا بدل دیا۔۔۔ "اچھا کہئے ۔آپ کے مریض کا کیا حال ہے؟"

"کون سا مریض؟"

"رات والا؛" "رات والا۔۔۔۔۔۔ پرمیشر سنگھ ۔۔۔ گھبرایئے نہیں ۔۔۔ بچ جائے گا۔۔۔"

"ہاں پرمیشر سنگھ ہی سمجھ لیجئے۔"

نریش ہنستا ہنستا دور جا کر کلیا سے گپ کرنے لگا۔

"ڈاکٹر۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔ کل جا رہا ہوں ۔۔۔ آج کی شام تمہارے نام جن کی ایک بوتل بچ رہی ہے، پینے کا شوق تو ہوگا تمہیں؟"

"مجھے پینے پلانے کا شوق نہیں ۔ آدمی پیتا ہے بہکنے کے لئے اور میں پی کر بھی ۔۔۔۔ خیر چھوڑیئے ۔۔۔۔۔ تو کل جا رہے ہیں ۔۔ آپ کو تو یہ گاؤں بہت پسند آیا تھا نا؟"

"پسند ہمسب کچھ لوٹ لیا اس نے ،خیراب تو آتا رہوں گا ۔۔ بہت جلد یہاں شکر مل کی چمنی دھواں اگلتی نظر آئے گی ۔۔۔۔"

"دھواں ۔۔۔۔۔"

"جی ہاں دھواں ۔۔۔۔ اور پھر یہاں اسی مل کا راج ہو گا۔۔۔ "فخرالدین نے ۔۔۔۔۔۔۔

"لیکن، یہ تو بتایئے فخرالدین صاحب۔ رات آپ جنگل میں کیا کر رہے تھے؟" جاوید کے تھکے ہوئے چہرے پر ایک رنگ سا آ گیا۔

"میں جنگل میں؟ نہیں تو ۔۔۔۔۔ وہ میرا کتا کمبخت نکل گیا تھا۔۔۔"

"اچھا اچھا ۔۔۔۔۔ آپ تو بیکار شرماتے ہیں۔"

"نہیں یار شرماتا نہیں ۔۔۔۔ تو آؤ نا آج شام کو ۔۔۔ یا میں ہی آجاؤں، کرن سنگھ کو بھی بلا لوں۔ خوب آدمی ہے؛"

"جی ہاں خوب آدمی ہے!" جاوید نے زور سے سانس لیا۔ "جن کی بوتل تھانیدار کو پسند آئے گی؛"

"بڑے اکھڑ ہو، یاد آؤ گے۔ ہو سکتا ہے برات اگلے مہینے ہی ....."

جاوید نے نظر اٹھا کر فخرالدین کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب درندگی، ایک عجیب آدم بیزار شرارت چمک رہی تھی۔ وہ مڑا اور بڑی شاہانہ چال سے چل دیا۔ جاوید سر جھکائے ہوئے بے ارادہ کلیا اور نزیش کی طرف چلا گیا۔

16

حویلی میں صبح کی ہلچل شروع ہو رہی تھی۔ ہر آنگن سے بچوں کے رونے کی آواز، چنے کا حلوہ، تل کے لڈو اور شکر کے بتاشے کھانے کی ہٹ اور ٹھن ٹھن۔ ٹھن ٹھن سنائی دے رہی تھی۔ کہیں لوٹا لڑھک رہا تھا، کہیں سلفچی، کہیں کوئی بہو آنچل اٹھا کر کوس رہی تھی، کہیں کوئی ماما یا پٹھانی ڈانٹ پھٹکار سن رہی تھی۔ اور ساتھ ہی کوئلے کے منجن سے بچوں کے دانت بھی مانجھے جا رہی تھی۔ باورچی خانے والے آنگن میں لڑکیاں آٹا گوندھنے کے لئے حوض میں اتر چکی تھیں، بالٹیوں سے پانی انڈیلا جا چکا تھا، چولہوں سے لکڑی کا دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اتنے میں سکینہ دوڑتی ہوئی آئی اور وہ بھی حوض میں کود گئی۔ لڑکیاں اس اچانک حملے سے گھبرا کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ چوڑیوں کی جھنکار گونج اٹھی۔

"ہے ہے میری لاڈو۔ آتا نہ اتراؤ۔ تم ہی دنیا میں انوکھی نہیں ہو بھی کی ایک نہ

ایک دن ڈولی اٹھتی ہے۔ مگر یوں للکاریاں بھرتا کوئی نہیں پھرتا اور ..... "

چڑیوں کی چہکار کی طرح قہقہے گونجے اور کنواری کنیاں ایک دوسرے کے سینے میں چھپے ہوئے راز ٹٹولنے لگیں۔ سکینہ تو جیسے نشے میں تھی۔ اس نے بھی قہقہہ لگایا۔ لڑکیوں نے ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔ لیکن وہ آنچل کو کمر میں کس کر زور زور سے مٹھیاں چلارہی تھی۔ آٹا گندھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ جس سے اس کے تل میں اور بھی تیکھا پن پیدا ہو گیا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بار بار آنکھوں پر گر رہی تھی ..... کسی نے نعرہ لگایا..... "لو جی آٹا گندھ گیا۔ سکینہ یہ آٹا ہے دولھا میاں کا دل نہیں ہے ، للاڈو!"

سکینہ رک گئی۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے جھپٹ کر گندھے ہوئے آٹے پر ایک بکٹا مارا اور ایک لڑکی کے کھلے ہوئے منہ میں ٹھونس دیا۔ جھٹ اچھل کر نکلی اور ہاتھ دھونے کے لئے کنوئیں کی طرف لپکی۔ وہاں سے اکیلی نکلی اپنے آنگن کی طرف بھاگی۔

"لو دیکھ لو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں نہ کہتی تھی۔ جوانی دیوانی آسیب، بھوت، جن، ہونہہ! سب سے بڑا جن دل ہے دل ... دریا چڑھے اور کوئی رد کے .... ہونہہ! لو دیکھ لو ابھی کل شربت پلایا گیا اور آج گاگر چھلکا پڑ رہا ہے!" بڑھیا پٹھانی بولی۔

سکینہ اپنے آنگن سے ہوتی ہوئی حویلی کے اندھیرے زینے سے پچھواڑے والی چھت پر پہنچ گئی۔ اس زینے پر کوئی قدم نہیں رکھتا تھا کیونکہ چھت پر ایک بڈھے جن کا بسیرا تھا۔ چھت کے خیال ہی سے حویلی والیوں کے پر جلتے تھے۔ اکیلی سکینہ تھی جو اس چھت پر دندناتی پھرتی تھی۔ وہاں اسے بڑا سکون ملتا۔ اس وقت بھی وہ چھت پر سکون کی تلاش میں گئی تھی۔ چھت کے اوپر برگد کی گھنی شاخیں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے یہ اتنا بڑا درخت حویلی کے پچھواڑے والی دیوار سے سنسنا کر پھوٹا ہو۔ سکینہ چھت پر لیٹی ہوئی ایک موٹی شاخ پر بیٹھ گئی۔

اس کے کانوں میں ایک بار پھر پٹھانی کی آواز گونجنے لگی۔

"میرا بھائی مجھے بیچ رہا ہے۔ وہ مجھے قتل کر کے دم لے گا!" سکینہ کو اپنی پوری زندگی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی نظر آئی۔ "لیکن یہ ناؤ کیوں ڈوبے۔ کنارا نظر آرہا ہے۔ وہ سسکی۔

تھوڑی دیر وہ چھت پر برگد کے سائے میں بیٹھی اکیلی چپکے چپکے، سسکے بغیر آنسو بہاتی رہی۔ کسی نے اس کا سر سہلایا۔ برگد کی ایک شاخ کی ہمدردی نے اس کا اکیلا پن اور بڑھا دیا۔ اس نے آنسو پوچھے تیزی سے نیچے اتری اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چھوٹی چوکی پر اس کا ناشتہ رکھا تھا۔ بڑی بی پاندان کھولے بیٹھی تھیں، سکینہ کو دیکھے بغیر آہستہ سے بولیں۔

"میری بچی اب تیرے دن پھرنے والے ہیں۔ چاند گہن سے چھوٹنے والا ہے۔ تو اپنے گھر جائے گی۔ اس جنجال سے چھوٹے گی۔ دولھا سر آنکھوں پر رکھے گا۔ جہاں تیرا پسینہ ٹپکے گا وہاں اپنا لہو بہائے گا۔۔۔ آج ہوتی تیری ماں، کتنا جی نہال ہوتا اس کا۔۔۔" بڑی بی بکتی رہیں۔

سکینہ ہوشربا کی پھٹی پرانی جلد، بادامی کاغذ اور پنسل لے کر کونے میں بیٹھ گئی۔ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر سوچتی رہی۔ آخر اس کی پنسل چلنے لگی جیسے رومال پر پھول کاڑھ رہی ہو۔

"رات کو عشاء کی نماز کے بعد۔۔۔۔۔۔ نہیں تہجد کے وقت۔۔۔۔۔۔ جنگل میں۔۔۔۔" اس کی انگلیاں کانپنے لگیں، اس نے گہرا سانس لے کر کاغذ کو مٹھی میں دبا لیا اور ڈرتی ہوئی نظروں سے بڑی بی کو دیکھا۔ بڑی بی اپنی دھن میں بڑ بڑائے جا رہی تھیں۔

"لو اور سنو۔۔۔۔" چھوٹی بہو چہکیں۔۔۔۔۔۔ "ہونہہ!۔۔۔۔۔۔ رد یہ کیا ہے، ہاتھ کا میل ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں جب تو چلی جائے گی تو دشمنوں کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی۔"

سکینہ کے ہونٹ کانپے اور اس نے پھر کاغذ کھول کر پنسل سنبھال لی۔

وہ دن بھر گھبرائی گھبرائی ادھر ادھر منڈلاتی رہی۔ حویلی والوں نے اسے حیران آنکھوں سے دیکھا اور بڑی بوڑھیاں کچھ اس طرح سے بڑبڑائیں کہ وہ نہ سُن کر بھی ان کی تیزابی باتیں سُن لے۔۔۔ "بوا! چڑیا کے پر نکل آئے پنجرے میں جی نہیں لگتا رانی کا۔ تیلی نکلی اور مینا یہ جا وہ جا۔"

"خوب اٹھلاؤ، جب سسرال میں ہلدی چونا لگے گا تو معلوم ہوگا!"

"زمین پر پاؤں نہیں پڑتے شہزادی کے۔۔۔۔۔۔ بڑے گھر جا رہی ہے نا بیچاری۔ اتراؤ، اتراؤ۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات!"

سکینہ کو یہ سب سُن کر ذرا صدمہ نہ ہوا۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا وہ حویلی۔۔۔۔۔

کی تاریک فضا میں سنسناتے ہوئے ان تیروں کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی ہر آنگن میں ہر صبح نہ جانے کتنی بانہیں کسی کے گلے میں پڑنے کے لئے اٹھتی ہیں اور لوٹ کر مایوس انگڑائیوں میں جھول جاتی ہیں۔ ہر شام کتنے ہونٹ کھلتے ہیں اور تھکی ہوئی جماہیوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔ کتنے بوڑھے ہاتھ تسبیح سمیت اٹھتے ہیں، کتنے ہونٹوں سے دعائیں پھوٹتی ہیں، ......یا اللہ لڑکیاں پھولوں کی سیج پر سوئیں۔ کوئی آئے، پھولوں کے ساتھ ساتھ ان کے جلتے ہوئے ہونٹوں اور دھڑکتے ہوئے امنگوں بھرے سینوں سے کھیلے، شہنائیاں بجیں اور آتشبازیاں چھوٹیں:، اسے حویلی کی چار دیواریوں سے سرگوشی کرتی ہوئی، ان تمناؤں کی خبر تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ سوتیلے سائے نفرت اور جلن کے سوا اور کوئی تحفہ نہیں دے سکتے، پھر بھی اطمینان سے ادھر ادھر منڈلاتی رہی ......جلنے والے جلا کریں!

آخر اسے کرار خاں کا بھتیجا مل گیا۔ شریر چھوکرے نے اپنی میلی، جھلنگ آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے اس سے خط لیا اور اسے نیفے میں ٹھونس کر حویلی کے چور دروازے سے نکلا اور سیدھا ہسپتال میں جا کر دم لیا۔

جاوید نے مڑے تڑے زرد کاغذ پر نظر دوڑائی ......آج رات کو......لیکن میں اس طرح چھپ کر کیوں ملوں؟ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ یہ لڑکی خود بھی تباہ ہو گی، مجھے بھی برباد کرے گی؟ لکھ دوں نہیں آؤں گا لیکن چھوکرا تو چمپت ہو چکا ہے ......کیا کروں؟ نہیں یہ بچپنا ہے۔ اس لڑکی کا دماغ چل گیا ہے۔ اپنے آپ سے کھیل رہی ہے۔ نہیں جانتی وہ انگاروں پر چل رہی ہے۔ لیکن میں تلوار کی دھار پر کیوں چل رہا ہوں؟ ہو سکتا ہے لڑکی ......اس کی آنکھوں میں سکینہ کا چہرہ بادلوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے چاند کی طرح ابھرا پلکوں پر دو موتی لرز رہے تھے، کنوارے، گرم اور کانپتے ہوئے ہونٹوں پر پسینہ تھا ......وہ آنکھوں کے اشارے سے بلا رہی تھی۔ پگلی، ہو سکتا ہے وہ مجھے کوئی راز بتائے۔ لیکن یہ راز کیا ہو سکتا ہے؟ راز ......راز ......راز کا خیال آتے ہی جاوید کے گلے میں کوئی چیز پھنسنے لگی۔ وہ برآمدے سے اترا اور احاطے کی گھاس پر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کمپونڈر کے کوارٹر کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ شام کے

سناٹے میں کمپونڈر کی بیوی کی آواز اُبھری ...... مجھے تو دال میں کالا نظر آتے ہے ..... آخر ڈاکٹر اتنا دبلا کیوں ہوتا جارہا ہے ...... شادی کیوں نہیں کرتا ...... ضرور ......"

"بکومت چھنو کی ماں۔ ڈاکٹر پر بہت کام ہے .... اور یہ پرمیشر سنگھ والا معاملہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ حرامزادے دربار والے ......"

جاوید آگے نکل گیا۔ اس نے احاطے کے دو تین چکر لگائے۔ پھر بھی اس کا ہیجان دور نہ ہوا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ سے عشق ...... لیکن یہ کیا بکواس ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔ دربار کا سارا خواب ...... اور میں ایک ڈاکٹر ...... اور یہ پرمیشر سنگھ ...... ارے نہیں۔ دربار سے تو میری ٹکر ہوگی۔ پاش پاش ہو جاؤں گا لیکن ہتھیار نہیں ڈالوں گا ...... مگر ..... مگر ...... یہ آنکھیں، ان کی لجائی لجائی وحشت، کچھ کر گذرنے کی دھمکی، غصہ، وحشت ...... کیا یہی عشق ہے؟ یہ کوئی بیماری تو نہیں ہے؟ دماغ کا خلل ...... لیکن میں جاؤں گا نہیں۔ مجھے اس فرالدین سے کتنی نفرت ہے۔ بدمعاش! نہ جانے ایسے ایسے کتنے فرالدینوں کو دیکھ چکا ہوں ...... خبیث ..... عبدالجبار صاحب میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔

وہ لپکتا ہوا ہسپتال کے اندر گیا۔ چماری بیٹھا بیڑی پھونک رہا تھا، ڈاکٹر کو دیکھتے ہی جلدی سے بیڑی چھپالی اور منہ بند کر لیا اور دھواں پینے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا "پرمیشر سنگھ کو کتنا بخار ہے؟"

چماری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بولتے کیوں نہیں ......؟"

"ایک سو ایک ......" چماری کے منہ سے بھک سے دھواں نکلا۔

"بخار بڑھ رہا ہے ...... ایں۔"

جاوید پرمیشر سنگھ کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک کروٹ بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی ناک، پپوٹے، ہونٹ، ہر چیز سوجی سوجی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔

"دیکھ لینا وہی ہوگا جو میں کہتا ہوں ...... سرسوں کے پیلے پیلے کھیتوں میں ہوا گا

رہی ہے۔ نہیں یہ تو میری گوری ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے گھونگھٹ کاڑھ لیا ہے۔ سانجھ بھئی پر وہ کھیت میں کام کر رہی ہے اور گا رہی ہے .... مجھے بلا رہی ہے ... ضرور آؤں گا ذرا اور اندھیرا ہو لے۔ ابھی تو پہاڑی ندی کا پانی چمک رہا ہے۔ تیری آنکھوں کا کاجل اس پانی میں گھل جائے .... پھر میں آؤں گا۔ میں تجھے گود میں اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ پنڈت سالے کیا بگاڑ لیں گے۔ میرے نام سے سب کی مائی مرتی ہے .... تو گوالن ہے تو ہوا کرے ...... تو میری رادھا ہے میں ایک ایک کا خون پی جاؤں گا ......"

یکایک وہ خاموش ہو گیا۔ جاوید چونکا۔ اس کی نبض ہاتھ میں لی اور دیر تک مریض کے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ندی کی طرف چلا گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ مسجد کا چراغ بھی بجھ گیا۔ بیل گاڑیوں کا ایک کارواں سڑک پر ڈیرہ ڈالے پڑا تھا۔ دور بیل گاڑیوں کی لالٹینیں بہت سے جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔

جاوید نے سوچا وہ جنگل نہیں جائے گا۔ لیکن اس کے قدم جنگل کی طرف اٹھتے رہے۔ وہ باغ سے کترا کر بانس کے جنگل میں پہنچا اور آگے جا کر شیشم کے نیچے ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ "اب بھی وقت ہے .... بھاگ جاؤں!" ایک طرف سے سرسراہٹ ابھری۔ جیسے ہوا کے جھونکے زمین پر گرے ہوئے خشک پتوں کو چھیڑ رہے ہوں۔

"جاوید! جاوید!" کسی نے اپنے ہونٹ جیسے اس کے کان پر رکھ دیئے۔ وہ چونک گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کتنا بھیانک سناٹا تھا۔ ہر چیز دم سادھے پڑی تھی۔ جیسے شب خون کی تیاری ہو۔ وہ اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ چند پرندے کہیں سے اڑتے ہوئے آئے اور ٹھیک اس کے اوپر شیشم پر بیٹھ گئے۔ ایک سایہ درخت کے پیچھے سے ابھرا اور ہانپتا ہوا اس کے پاس چٹان پر گر گیا۔ جاوید نے اس کو سنبھال کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں جھنجھنا کر گریں۔ اور چٹان کے نیچے سوکھے پتوں پر ساز چھیڑتی ہوئی خاموش ہو گئیں۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اندھیرے میں بھی جاوید کو اندازہ ہو گیا کہ سکینہ سر جھکائے ہوئے اپنے آنچل کو مروڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اس کے دل کی دھڑکن کچھ تھمی۔ اسے ایک نئی مہک کا احساس ہوا۔ ایسی خوشبو کا جو ایک سانس سے پھوٹ رہی تھی اور دوسری سانس میں بس رہی تھی۔

آہستہ آہستہ ہوا سرسرائی اور دونوں چونک گئے۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ہونٹ خاموش تھے۔ جاوید نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے خیاباں میں کھو گیا ہے جہاں آگ کے پھول کھلتے ہیں اور ہوا سے شبنم ٹپکتی ہے۔

"بتاؤ۔ کیوں بلایا تھا مجھے؟" جاوید اتنا آہستہ سے بولا کہ وہ خود بھی آواز نہ سُن سکا لیکن سکینہ کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی ..... جاوید کو سکینہ کی خاموشی سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ اس کا دل پھر زور سے دھڑکا۔ اسے لگا کہ ہر اندھیرے سائے کے پیچھے کوئی چھپا ہوا ہے۔ دبے پاؤں بڑھ رہا ہے۔ اسے تو پتوں میں چمکتے ہوئے جگنو آنکھوں سے نکلتی ہوئی چنگاریاں معلوم ہوئے۔

"بولو سکینہ .... مجھے کیوں بلایا ہے ....."

سکینہ نے سانس لے کر اس کی جلتی ہوئی انگلیوں کو دبایا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" جاوید نے سوچا۔ لیکن جواب میں اس نے بھی سکینہ کی ٹھنڈی اور کانپتی ہوئی انگلیوں کو دبایا اور اس کو اپنی طرف کھینچا۔ وہ شبنم سے نہائی ہوئی شاخِ گل کی طرح جھکی اور اس کا سانس جاوید کو اپنے ہونٹوں پر گرم گرم پھونک کی طرح محسوس ہوا۔ اس نے اندھیرے میں دو چراغ جھلملاتے ہوئے دیکھے۔ اس نے چراغوں کو چوم لیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور جاوید کے ہونٹ آنسوؤں کے عطر سے نم ہو گئے۔

"رو رہی ہو سکینہ؟"

"میں کتنی بے وقوف ہوں۔" سکینہ سچ مچ رونے لگی۔

جاوید نے اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "بتاؤ تو سہی ......" اس کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ ان انگلیوں، کلائیوں اور شانوں کا ہر لمس آج پھولوں سے ٹپکے ہوئے شہد اور دو آتشہ کا کام کر رہا تھا۔ دل میں ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ اس نے سکینہ کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کو لگا کہ ایک نازک سی ڈالی اپنے تمام پھولوں کے ساتھ اس کی آغوش میں سمٹ آئی ہے۔ پھولوں کی ایک ایک پنکھڑی آگ کی تھرتھرائی لو بن گئی تھی ... اچانک ہوا تھم گئی۔ جاوید چونکا اور کسمساتے ہوئے جسم کو

چھوڑ دیا جس میں ایک نئی روح اپنی تمام شعلگی کے ساتھ تلملاتی اور انگڑائی لیکر اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس اجنبی جسم سے، اس اجنبی جسم میں کنارا توڑ کر نکل جانے والے اجنبی تلاطم سے اور ہونٹوں میں کھلتے ہوئے اجنبی پھولوں کی انجانی خوشبو اور ان کی ناقابل برداشت پکار سے ڈر گیا۔

"بتاؤ میں کیا کروں؟ کیا چاہتی ہو مجھ سے؟ مجھے خط کیوں لکھا تم نے؟" اس نے کھڑے ہوتے ہوتے آہستہ سے پوچھا۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ سرد ہوا درختوں میں سرسراتی رہی۔ پھر سکینہ آہستہ سے بولی۔ "مجھ سے ڈرتے ہو جاوید؟"

"کیوں؟ ڈرتا تو یہاں آتا؟" جاوید جھلاگیا۔

"تم بہت ڈرپوک ہو ڈاکٹر میں سمجھتی تھی تم مجھے ......"

"بولو، رک کیوں گئیں؟"

سکینہ چند لمحے کے لئے پھر خاموش ہو گئی۔ وہ اندر ہی اندر کسی چیز سے لڑ رہی تھی ....

"میں بھاگنا چاہتی ہوں یہاں سے ......"

"کہاں؟"

"کہیں بھی .... جنگل کے اس پار، پہاڑوں کے اس پار ......دور جہاں ......جہاں کوئی مجھے خرید نہ سکے ......کوئی مجھے بیچ نہ سکے۔"

"کیا مطلب؟" جاوید مطلب سمجھتا تھا مگر کیا کہتا!

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ جاوید نے محسوس کیا کہ سکینہ رو رہی ہے .... اس کے ساتھ درخت اور ہوا، اندھیرا اور رات سب روتے ہوئے محسوس ہوئے .... وہ پھر بیٹھ گیا، اور سکینہ کو بازوؤں میں سمیٹ کر کلیجے سے لگانا چاہا لیکن اس کے نرم ڈالی ٹوٹ کر الگ ہو گئی!

"تم ڈرپوک ہو، میں غلط سمجھی تھی۔"

"کیا سمجھی تھیں تم؟" جاوید نے بھری ہوئی آواز سے جواب دیا۔

"کیا تم مجھے لے کر کہیں بھاگ نہیں سکتے؟"

"نہیں" جاوید نے کہا تو اس کا سارا بدن بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

"تو پھر تم کیوں آئے۔ ڈرپوک!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی

"بہت بھولی ہو سکینہ ......" جاوید غصے سے کانپ رہا تھا۔

"ہاں بھولی ہوں۔ جبھی تو تم آئے۔ تم نے مجھے .... مجھے ....."

"سکینہ میں پاگل ہو جاؤں گا ...... بھاگنا چاہتی ہو؟" اس نے سکینہ کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ سکینہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"اچھا بھاگ چلو۔ کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"نہیں جانتی۔ بس اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں۔ یہی ایک خواب دیکھا ہے میں نے .... اور اب لگتا ہے ایک جہنم سے نکال کر دوسرے جہنم میں جھونک دی جاؤں گی میں ...."

"روو مت ...... بھاگنا چاہتی ہو تو چلو بھاگ چلیں .... لیکن کہاں؟"

دونوں دیر تک ایک دوسرے سے چپکے ہوئے سرگوشیاں کرتے رہے پھر باتوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی جنگل جمائیاں لینے لگا۔ کہیں دور پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر ڈھولک کی تھاپ سُنائی دی۔

"ڈھولک کون بجا رہا ہے؟" سکینہ نے پوچھا۔

"کوئی برہا کا مارا ہو گا .... کوئی کسان ....."

"اب چاند نکل آئے گا سنہرہ کترا ہوا ناخن!" سکینہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ چاند ڈوبتا اور نکلتا کیوں ہے ...... ہمیشہ گول کیوں نہیں رہتا؟ .... تم نے چاندنی کا گیت سُنا ہے جو کنواری لڑکیاں گاتی ہیں۔ بہت پیارا گیت ہے .... مجھے تو لگتا ہے ...... لگتا ہے جیسے چاندنی رات ہے، دریا میں طوفان آیا ہوا ہے اور کوئی ملاح اپنی سونے کی کشتی میں بیٹھا بھنور میں ڈوب رہا ہے ..... ڈوب رہا ہے ......"

"تم پگلی ہو ....."

"لیکن بتاؤ ہم کہاں جائیں گے بھاگ کر، چڑیا اڑتی ہے تو کہیں نہ کہیں گھونسلہ بناتی ہے نا؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا .... گھونسلہ .... میں کچھ نہیں جانتا سکینہ ..... جیسی حرکت کر رہے ہیں ہم کہیں ہمیں پچھتانا نہ پڑے ......"

"تو تم ابھی سے پچھتا رہے ہو .... ٹھیک ہے ...... بیکار ہے، یہ سب بیکار ہے۔"

وہ اٹھی اور چٹان سے اتر گئی۔ سوکھے ہوئے پتے چرمرائے۔ اس کے قدموں کی آہٹ دور ہوتی گئی۔ بہت سے بھیانک سائے بڑھے اور ایک کانپتے ہوئے سائے کو کھا گئے۔

"سکینہ ......" جاوید کے منہ سے آہستہ سے نکلا اور وہ اسی طرح چٹان پر بیٹھا رہا۔ دور سے ایک کنڈی کی جھنکار سنائی دی۔ کوئی دروازہ کھلا اور بند ہوا اور پھر بھیانک سناٹا ایک کانپتا ہوا سایہ جیسے اس کی طرف بڑھا۔ "سکینہ ......" سایہ بھاپ کی طرح اڑ گیا وہ چٹان سے اترا اور بانس کے جنگل کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک پتھر لڑھکا۔ پرندے اڑے اور چیختے ہوئے مسجد کی طرف اڑ گئے۔ حویلی کی ایک کھڑکی روشن ہو گئی۔ چوکیدار کی آخری پکار فضا میں دیر تک تیرتی رہی .... "جاگ کے سونا!"

جلاہوں اور کنجڑوں کے محلے سے مرغوں کی بانگ اور پر پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی۔ تو سکینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ آخر کب تک بند کئے رہتی ..... کب تک سونے کا بہانا کئے پڑی رہتی۔ رات کٹ گئی مگر اس کے کانوں میں جنگل میں سنسناتی ہوئی ہوا گونجتی رہی۔ کبھی اسے لگتا کہ یہ جنگل اس کے سینے میں بند ہے۔ کبھی لگتا کہ اس کا سر اب تک ایک سینے پر رکھا ہوا ہے۔ اور اس گرم اور بے چین سینے کے اندر بھی ایک جنگل گا رہا ہے، ایک سمندر ساحل سے ٹکرا رہا ہے .... نہیں نہ یہ جنگل ہے، نہ سمندر یہ تو ایک آدمی کی الجھتی ہوئی سانس ہے اور بس، لو یہ کھیل بھی ختم ہوا۔ کون کس سے کھیل رہا تھا۔ میں یا ڈاکٹر۔ نہیں میں کھیل رہی تھی ..... چاند توڑ لینے کی تمنا تو میرے دل میں ابھری تھی۔ بیوقوفی تھی، چکور گاتا رہتا ہے اور اڑتا رہتا ہے مگر چاند کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ صبح ہوتی ہے اور چاند روشنی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ چکور تمہارے پر کترے گئے! لیکن یہ پر تو کب کے کترے جا چکے تھے۔ ان دیواروں اور پنجرے میں فرق ہی کیا ہے۔ ان دیواروں سے روشنی اور ہوائیں دونوں سر ٹکرا ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں ..... یہ سپنے ہیں یا حقیقت .... نہیں جانتی۔ یہ

خواب مجھ سے ٹکراتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ ٹکراتے ہیں اور پاش پاش ہو جاتے ہیں ......ہائے میرے سہانے خواب! اور اب تو خواب بھی تھک گئے ...... یہ لہریں جس افق سے پھوٹی تھیں اسی افق میں کھو گئیں۔ اندھیرا چھا رہا ہے۔ میں کیا کروں؟ ڈاکٹر تم نے مجھے دھوکا دیا۔ نہیں شاید میں خود دھوکا کھا گئی کہ میں ہمیشہ یہ خواب دیکھتی رہی ایک بار ان دیواروں سے باہر نکل گئی تو میرے پَر نکل آئیں گے۔ مضبوط اور خوبصورت پَر۔ وہ مجھے اڑائے اڑائے پھریں گے۔ میں جنگل میں پہنچ تو گئی مگر اڑ نہ سکی۔ اب کبھی نہیں اڑ سکوں گی۔ مجھے گیت سنائی دے رہے ہیں۔ سکھیاں گا رہی ہیں اور میرا ہنجرہ ایک ظالم شہزادہ اٹھائے لئے جا رہا ہے۔ وہ مجھے سونے چاندی کے پھل دے گا۔ میں آنسو بہاؤں گی۔ لیکن ان آنسوؤں میں اتنی گرمی یا زور نہیں کہ ان تیلیوں کو پگھلا دیں۔ اب کیا ہوگا ... صبح ہو رہی ہے یہ صبح ہے کہ اندھیری رات!

اس نے سر سے تکیہ اٹھا کر پھینک دیا اور اٹھ کر کمرے سے بھاگی۔ بڑی بی نے آ کر لالٹین بجھادی جو رات بھر کھڑکی پر رکھی رہی تھی۔

سکینہ آسیبی چھت پر برگد کے سائے تلے بیٹھی رہی۔ اس نے جنگل سے سورج کی نارنجی روشنی کو چھنتے اور دور دور کھیتوں میں تیرتے دیکھا۔ مویشیوں کی گھنٹیاں سنیں۔ جیسے بلور کے پیالے میں چاندی کے چمچے سے شکر گھول جا رہی ہو۔ جو ہوا کل تک بھر کر ناچ کر اٹھی تھی آج اسے ہزاروں من گرد لے کر بیٹھتی ہوئی، دم توڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دھوپ چھاؤں نے ایسی گلکاری کی کہ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں میں بھی روشنی جاگ گئی۔ صرف ایک آن کو۔ پھر یکایک ایک ایسے احساس نے چھاپہ مارا جس سے وہ اب تک ناآشنا تھی۔ یہ تھا ہتک کا احساس۔ جیسے اسے کسی نے کوڑے کے ڈھیر پر اٹھا کر پھینک دیا ہو ... ایک گنوار اور بیوقوف چھوکری۔ بیمار، خوبصورت بھی نہیں۔ جاہل! آخر میرے پاس دینے کو ہے بھی کیا۔ وہ ڈاکٹر ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ اس نے دنیا دیکھی ہے۔ میں کمزور ہوں۔ اور وہ ...... مگر وہ ڈرپوک ہے۔ میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ میں یہاں سے بھاگ سکتی تھی ...... اس سے تو اچھا تھا اس شہزادے کے ساتھ کہیں بھاگ جاتی جو دیواروں سے نکلتا تھا اور دیواروں

میں غائب ہو جاتا تھا .... سنا ہے وہ شہزادہ اب رنڈیوں کے پاؤں دابتا ہے! اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

نیچے سرکار کی آواز سنائی دی: "بھئی سکینہ کہاں ہے؟"

اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ اٹھی اور زینے پر دونوں دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اتر آئی۔ اس کو اپنا آنگن بہت اندھیرا لگا۔ جیسے اب تک رات باقی ہو۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اپنے لیم شحیم بھائی کو دیکھنا چاہا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں تار کا ایک زرد کاغذ تھا... سکینہ کے چہرے پر مسلے ہوئے گیندے کے پھول کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں یوں بند ہوئی جارہی تھیں۔ جیسے بخار سے جل رہی ہوں۔ اس کے نچلے ہونٹ پر ایک بڑا سا سُرخ تل سا نظر آرہا تھا اور اب بھی اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت تل کو لہولہان کر رہے تھے۔ آخر آنکھوں سے دھند چھٹی اور بھائی کا موٹا ہیولا سفید کرتے اور لٹھے کے پاجامے میں ایک بڑے سے گنبد کی طرح اُبھرتا نظر آیا تو اس نے نظریں جھکالیں اور آنچل کے نیچے ہی نیچے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔

بھائی نے اپنی چھوٹی چھوٹی سور جیسی آنکھوں سے باپ کی .... رئیس عبدالستار مرحوم کی سب سے قیمتی امانت کو دیکھا تو اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ گھبرا گیا "ارے پھر بیمار ہو گئی کیا؟ میں نے تو نہ جانے کب سے تمہیں دیکھا ہی نہیں .... ارے .... بوا .... یہ تو ہلدی ہو رہی ہے .... ہلدی .... کیا بات ہے؟"

بڑی بی نے غور سے سکینہ کو دیکھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ "پیر دستگیر .... تیرا صدقہ!"

سکینہ کھلکھلا کر ہنسی اور عبدالجبار کو اس کی آنکھوں میں چراغ جھلملاتے ہوئے نظر آئے تو جان میں جان آئی۔ اس نے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا سکینہ کانپ گئی جیسے قصائی کے ہاتھ کے لمس سے بکری کانپ جاتی ہے۔

"دیکھو بیٹا اب بیمار نہ ہونا۔ ذرا بھی جی برا ہو تو فوراً ڈاکٹر کو بلوا بھیجو۔ آخر ہم پچاس روپے ماہوار مفت کے تو دیتے نہیں ...... اب تم بہت بڑے گھر میں جارہی ہو۔ فخرالدین

بہت شریف نوجوان ہے ...... شہر سے تمہارے لئے کیا منگواؤں ..... گھڑی تو سونے کی خرید لی ہے ۔ اس علاقے میں آج تک کسی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں گھڑی نہیں دی .... لیکن میری بہن تو شہر جارہی ہے ....."

سکینہ کا سر جھک گیا۔ لیکن گالوں پر رنگ نہ آیا۔ "بیاہ کی بات ہو اور گال دھک نہ اٹھیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" عبدالجبار نے سوچا اس کی بہن بہت بیمار ہے۔ وہ فکرمند ہو گیا "شادی جلدی کرنی ہوگی ...... لیکن یہ کمبخت پرمیشر سنگھ ......اور یہ سور کا بچہ ڈاکٹر... سب مجھے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں .... حرامزادو میں تم سب کی قبریں کھدوا دوں گا!"

اس نے پھر ایک بار بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر ایک بار سکینہ کی رگوں میں برفیلا پانی دوڑ گیا۔ اس نے اپنی جھرجھری کو بہت روکا لیکن بھائی کے ہاتھوں کی چربی نے بھی یہ جھرجھری محسوس کر لی۔ وہ مسکرایا۔ "گھبراؤ مت سکینہ .....جی برا ہو تو ڈاکٹر کو بلا لینا ......بوا ڈاکٹر کو بلوا بھیجو!" ......

اب کے سکینہ کے گال دہک اٹھے اور ہونٹ بھنچ گئے۔

17

چند دن اسی طرح بیت گئے۔

رات کا وقت تھا۔ دن بھر کا تھکا ہارا جاوید سگریٹ کی پوری ڈبیہ پھونکنے کے بعد مزید سگریٹ ڈھونڈتے ہوئے اپنی کونے والی میز تک پہنچا تو اس کی نظر فریم سے جھانکتی ہوئی تصویر پر جم کر رہ گئی۔ آج اسے روز کی آنکھوں میں ایک عجیب دردناک شکایت نظر آئی۔

ہونٹوں پر پھیلی ہوئی پھول جیسی معصوم مسکراہٹ سے دھواں سا اٹھا اور سب کچھ ایک زہر خند میں ڈھل کر رہ گیا۔ وہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کا سایہ تصویر کے فریم کو چھپا لے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ ایک بجلی کوندی اور اس کے دل میں تیرتی چلی گئی۔ اس نے فریم اوندھا کر دیا۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں اور گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں گیا۔ سائبان میں جنگلی مردے کی طرح دونوں ہاتھ سینے پر باندھے چت پڑا سو رہا تھا۔ اور پاس ہی پائے سے بندھی ہوئی بکری اس کے پاجامے کا پائنچا چبا رہی تھی۔ جاوید نے باورچی خانے سے بیڑی کا بنڈل اٹھایا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ بیڑی کے دھوئیں کی تلخی اسے اچھی معلوم ہوئی۔ اس سے اس کی زبان اور گلے کی بے حسی دور ہو گئی۔ بیڑی پیتے پیتے رگھوناتھ کا بھیجا ہوا مریض یاد آگیا۔ "نہ جانے کہاں ہو گا...... کون تھا یہ پُراسرار آدمی...... رگھو نے کبھی بتایا ہی نہیں ...... اب کے ملاقات ہو تو پوچھوں۔ تھانیدار اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ اب تھانیدار اور عبدالجبار مجھ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے میرا ایمان، میرا ضمیر خریدنا چاہتے ہیں ...... یہی ایک دولت ہے میرے پاس، اور وہ بھی ...... سلیم بیک وقت کتنا سخت اور نرم تھا ...... یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا کبھی اس سے مل سکوں گا؟"

برآمدے کے دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی جھجکتے قدموں سے اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔

جاوید خاموشی سے قریب آتی ہوئی آہٹ سنتا رہا۔ آہٹ اس کے کمرے کے دروازے پر رُک گئی۔ جاوید نے تھوڑی دیر انتظار کیا اور لیمپ کی لو تیز کر دی۔ بیڑی کے دھوئیں کا پردہ سا سامنے لہرایا اور اس کے پیچھے کمپونڈر درگا پرشاد میلے تہمد اور بنیان میں کانپتا نظر آیا...... اس کی آنکھوں پر عینک نہیں تھی۔ وہ آنکھیں مٹمٹا رہا تھا لیکن اسے دھوئیں کے سوا اور کچھ نظر آیا۔ وہ کھانسا اور کانپتی اور بھرائی آواز میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب ...... ڈاکٹر صاحب ......" وہ دھم سے جاوید کے پلنگ کے کنارے گر گیا۔ ڈاکٹر نے اس کو تھام لیا۔"

"ارے کمپونڈر صاحب یہ کیا گت بنا رکھی ہے..... کیا ہوا چھنو کی ماں سے جھگڑا..... ؟"
کمپونڈر نے خوفزدہ آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تیر رہے تھے جیسے اس نے کسی کا خون کر دیا ہو۔
"کیا ہوا بھئی" ؟ جاوید نے بیڑی کا کش کھینچتے ہوئے پوچھا۔
"ڈاکٹر صاحب میں بڑا پاپی ہوں مجھے بچایئے...... پرمیشر سنگھ کو بچایئے۔"
جاوید جھپٹ کر کھڑا ہو گیا اور درگا پرشاد کے شانے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:
"جلدی بتایئے کیا ہوا پرمیشر سنگھ کو........"
"میں لوبھ میں آ گیا ڈاکٹر صاحب......" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے جاوید کے قدموں پر گر گیا "مجھے بہت ڈرایا تھا کرن سنگھ نے...... اور سرکار نے کہا تھا......"
"مگر بتایئے تو آپ نے کیا کیا......" اس نے کمپونڈر کو اٹھایا اور گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔ جاوید کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔
"میں نے اس کو...... وہ...... انجکشن میں...... وہ...... تھانیدار نے بہت دھمکایا تھا۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ میں بال بچوں والا ہوں۔ ڈاکٹر ہمیشہ خود ہی کرتے تھے...... اب کے پاپی میں بنا...... نہیں چاہیے مجھے روپیہ...... پرمیشر سنگھ کو بچایئے ڈاکٹر......"
جاوید اسی طرح کمپونڈر کو سسکتا چھوڑ کر ہسپتال کی طرف بھاگا پیچھے پیچھے درگا پرشاد ناک صاف کرتے ہوئے دوڑا۔ ہسپتال کے زینے پر چماری تاڑی کے نشے میں ٹرا رہا تھا۔
"ہائے کمہارن کی رانی...... بہت توری بہن کی......"
اس نے ڈاکٹر کو دیکھ کر اٹھنا چاہا لیکن راستے میں جاوید کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا اس کا چہرہ جھنجھنا اٹھا اور وہ چکراتا ہوا بجری پر گرا۔
"ڈاکٹر بابو...... تاڑی پینے والا سور کا موت پیئے...... وہ حرامی منشی ہے نا سرکاری...... تاڑی...... بھنگ...... جانے سرکار کیا...... بہت تری بہن کی

......

وہ اسی طرح لڑھکتا ہوا گھاس تک چلا گیا جہاں کمپونڈر کھڑا سر جھکائے پودے کی طرح کانپ رہا تھا۔

جاوید پرمیشر سنگھ کے کمرے میں پہنچا تو لالٹین پورے زور و شور سے جل رہی تھی اور مریض پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جاوید نے ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور دوسرا نبض پر۔ سب کچھ ٹھنڈا تھا۔ جیسے برف کا تودا۔ اس نے دانت بھینچ لئے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ جاوید نے مریض کو کئی انجکشن لگائے۔ رات بھر اس کا پسینہ پونچھتا رہا اور نبض دیکھتا رہا پوپھٹنے پر پرمیشر سنگھ کی بیہوشی دور ہونے لگی سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ نبض تیز ہوگئی اور ماتھا گرم۔ مریض کے ہونٹ ہلے۔ "مار ما کر ادھ موا کر دیا .... کھدائی ..."

کلیا کو ڈیوٹی پر لگا کر جاوید کوارٹر میں چلا گیا۔

"اب بچ جائے گا .... میں اس کو مرنے نہیں دوں گا .... سمجھوں گا تھانیدار کے بچے سے .... قاتل ...."

وہ ٹہل رہا تھا اور کمپونڈر سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے لعنت بھری قہر آلود نظروں سے کمپونڈر کو دیکھا اور ٹہلتا رہا اور گھنگھریالے خشک بالوں کو سہلاتا رہا۔ کمپونڈر رونے لگا۔

"روتے کیوں ہیں آپ؟ شرم نہیں آتی .... جائیے جا کر پرمیشر سنگھ کو بچائیے۔ شاید آپ کے گناہ کی تلافی ہو جائے!"

"تلافی ......" کمپونڈر ہکلایا، "وہ بچ جائے گا؟"

"بچ جائے گا .... شیر ہے .... بچ جائے گا ...." جاوید نے کرسی میں دھنستے ہوئے کہا۔

کمپونڈر وہاں سے نکلا، گھر گیا، اشنان کیا تھوڑی دیر گیتا کا پاٹ کیا، بھوکا پیاسا ہسپتال پہنچا اور پرمیشر سنگھ کی چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور پرمیشر سنگھ کے بدبداتے ہوئے ہونٹوں کو تکنے لگا۔ جیسے کوئی بچہ اپنے ہاتھوں ٹوٹے ہوئے کھلونے کو جڑتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔

ہسپتال میں مریضوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا بہت دیر بعد جاوید ہاتھ میں آلہ لئے تھکے تھکے

قدموں سے ہسپتال کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں نریش نے اسے روکا۔" کل شام کی ڈاک سے آپ کا خط آیا تھا، مگر وہ آپ کا حیاری آیا ہی نہیں ......"

"شام کو ...... وہ کیا جاتا ...... اس وقت تو کمبخت کسی تاڑی خانے میں پڑا ہوگا۔" اس نے خط لیا تو لکھائی دیکھ کر اس کا دل دھک سے ہو گیا، ہاتھ کانپنے لگا۔ اس نے گھبرائی ہوئی بے چین مسکراہٹ کے ساتھ نریش کو دیکھا۔ نریش نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں؟

"ہاں ...... نہیں ...... کوئی خاص بات نہیں ...... پرمیشر سنگھ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی ...... رات بھر سو نہیں سکا ......" اس نے نیلا لفافہ قمیص کی جیب میں ڈالا اور نریش کے ساتھ ساتھ مریضوں کے ہجوم کی طرف بڑھنے لگا۔

نریش ڈاکٹر اور پرمیشر سنگھ کے بارے میں سوچتا ہوا ڈاک لینے اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔

جاوید کو کوئی ایک بجے نسخوں، مریضوں اور آپریشنوں سے چھٹی ملی۔ دوپہر کی دھوپ پگھلی ہوئی چاندنی کی طرح درختوں، کھیتوں اور سڑک پر پھیلی ہوئی تھی۔ جاوید نے پسینہ پونچھا، پرمیشر سنگھ کو دیکھا اور اس کی بڑبڑاہٹ سن کر مسکرایا۔" یار تم مرنے والے نہیں ہو!"

کوارٹر کی طرف واپس جاتے ہوئے اسے حیاری کھڑا نظر آیا ...... منہ سوجا ہوا، آنکھیں جھکی ہوئی،" اب بھی قصور نہیں ہوگا سرکار۔"

جاوید آگے بڑھ گیا۔ اسے نریش کا خیال آیا اور ہاتھ فوراً جیب میں چلا گیا۔ اس نے تیزی سے نیلا لفافہ نکالا اور نیم تاریک ٹھنڈے کمرے میں بستر پر گر گیا۔ جنگی نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلایا اور وہ چھت کے کالے شہتیر کو گھورنے لگا۔

"کس کی چٹھی ہے ......" جنگی نے اس کے ہونٹوں پر ایک گھبرائی ہوئی مسکراہٹ کو پرتولتے ہوئے دیکھا، خود بھی مسکرایا اور گلاس بجاتا ہوا نکل گیا ...... مسیحا بن کے بیماروں کو کس پر چھوڑے جاتے ہو ...... کس پر چھوڑ ...... ارے ہاں۔

جاوید نے لفافہ چاک کیا۔ روز کا خط تھا۔ ہر دو تین سطروں کے بعد جملے کٹے ہوئے تھے اور ان پر اس طرح روشنائی پھیری گئی تھی کہ ہزار کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہ پڑھا

جائے۔ جاوید کو خط کے ایک ایک لفظ سے دھند اٹھتی ہوئی نظر آئی۔ رفتہ رفتہ دھند چھٹ گئی۔ "میں اپنے ایک دوست کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے تمہارا پتہ بتادیا...... اور وہ بھی اتفاق سے...... جیسے زندگی میں اور بہت سے خوشگوار اتفاقات ہوتے ہیں...... سُنا ہے تم اپنے کام میں تن من دھن سے محو ہو! اچھا ہے کام سے من کو بڑی شانتی ملتی ہے۔ لیکن تم ملنے کیوں نہیں آتے بالکل بھول گئے ؟ آخر دوستی کو کیوں مٹاؤ۔ بابا بھی تمہارے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اب انہوں نے گرجا جانا بند کر دیا ہے۔ آج کل صبح کو گیتا پڑھتے ہیں اور شام کو بائبل...... کہتے ہیں جس جنت کی تلاش میں میں نے اپنے بال سفید کر لئے وہ نہ گیتا میں ہے نہ بائبل میں ہے۔ بائبل پڑھنے کے بعد ان کو تمہاری یاد آتی ہے...... یاد ہے نا تم نے ایک بار خدا کے سوال پر کتنی عجیب باتیں کہی تھیں تو وہ ڈر گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھ پر چوٹ کرتے ہیں، وہ تمہارا سر پھرا دوست کہاں گیا ...... گریبان پھاڑ کر جنگل میں تو نہیں نکل گیا؟ کس ٹھاٹ سے کہتا تھا ہمارے پاس ماضی اور حال کے سوا کچھ نہیں ...... مستقبل کی باتیں بھلاوا ہیں، محض رومانی فریب......

"لیکن تم تو یہ باتیں بھول چکے ہو گے! کاش تم یہاں آتے۔ ؛ راگپ شپ ہوتی، دھوپ چھاؤں میں آوارہ پھرتے...... ان ہی جگہوں میں...

"میں نے ایک بہت ہی گندی گلی میں اپنی چھوٹی سی ڈسپنسری کھول لی ہے۔ زیادہ تر بیڑی مزدوروں، رکشا والوں، اور کھولیوں میں رہنے والوں کا علاج کرتی ہوں۔ جب تک کام کرتی ہوں خوش رہتی ہوں...... "اس کے بعد کی تین چار سطریں کٹی ہوئی تھیں اور ان کو اتنی شدت سے کاٹا گیا تھا کہ کاغذ بھی کٹ گیا تھا،" ایک دن میں اکیلی بوٹانیکل گارڈن گئی تھی... بڑی دیر تالاب کے کنارے گھنے درخت کے نیچے بیٹھی رہی۔ چاندنی رات تھی اور میں بہت تھکی ہوئی تھی...... خیر چھوڑو اس میں کیا رکھا ہے!"

خط کے آخر میں بہت ہی جھجکتی ہوئی لکھائی میں چند الفاظ بہت سوچ سمجھ کر لکھے گئے تھے......

"جب بھی فرصت ملے ضرور آؤ۔ اپنے اس شہر کو مت بھولنا جس نے تمہیں نبض

پر انگلیاں رکھنا، زخم پر نشتر چلانا اور ڈوبتی ہوئی کشتیوں کو بچانا سکھایا ہے ......'

نام سے پہلے ایک لفظ کٹا ہوا تھا۔ لیکن ذرا سی کوشش سے پڑھا جا سکتا تھا "تمہاری"

آتشبازی سی چھوٹی اور اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کا دل ڈوبتا چلا گیا۔ دوبارہ خط پڑھنا چاہا، مگر ہمت نہیں پڑی۔ آخر خط کو تکیے کے نیچے رکھ دیا اور سونے کی کوشش کی۔ جنگی کی گنگناتی ہوئی آواز قریب آ رہی تھی: "تسلی بھی دیے جاتے ہو دل بھی توڑ جاتے ہو ...... مسیحا بن کے ...... 'جاوید نے آنکھیں بند کر لیں ... "جاوید میاں کھانا ...... ارے تم تو سو لیے ...... لو ...... اور میں نے ایسی بڑھیا تگڑی کڑھی بنائی ہے کہ ہونٹ چاٹتے رہ جاؤ گے، میاں ...... جاوید میاں' " وہ نہایت ہٹ دھرمی سے داڑھی کھجاتے ہوئے آواز دیتا رہا مگر جاوید نے آنکھ نہ کھولی۔ جنگی بڑبڑاتا ہوا باورچی خانے چلا گیا۔ اور اتنے زور زور سے برتنوں کو اٹھا کر پھینکنے لگا کہ جاوید گھبرا کر اٹھ بیٹھا ..... بند کھڑکی سے چھنتی ہوئی ایک ترچھی زرد کرن اس کے بالوں پر ناچنے لگی۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ اچانک یاد آیا سرکار نے طلب کیا ہے۔ اس نے شام کی چائے پی اور جنگی کے ہزاروں سوالوں کے باوجود خاموش رہا۔ چہرے سے صاف جھلک رہا تھا کہ کسی اندرونی جدوجہد میں گرفتار ہے۔

دربار کے زینے پر چڑھتے ہوئے اسے پیچھے پر تھانیدار کی خاکی وردی اور منشی کی سفید ٹوپی نظر آئی۔ اس کا خون کھول گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ آج سرکار سے اس کی ٹکر ہو کر رہے گی۔ آخر کب تک ...... وہ مضبوط قدموں کے ساتھ دربار کی بیٹھک میں داخل ہوا۔

ابھی بھرپور گرمی نہیں تھی لیکن بیٹھک کے دریچوں پر خس کی بھیگی ہوئی ٹٹیاں مہک رہی تھیں۔ نیم تاریک کمرے میں خنکی سی تھی۔

عبدالجبار نے چھوٹتے ہی کہا۔

"ڈاکٹر میں نے تمہاری بڑی شکایت سُنی ہے۔"

"شکایت؟"

"ہاں،" جاوید نے اس ہاں میں چھپی ہوئی دھمکی محسوس کر لی۔

"کیسی شکایت؟" جاوید نے غصہ دباتے ہوئے پوچھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"سوچتا تھا تم ایمانداری سے کام کرو گے... جوان ہو....."

"عبدالجبار صاحب میں ایمانداری سے کام کرتا ہوں اور خود اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں۔"

عبدالجبار اس کے لہجے سے چونک گیا اور زہریلی اور بپھری ہوئی نظروں سے اسے گھورا۔ دونوں نگاہوں نگاہوں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے۔

"تم نے پرمیشر سنگھ کے بارے میں غلط رپورٹ کیوں لکھی؟" سرکار غرائے۔

جاوید کو لگا کہ سرکار کے جسم میں ہزاروں نیزے اگ آئے ہیں اور اس کی طرف نشانہ باندھ رہے ہیں۔ اس نے دانت پیس کر کہا: "میں نے پرمیشر سنگھ کے بارے میں جو ٹھیک سمجھا لکھا۔"

"یہ میرا علاقہ ہے ڈاکٹر، میرے ٹکڑوں پر سیکڑوں پلتے ہیں۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر، میرے اشارے پر کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"عبدالجبار صاحب آپ چٹان پر گولیاں چلا رہے ہیں۔" جاوید نے دانت بھینچ کر کہا۔

"تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔ میں خاموش رہا۔ سوچتا تھا تم خود ہی راہ پر آجاؤ گے۔ لیکن تمہاری خود سری بڑھتی جا رہی ہے۔ خبردار جو ایسا قدم اٹھایا جس سے دربار پر چوٹ پڑتی ہو۔ یہ ہسپتال میرا ہے۔"

ہسپتال کسی کا بھی ہو ڈاکٹر لوگوں کا خادم ہوتا ہے۔ کسی دربار کا........" اس نے جملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ عبدالجبار نے میز پر ہاتھ مارا۔ پان کی طشتری فرش پر گری اور گلوریاں بکھر گئیں۔

جاوید ایک منٹ کو رکا پھر بولا: "میں کسی سے نہیں ڈرتا عبدالجبار صاحب، آپ بھی کان کھول کر سن لیجیے۔ موم کی ناک نہیں ہوں اپنا راستہ خود بنا سکتا ہوں۔ یہ دھمکی....."

"اچھا تو بنا لو راستہ...... میں تو تمہارے بھلے کو کہتا تھا یہ پہلا ہسپتال ہے۔ یہاں نام پیدا کرو، مقدر بناؤ....." اس کی آواز نرم پڑنے لگی۔

"مقدر کے نام پر مجھے کوئی خرید نہیں سکتا....." جاوید کھڑا ہو گیا۔

"سوچ لو......اس کا انجام برا ہوگا،" عبدالجبار کے لہجے میں دھمکی کا رنگ تھا۔

"انجام......دیکھا جائے گا......" جاوید نے ایک ڈرامائی بے پروائی سے کہا اور عبدالجبار کو بڑی نفرت سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

جب ڈاکٹر پیپل کے درخت کے پاس سے گزرا تو ماسٹر شاہ عالم اور مولوی بڑے شوق سے لپک کر مکتب کے برآمدے میں آئے اور سلام کیا۔ ڈاکٹر اپنی دھن میں سیدھا اسپتال کی طرف بڑھتا رہا۔ مولوی اور ماسٹر نے بیل جیسی آنکھیں نکال کر دیکھا......ماسٹر نے توند پر ہاتھ پھیر کر لاحول بھیجی اور مولوی نے داڑھی کے "بال چوستے ہوئے کہا، نعوذ باللہ......"

کرن سنگھ نے ڈاکٹر کو جالیا۔ ہسپتال کے احاطے میں پہنچتے پہنچتے کرن سنگھ نے جاوید کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جاوید نے کندھے جھٹک دیے اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

شام ہو رہی تھی اس لئے کرن سنگھ کو ان بپھری ہوئی آنکھوں کا رنگ دکھائی نہ دے سکا۔

"آسمان کا رنگ کچھ بے ڈھب نظر آتا ہے۔ لگتا ہے کہ طوفان آئیگا..." کرن سنگھ نے کھسیاہٹ مٹانے کے لئے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا۔

"آنے دیجئے، میں طوفان سے نہیں ڈرتا......" جاوید نے بھی آسمان کی طرف دیکھا۔

آسمان گرد سے ڈھکا ہوا تھا۔ شام گھٹاؤں کی طرح گھر کر آرہی تھی۔ اُدھر گرد غبار کا رنگ ڈوبتے سورج کے عکس سے آگ کی طرح دھک اُٹھا تھا اور اس عکس میں کووں اور بگلوں کے جھنڈ دور اڑتے نظر آرہے تھے۔ "طوفان آتا ہے اور اڑنے والے اڑتے ہیں،" جاوید نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ کرن سنگھ اکڑ گیا۔

کوارٹر کے برآمدے میں پہنچتے ہی جاوید نے کرن سنگھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جنگی کو پکار کر لالٹین لانے کے لئے کہا۔ یکایک درخت جھومنے لگے۔ ہوا ناچ کے اُٹھی اور شاخیں شائیں شائیں چیخنے لگی۔ بیلے، جوہی اور گلاب کے پودے تک لرزنے لگے جیسے کوئی اُن کو جڑ سے

سوچ رہا ہو۔ جنگلی کے لالٹین لانے کے باوجود اندھیرا چھا گیا اور ہر چیز تاریکی میں ڈوب گئی۔ لالٹین کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں تھانیدار اور ڈاکٹر ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ کرن سنگھ نے مسکرا کر مونچھوں پر تاؤ دیا اور بڑی نرم آواز میں پوچھا:

"ڈاکٹر آج سرکار سے کیا بات ہوئی؟"

"آپ کو بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے ......"

"بھلا دلچسپی کیوں نہ ہو۔ اس علاقے کی دھوپ اور ہوا میں جیتا ہوں۔ آخر یہ کوئی مذاق تو ہے نہیں۔"

"کیا مذاق نہیں ہے؟" جاوید بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "سگریٹ..."

کرن سنگھ نے سگریٹ سلگائی۔ دھوئیں کا بڑا سا کش کھینچا اور تیز ہوا میں اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا: "ڈاکٹر میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ میرا بیٹا یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ میرے نجانے کتنے چھوکرے، گوالے، کمہار، چمار...... گاؤں گاؤں میں مویشی چراتے ہیں، نہ جانے کتنی راتیں ان رانوں کے بیچ سے مچھلی کی طرح تڑپ کر گزر گئی ہیں:" اس نے رک کر گہرا سانس لیا..... ڈاکٹر بھری ہوئی نگاہ سے اس بھیڑیے کو دیکھ رہا تھا۔ "میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تجربے کی کہتا ہوں۔ دریا میں رہنا ہے تو مگر مچھ سے جھگڑا مول نہ لو......"

"سرکار کی وکالت کرنے آئے ہیں آپ؟"

کرن سنگھ اچھل کر جاوید کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میاں تم پر ترس آتا ہے مجھے۔" ......" اس نے جاوید کا بازو پکڑ لیا۔" میں خود اس بھیڑیے اور بکری کے کھیل سے تھک چکا ہوں۔ یہ علاقہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ آئے دن خون، فساد۔ لیکن ہم جیسوں کے لئے راستہ بھی کیا ہے؟"

"راستہ ......راستہ ہے ......" ہوا کا زور تھم گیا تھا اور آسمان میں اکا دکا ستارے ٹمٹمانے لگے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب چکی کے پاٹ میں پسنے سے یہ بہتر ہے کہ آدمی چکی کا ستھ بن کر ساتھ ساتھ گھومتا رہے......"

"اچھا؟" جاوید نے مسکراتے ہوئے پوچھا "تھانیدار صاحب آپ اپنے فن کے استاد معلوم ہوتے ہیں ......"

"میاں میرا فن ہی کیا ہے ..... ڈانٹ، گالیاں اور ہنٹر ..... ڈاکٹر سنو ..... پینترے نہ باندھو صاف بتاؤ تم تھانے کے خلاف کیوں ہو؟"

"میں تھانے کے خلاف کیوں ہوتا؟"

"مجھے کیوں نہیں تم سرکار سے ٹکرا رہے ہو۔ خود بھی ڈوبو گے دوسرے بھی مارے جائیں گے۔"

"کون؟ .... آپ کا مطلب ہے پرمیشر سنگھ ....."

کرن سنگھ اچھل پڑا جیسے انگاروں پر پاؤں پڑ گئے ہوں۔

"کیوں یہ پرمیشر سنگھ کہاں سے آ گیا ... دیکھو اب بھی وقت ہے سرکار سے سمجھوتہ کر لو۔ دام کھرے ملتے ہیں دربار سے ......"

"تھانیدار صاحب .... آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں۔ اتنی آسانی سے مجھے پھانس لیں گے۔ میں آپ کی کشتی میں سوار نہیں ہو سکتا......"

"بھولتے ہو ڈاکٹر ..... ہماری کشتی میں تو تم ہو اور بیچ منجدھار میں ہو..... خیر .... تم جانو تمہارا کام ..... شاید جنگل اور پہاڑ کی کہانی نہیں سنی تم نے۔ اس شنکری ندی میں نہ جانے کتنے بیوقوفوں کی لاشیں تیر چکی ہیں۔"

"جی ہاں وہ لاشیں بیوقوفوں کی ہی ہوں گی ......"

لمحے بھر خاموش رہ کر کرن سنگھ مسکرایا اور بولا۔

"میں تمہارا دوست ہوں ڈاکٹر ...... جب کبھی ضرورت ہو مجھے یاد کرنا .... تمہارے کام آؤں گا ....."

"آپ کے وعدے پر پورا بھروسہ ہے مجھے ...." جاوید کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری..... کرن سنگھ اٹھا اور چل دیا۔ اس کے جاتے ہی نرگس آن دھمکا۔

نرگس کے بال پیشانی پر جھک آئے تھے اور چیچک کے زرد داغ اور زیادہ گہرے

معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے آتے ہی ڈاکٹر کا ہاتھ تھام لیا: "جاوید صاحب ہوشیار رہیے۔"
"کیوں کیا ہوا......؟"

"میں نے بہت بری بری باتیں سنی ہیں ....اب ہوشیار ہو جایئے ایک تو راتوں کو مریض دیکھنے گاؤں سے باہر نہیں جایئے اور اگر جایئے بھی تو بندوق ضرور ساتھ لے جایئے۔ اور چماری یا کلیا کو ساتھ رکھیے ......"

جاوید کا گلا خشک ہو گیا۔ ایک لمحے کو ایک پُراسرار خوف نے اس کے دل پر چھاپہ مارا۔ پھر وہ سنبھل گیا۔ اور آہستہ سے بولا: "کیوں نریش بابو کیا بات ہے۔ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ کیا سن لیا آپ نے؟"

نریش نے بہت غور سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ "جاوید صاحب آپ نے پرمیشر سنگھ کو بچا لیا۔ یہ آپ کا بہت بڑا قصور ہے۔ آپ کا یہ قصور رنگ لائے گا..... لیکن پرمیشر سنگھ کا پورا گاؤں آپ کی پیٹھ پر ہے ......"

وہ اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کو بلایا لیکن وہ پھولوں کی کیاریوں سے آگے کولر کے پیچھے غائب ہو چکا تھا۔

جاوید سگریٹ سلگا کر اپنے خیال میں ایسا گم ہوا کہ جلتے جلتے سگریٹ نے انگلیاں جلا دیں تب وہ چونکا۔ سامنے درگا پرشاد تھالی میں کچھ لیے کھڑا تھا۔

"ارے یہ کیا؟"

درگا پرشاد نے تھالی سامنے اسٹول پر رکھ دی۔ دال کی پوریوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ اور آم کے اچار کی خوشبو جان لیوا تھی۔

"بھئی میرے تو منھ میں پانی بھر آیا۔" جاوید چٹخارے کے ساتھ پوریوں پر ٹوٹ پڑا اور اس کا منہ جل گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ درگا پرشاد کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور پان سے بھیگے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے...... بڑھتی ہوئی گرمی، شام کی آندھی، ہسپتال میں دوا کی کمی اور آخر میں پرمیشر سنگھ اور دربار کی باتیں .....

"وہ لوگ مجھے دھمکی دے رہے ہیں ...... اب بھگوان جانے میری نوکری رہتی ہے یا جاتی ہے ...." درگا پرشاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کمپونڈر صاحب پروا نہ کیجیے ...... آپ کا بال بیکا نہ ہوگا ان بدمعاشوں سے ......"

جاوید دانت پیس کر خاموش ہو گیا۔

کمپونڈر کے جانے کے بعد جاوید نے روز کی تصویر صاف کی چپکے سے اسے پیار کیا اور خود ہی کھسیا گیا۔ لیک کر اپنے کمرے میں گیا اور تکیے کے نیچے سے نیلا لفافہ نکال کر خط پڑھنے لگا ...... دیر تک آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ کبھی ایک سانولا۔ سبک سا بنگالی چہرہ اُبھرتا اور کبھی پسینے میں ڈوبا ہوا ایک معصوم مکھڑا اُبھرتا۔ ہرن کی طرح ڈری ہوئی آنکھیں بند ہوتیں اور کھلتیں ...... ایک تل پسینے میں تیرتا ..... اور ان جلووں میں نرگس کی آواز گونجتی رہی "..... ہوشیار ...... ہوشیار .... ہوشیار ...." جاوید کی آنکھ کھل گئی ..... رفتہ رفتہ یہ آواز دور ہو گئی پھر بجلیاں چمکنے لگیں۔ ہرن کی آنکھیں کھلنے اور بند ہونے لگیں ...... رات بھر آندھی سی چلتی رہی درختوں کو زمین سے اکھیڑ اکھیڑ کر پٹکتی رہی اور ان کے پتے اُڑتے رہے .... صبح ہوتے ہوتے وہ تکیے میں منہ ڈالتے ہوئے بڑبڑایا ......"یہ زندگی بھی آندھی سے کیا کم ہے .... اور یہ بکھرتے ہوئے پتے .....

18

جیٹھ کے جھکڑ اور لو نے درختوں کے پتوں اور شاخوں پر گرد کی تہیں جما دی تھیں۔ لیکن پیپل کے پتلے پتلے پان جیسے اور برگد کے موٹے پتے ہوا کے جھونکوں سے ٹوٹ کر گھروں میں گرتے اور مسجد کے صحن میں سرسراتے رہتے۔ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد

بعض نمازی اپنے سر پر گمچھا یا تولیہ ڈال کر مسجد کے اندر ہی لیٹ جاتے یا قرآن کی تلاوت کرتے رہتے اور جب زیادہ پیاس لگتی تو دوڑ کر جاتے اور حوض سے مٹی کے کوزے میں پانی نکالتے اور غٹا غٹ پی جاتے۔ حوض کے پانی کا رنگ دیواروں پر جمی ہوئی کائی کے عکس کی وجہ سے سبز نظر آتا، اور مسجد کے گنبد پر چمکتی ہوئی دھوپ کا چاندی جیسا عکس سبز پانی سے ٹھنڈک چھیننے میں ناکام رہتا۔ جہاں جہاں کھیتوں میدانوں اور پہاڑی ڈھلانوں پر چھتنار درخت تھے وہاں گائیں بھینسیں اور بکریاں سائے میں بیٹھی رہتیں۔ اس چلچلاتی دھوپ میں بھی کسان کدالیوں اور کھرپیوں سے مٹی کھودتے رہتے اور ان کے کالے جسم زمین میں دفن ہوتے اور اگتے ہوئے نظر آتے۔ سورج ڈوبنے کے بعد بھی لو چلتی رہتی اور لوگ شربت اور ٹھنڈا پانی پی کر گلا تر کرتے مگر اندر کی آگ پھر بھی نہ بجھتی۔ لوگ دیواروں سے ہٹ کر بیٹھتے تھے اور لوگ کہتے: "اماں ان دیواروں پر تو چپاتیاں سینک لو۔" رات کے وقت آسمان بالکل صاف ہو جاتا اور ایسا چراغاں ہوتا ایسی خنک ہوا جنگل کی طرف سے بہتی کہ گلی گلی میں کھیتوں اور میدانوں میں لوگ گھوڑے بیچ کر سوتے۔ البتہ کبھی کبھی سانپ نکل آتے اور کسی غریب کو سونگھ لیتے تو خاصا کہرام مچتا۔ چھومنتر کا بازار گرم ہوتا، کوڑیاں اڑائی جاتیں۔ سانپ گرفتار کر کے بلوائے جاتے اور وہ دوبارہ اپنے شکار کو ڈستے تب کوڑیاں ان کی جان چھوڑتیں۔ شکری ندی کا پانی اور پگھلا اور ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لیکن اس میں ہر روز لاشیں بہائی جاتی تھیں کیونکہ چاروں طرف ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کے گھر اجڑ رہے تھے۔ بھیانک اداسی اور وحشت پھیلی ہوئی تھی۔ پھر ایک دن مسجد کے سائے میں ایک فقیر نے ڈیرہ جما لیا...... وہ درود پڑھتا اور انگلی کے اشارے سے گاؤں کا حصار کھینچ دیتا، تاکہ بلا اس خیالی دائرے کے اندر قدم رکھنے نہ پائے۔ گاؤں والوں کو اس پر بہت اعتقاد تھا۔ کیونکہ اب تک بس ایک گڈریے کے سوا کسی کی موت نہیں ہوئی تھی۔ ویسے کہاروں کے ٹولوں میں دو تین اس وقت بھی اس موذی وبا کے چنگل میں تڑپ رہے تھے۔ کنوؤں میں سفید سفوف یا لال دوا ڈال دی گئی تھی اور لوگ پانی پیتے وقت اپنی اپنی ناک بند کر لیتے تھے۔

ان دنوں جاوید کا زیادہ وقت گاؤں سے باہر انجکشن لگانے اور مریضوں کو دیکھنے میں

گزرتا تھا۔ وہ کمپونڈر پر ہسپتال چھوڑ کر دن دن بھر کو غائب ہو جاتا۔ کبھی رات گئے واپس آتا کبھی دوسرے دن۔ دو دو تین تین دن شیو نہ کر پاتا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے سے مسکراہٹ چھن گئی تھی۔ اور اس سے زیادہ اداس اور فکرمند جنگلی تھا۔ کبھی کبھی جھلا کر کہتا ...."سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے ...."

"میرا دل اتنا بڑا کہاں ؟" وہ جنگلی کو چڑاتا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ نُوا مر گئیں۔ ان کی دل کی دل ہی میں رہ گئی ورنہ تم اس وقت اپنی جندگی سے یوں نہ کھیلتے ...... اللہ رحم کرے!" وہ کھانستا ہوا اور زور زور سے پاؤں پٹکتا ہوا باورچی خانے میں جاتا اور بیڑی سلگا کر خدا اور ڈاکٹر دونوں کا حساب برابر کرنے لگتا۔

روزانہ، جیسے ہی جاوید گھوڑے کی زین پر بیٹھتا جنگلی لپک کر بندوق ہاتھ میں پکڑا دیتا اور کہتا، جھکو .... اور چمڑے کا کتھئی بار اس کی گردن میں ڈال دیتا۔ جاوید ہنستا اور کہتا، "جنگلی میاں ....تم نے مجھے ڈاکٹر سے فوج کا سپاہی یا کم از کم شکاری تو بنا ہی دیا۔ مگر شکاری ہر روز خالی ہاتھ، واپس آتا ہے!" وہ قہقہہ لگاتا اور مہمیز لگاتے ہوئے تاڑوں کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

جنگلی معنی خیز نظروں سے درگا پرشاد کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہتا: "تم نہیں جانتے کس نیک بخت کی امانت ہو .... کہاں آن پھنسے ان بھیڑیوں میں!"

ایک روز رات بہت نکل چکی تھی جاوید نڈھال اور تھکا ہوا ایک سنسان کھنڈر کے پاس چکنی مٹی پر دلکی چال سے گھوڑے کو دوڑا رہا تھا۔ فضا میں کچے آم کی خوشبو بسی ہوئی تھی..... اس نے بائیں طرف لٹکتی چاندنی میں سوئے ہوئے کھنڈر کو دیکھا تو لگا جیسے کھنڈر سانس لے رہا ہو۔ سُنا ہے اس کھنڈر میں بھوتوں کا بسیرا تھا جو رات کے مسافروں پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں خود بخود بجلی دوڑ گئی اور لگام کو جھٹکا لگا۔ گھوڑے کی چال تیز ہو گئی اس نے ڈھلان سے اتر کر کنارے کنارے چمکتے سائے کی طرف گھوڑے کا رخ موڑا ہی تھا کہ اسے کھنڈر کے کئی بھوت دوڑتے ہوئے اور اپنی طرف جھپٹے نظر آئے۔ گھوڑا بھنک کر کھڑا ہو گیا۔

ان بھوتوں کے ہاتھوں میں نہ جانے کیا چیزیں سروں کے اوپر اٹھی ہوئی چمک رہی تھی ...... "گھیر لے ..... گھیر لے .... جانے نہ پائے ...." جاوید چونکا اور بندوق تان کر گولی چلادی۔ پوری وادی میں بجلی سی کڑکی۔ بھوت فوراً بکھر کر غائب ہو گئے پھر سناٹا چھا گیا۔ جاوید گھوڑے کی گردن پر جھکا ہوا بجلی کی طرح اڑا چلا جارہا تھا۔ ہسپتال والی سڑک پر پہنچ کر ریلوے لائن کو پار کرتے ہوئے اس نے ریل گاڑی کے چیخنے کی بھی پروا نہ کی۔

کوارٹر کے سامنے پہنچ کر بھی اس نے لگام نہیں کھینچی۔ گھوڑا خود ہی رکا اور کلیا کو دیکھ کر ہنہنانے لگا۔ جب جاوید دیر تک زین پر بیٹھا رہا تو جنگلی نے اسے غور سے دیکھا اور پوچھا۔

"........ جاوید میاں بندوق کا خول کہاں پھینک آئے ؟"

جاوید دھڑ سے کودا اور جنگلی سے لپٹ گیا....... "تڑاخ تڑاخ تڑاخ۔"

مسجد کے مینار جھلملانے لگے۔ دربار کی طرف آسمان میں ہری لال اور پیلی چنگاریوں کا چمن کھل اٹھا اور ایک سرخ ستارہ بڑے دھماکے سے آسمان میں اڑتا چلا گیا۔ اوپر جاکر ایک بار دھماکہ ہوا اور چنگاریاں آبشار کی طرح زمین پر گرنے لگیں۔ پٹاخے پھٹتے اور مسجد اور ہسپتال کی دیواروں سے ٹکرا کر جنگلوں اور پہاڑیوں کا دل دہلا دیتے۔ جاوید ان چنگاریوں کو دیکھتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ ہوا کی خنکی سے آہستہ آہستہ پسینہ سوکھ گیا۔ وہ خیالوں میں ڈوبا ہوا اسپتال کے پیچھے پہنچا۔ تو اچانک پرمیشور سنگھ اچھل کر چارپائی سے اٹھا..... "ڈاکٹر بابو ...... کل تو میری پٹیاں کھل جائینگی نا ؟" پرمیشور سنگھ کی کھرج دار آواز پٹاخوں کے شور کے باوجود صاف سنائی دی۔ جاوید نے مڑکر دیکھا۔ اسے چاندنی میں پرمیشر سنگھ لمبا تڑنگا تگڑا ہیولا نظر آیا ..... سر پر سفید پٹیوں کی گیند سی چمک رہی تھی۔ دو مہینے پہلے یہی آدمی کس طرح لہولہان آیا تھا۔ اور ....

اب دیکھو .... اسے کرن سنگھ اور عبدالجبار کا خیال آیا اور ساتھ ہی درگا پرشاد کا۔ اس کی سانس گھٹنے لگی۔ "ہاں کل پٹیاں کھل جائیں گی .... لیکن تم اب تک سوئے کیوں نہیں ؟"

پرمیشر سنگھ نے چارپائی پر گرتے ہوئے زور سے قہقہ لگایا .... "جرا آگ کی بہار

دیکھ رہا ہوں .... چنگاریاں اڑتی ہیں تو .... " جاوید کو لگا کہ اس کے مریض کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل نکل کر دربار کی طرف اڑ رہی ہیں۔ "دربار کا کلیجہ کھو سی سے پھٹا جا رہا ہے ......"

جاوید کے دماغ میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ وہ تیزی سے گھر گیا اور لیمپ سامنے رکھ کر شیو کرنے لگا۔ ہاتھ میں سیفٹی ریزر لرز رہا تھا۔ پھر تیزی سے کپڑے بدلے۔ کالی اچکن پہنی تو اندازہ ہوا کہ وہ پہلے سے بہت دبلا ہو گیا ہے۔ جنگی اسے ڈری ڈری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ کہاں چل دیئے اتنی رات گئے ؟"

"دربار ......" جاوید نے ایک عجیب زہریلے لہجے میں کہا۔

"کیوں ...... تم تو بہت دنوں سے نہیں جاتے وہاں ...... آج کیا سی بات ہو گئی ؟"

"لیکن آج تو جاؤں گا ...... سکینہ کی شادی ہے ......" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"بندوق کی نال رات ہی کو صاف کر دینا ......"

"پہلے ہی صاف کر چکا ......" جنگی نے اندرونی غصہ کو دباتے ہوئے کہا۔ لیکن جاوید جواب سنے بغیر ہی باہر نکل گیا تھا۔ جنگی نے سر پیٹ لیا اور رو کر بولا۔ "جاوید میاں چلے کیوں نہیں جاتے یہاں سے ...... آج تو بیٹا آنکھیں باپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی ہیں ...... جیسے خون اتر آیا ہو۔"

جاوید دربار پہنچا تو گلاب، کیوڑے، پان، تمباکو، عطر اور میوے کی ملی جلی خوشبو نے اس پر حملہ کیا۔ اندر سائبان میں ساتواں دسترخوان بچھ رہا تھا۔ بڑے سے پختہ صحن میں براتیوں کے سفید سفید پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ کہاروں کے چھوکرے بڑے بڑے قد آدم پنکھے گھما رہے تھے ...... کبھی کبھی نظر بچا کر دسترخوان کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے جہاں سے اٹھتی ہوئی پلاؤ، چھاچھ، قلیے، متنجن اور زعفرانی کی خوشبو جان لیوا تھی۔ وہ بھر بھر منہ تھوک گھونٹ رہے تھے۔ جیسے گلے سے شربت اتار رہے ہوں۔ براتی شربت پلانے والی ماماؤں اور جوان چھوکریوں سے فحش مذاق کر رہے تھے ...... وہ اس رنگین روایت کا پورا فائدہ اٹھانے میں بھانڈوں کے بھی کان کتر رہے تھے۔ بعض چھوکریاں تو منہ پر آنچل رکھ کر پھلوں

سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح لچک جاتیں۔ لیکن جو ذرا جہاں دیدہ، اور منہ پھٹ تھیں، ہر طرح کا طوفان سہار چکی تھیں، وہ لچکتیں ضرور، پھریری بھی لیتیں، لیکن اٹھلا کر ٹھینگا دکھا دیتیں اور چہکتیں: "میاں سرم کرو .... تمہاری ماں بہن ہیں ......" براتی قہقہہ لگاتے اور حقے کی نے سے کش چھوڑتے ہوئے کہتے: "سسرال میں ماں بہن کا کیا کام، ہم تو یہاں قلعہ فتح کرنے آئے ہیں ......" کوئی طرار عورت کہتی: "اے میاں تمہارے بھی کلّے ہیں ...... ان کو چیلنج کرنے والا کوئی بانکا بھی تو موچھوں پر تاؤ دیتا ہوگا ...."

براتی کھسیا کر عورت کے سینے پر ہاتھ مار دیتا، کبھی منزل تک پہنچتا، کبھی چاندی کے کنگنوں کی چوٹ کھا کر ٹھنڈا ہو جاتا۔ "کراری ہے ...... سالی!" چاہے وہ گندھے آٹے کی طرح پھسپھسی ہی کیوں نہ ہوتی۔

ایک کونے میں ذرا بڑے بوڑھے قسم کے چھ سات بوڑھے براتی، کاروبار پر بحث کر رہے تھے اور دسترخوان سے دور جہاں کرسیاں رکھی تھیں نوجوان اور شہری قسم کے براتیوں کا جمگھٹ تھا۔ ان میں سے بعض بار بار ہنڈے کی روشنی میں اپنی چست پتلونوں کی کریز ٹھیک کر رہے تھے یا چمکتے ہوئے جوتوں کا جائزہ لے رہے تھے، ساتھ ہی ہوا میں رومال بھی ہلا رہے تھے۔ ان سبھوں نے فخرالدین کو گھیر رکھا تھا۔ دولھا جو ٹھہرا۔ کارچوبی شیروانی، بادامی ساٹن کا چوڑی دار پاجامہ بھوری آنکھوں میں کاجل، اور کالے چہرے پر ابٹن کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ سر پر بندھے ہوئے گلابی صافے پر سہرے کی لڑیاں اور پھول لپٹے ہوئے تھے۔ عبا کی وجہ سے حضرت بغدادی سوداگر لگ رہے تھے۔

جاوید کو دیکھ کر وہ چلایا .... "اوہو ڈاکٹر جاوید .... دوست ادھر آؤ ...... میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا ...... ارے تمہارا منہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

جاوید نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ دبایا تو اس کی انگلیوں میں انگوٹھی کا نگ چبھ گیا۔

"ابھی ابھی مریضوں کو دیکھ کر لوٹا ہوں۔ ہیضہ پھیلا ہوا ہے ....."

فخرالدین کے دوست ڈر کر سمٹ سے گئے جیسے ہیضے کے کیڑے ان کی طرف اڑ رہے ہوں۔ جاوید کو ان کی گھبراہٹ سے بڑا لطف آیا۔

عبدالجبار اپنے ہلکے سفید کپڑوں میں دور کونے میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ پاس ہی کرن سنگھ کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ آج بھی کرن سنگھ اپنی وردی میں تھا۔ منشی بار بار دونوں کے پاس آتا اور کچھ حکم لے کر چلا جاتا ...... جاوید اٹھا اور اس کونے کی طرف بڑھا۔ فخرالدین نے اسے روکا ...... لیکن جب وہ نہیں رکا تو اس نے زور سے کہا "دوستو آپ ہی ہیں وہ بزرگ ...... فرہاد!" زوردار قہقہہ بلند ہوا .... "اوہ ..... اچھا!" لیکن جاوید نے نہ یہ فقرہ سنا اور نہ قہقہہ۔ اس کے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی "گھیر لے ..... گھیر لے ...... جانے نہ پائے ......!"

اس نے سرکار اور کرن سنگھ کے پاس پہنچ کر نہایت مؤدبانہ سلام کیا اور فوراً کرسی کھینچ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ کرن سنگھ تو چونک گیا۔ خوف زدہ نظروں سے سرکار کی طرف دیکھا جس نے گوشت کے بے حس لوتھڑے کی طرح آنکھیں بند کر لیں مگر پھر فوراً آنکھیں کھولتے ہوئے بولا "ارے جاوید میاں ...... بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ آؤ چلتے ہیں دسترخوان پر ..... کس گاؤں سے لوٹے ہو بھئی ......؟"

اتنا کہہ کر جب عبدالجبار نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس سے اٹھا نہ گیا۔

"اسی گاؤں سے جس کے راستے پر بھوتوں والا کھنڈر ہے!" جاوید نے ہنڈے کی تیز روشنی میں کرن سنگھ کو دیکھا جو پھر چونک گیا۔

"کیوں تھانیدار صاحب ڈر گئے ...... بھوتوں کے کھنڈر کا نام سن کر!"

"نہیں یار ...... میں نے تو دو دو بجے رات کو کھنڈر میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو پکڑا ہے۔"

"اکیلے؟"

"سپاہیوں کے ساتھ بھی اکیلے بھی ......!" کرن سنگھ نے کہا۔

"میں اکیلا آ رہا تھا ...... بھوتوں نے حملہ کر دیا ...... لیکن میری بندوق سے ڈر کر بھاگ گئے ......!" وہ ایک لمحے کو رکا اور کچھ گلے سے اتارتے ہوئے بھاری آواز میں بولا "بڑے بزدل بھوت ہیں ......"

جاوید کو سرکار کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیلتی اور سرخ ہوتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ وہ کرن سنگھ اور سرکار پر نظر نگاہیں دوڑاتے ہوئے مسکرایا ...... "سکینہ کی شادی مبارک ہو ...... عبدالجبار صاحب ...."

عبدالجبار نے سوئی سوئی سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ تین چار منٹ گزر گئے، عبدالجبار خاموش تھا۔ کرن سنگھ کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔ جیسے کھٹمل کاٹ رہے ہوں۔ منشی آیا اور بھن سے کچھ پوچھا ...... عبدالجبار نے کڑک کر کہا "کرار خاں کہاں ہے؟"

"جی حضور ...... بات یہ ہے کہ اس کی بیٹی گلبیا بیمار ہے وہ ... وہ ......"

سرکار کا منہ اتر گیا "اس کمبخت کو بھی آج ہی بیمار ہونا تھا ......"

دوسرے کونے سے ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا جہاں دولہا اور اس کے دوستوں کا ہالہ جما ہوا تھا۔ سرکار نے اس طرف دیکھا۔ اور پھر اسی کونے میں اوپر کی طرف دیکھا جہاں بڑے کمرے کی کھڑکی سے ڈپٹی نصیرالدین کا پرنور چہرہ کھچڑی داڑھی سمیت نظر آرہا تھا۔ عبدالجبار نے سوچا یہ سمدھی نہیں سونے کا ہرن ہے۔ بیٹا دیا ہے تو داؤ پر بھی آجائے گا۔ شکر مل تو اب کھل ہی جائیگی ... فخرالدین سعادت مند لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ سنا ہے ذرا شوقین مزاج ہے۔ دو چار بچے ہو جائیں گے تو ساری شوقین مزاجی نکل جائے گی۔ میں خود کون ساولی ہوں۔ وہ تو ابھی جوان ہے۔ خیر ...... شکر مل تو بن ہی جائے گی۔ سنا ہے فخرالدین رنڈیوں کے کوٹھے پر جاتا ہے ہاں یہ بات بری ہے۔ ماماؤں اور پٹھانیوں کی بات دوسری ہے مگر ...... یہ گلبیا کو کیا ہو گیا! لوکی پٹھی۔ آج ہی مرچ لگنا تھی ...... آج ہی دھواں اٹھنا تھا۔ اب تو ادھر کا رخ بھی نہیں کرتی۔ شرماتی ہو گی۔ بچہ حرامی ہو یا حلالی۔ ...... پیٹ تو پھولے گا۔ اور یہ بری بات ہے۔ کرار خاں سنا ہے کچھ اوٹ پٹانگ بکتا پھر رہا ہے۔ چکی کے پاٹ میں آئے گا تو نانی یاد آجائے گی! چلم کی آگ بجھانے کے لئے ایک چھینٹا کافی ہے ...... بس ڈر ہے گلبیا کا کچھ کر نہ بیٹھے ...... سالی بڑی ٹیڑھی ہے۔ رسی ہے رسی ...... جل جائے پر بل نہ جائے ... اور اس بدمعاش کو دیکھئے، کتنی زہریلی مسکراہٹ تیر رہی ہے اس کے ہونٹوں پر۔ وہ سب سمجھتا ہے۔ آسیوں والے کھنڈر کی بات اس نے ...... کرن سنگھ بڑا عیار ہے۔

میں جانتا ہوں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں۔ اس کا کیا ہے۔ یہ شکر مل سرکاری ہو یا کسی اور کی ...... اس کو تو اپنا راتب چاہیے ... کتا ......!

جاوید نے جیب سے سگریٹ نکالی اور رومال سے منہ پونچھتے ہوئے مسکرا کر کرن سنگھ سے کہا: "کیوں جناب آپ اتنے چپ چپ کیوں ہیں۔ آج تو شادی کی رات ہے ....."

کرن سنگھ کو اچھو لگ گیا۔ "نہیں تو ...." اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھئے بیٹھئے ..... پرمیشر سنگھ یاد کر رہا تھا آپ کو ...."

"اچھا۔" سرکار کی آنکھیں گول ہو گئیں۔ جیسے پوچھ رہی ہوں "کیا مطلب؟"

"جی ہاں وہ کرن سنگھ کو بہت یاد کرتا ہے۔ پرانی دوستی معلوم ہوتی ہے!"

"نہیں صاحب دوستی کیا ... علاقے میں کون ہے جس سے میری جان پہچان نہیں۔"

کرن سنگھ نے گھبرا کر سرکار کی طرف دیکھا۔

"کل ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی ..... بچ گیا بیچارا ...."

"بیچارا؟ .... ڈاکو ہے سالا!" سرکار نے نفرت سے کہا۔

"کون؟" جاوید نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

عبدالجبار نے جواب نہیں دیا۔ کرن سنگھ اٹھ کر دوسرے دالان کی طرف چلا گیا۔ جہاں قوال لہکتی ہوئی غزل گا رہے تھے ......

"مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا!"

عبدالجبار نے جاوید کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ ایک طرف ایک چھوٹے مگر صاف ستھرے کمرے میں لے گیا۔

"ڈاکٹر تم مجھ سے خفا ہو .... بے وجہ خفا ہو۔ میں تو تمہیں اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔"

"اس کا مجھے یقین ہے۔"

"کرن سنگھ کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ ...... مجھے اس پر اعتبار ہے۔"

"اندھا اپنی لاٹھی پر بھی اعتبار نہ کرے تو کام کیسے چلے ......"

عبدالجبار کو جاوید کا طنز ریتی کی طرح رگڑتا چلا گیا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی اور بولا:

"تم اس کی ڈھال کیوں بن رہے ہو .... وہ لوکس بھی مجھ سے پوچھ رہا تھا ...."

"کیا پوچھ رہا تھا ....."

"کچھ نہیں ...... جب تک میں یہاں ہوں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ....."

"عبدالجبار صاحب میں آپ کو بہت بھولا نظر آتا ہوں۔"

"آہستہ بولو ...... اچھا چلو چلو ...... کھانا کھاؤ ......"

قوالوں کی لپکتی ہوئی الاپ سنائی دی : "ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں ..... شراب میں؛ شراب میں؛ اہے وا شراب میں؛"

سکینہ کی شادی کی رات عبدالجبار کے لئے بہت سے فکر و تردد لے کر آئی۔

کھانے پر بھی ہنسی مذاق، لطیفہ گوئی اور گپوں کا بازار گرم رہا۔ یہ آخری دسترخوان تھا۔ اس پر باراتیوں کا جمگھٹ تھا، خوشامدیوں کا، مصاحبوں کا اور خاص طور پر ان لوگوں کا جو شادی بیاہ میں خدمت خلق کر کے اپنی عاقبت سنوارتے ہیں۔ قوالوں کا جوش ختم ہو چکا تھا۔ کھلی چھت پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور اس پر جوہی جیسی دودھیا چاندنی لوٹ رہی تھی۔ طوائف کا مجرا شروع ہو گیا تھا۔ وہ کنول کے کھلے ہوئے الٹے پھول کی طرح ریشمی لہنگا پھیلائے بیٹھی تھی۔ دونوں طرف دو سارنگئے چوڑی دار پاجاموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھے، سارنگی کو کلیجے سے لگائے آہستہ آہستہ سر نکال رہے تھے۔ آخری دسترخوان پر کشتوں کے پشتے لگانے کے بعد ماسٹر شاہ عالم اور مولوی "جزاک اللہ" کا نعرہ لگاتے ہوئے چھت پر آئے۔ اور گاؤ تکیے کے سہارے اپنے مورچے پر ڈٹ گئے۔ طوائف نے سلام کے لئے سرکار کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے مبارکبادی کی تان چھیڑی۔ جب سارنگیوں کی گنگناہٹ ختم ہوئی اور جب طوائف نے دوبارہ بھاؤ بتاتے ہوئے ٹھمری کے بول الاپے اور ٹھمکتے اور گمکتے ہوئے طبلوں کی طرف ترچھی چتون سے دیکھا تو بوڑھے جوان سبھی اس قیامت کے آگے دل تھام کے رہ گئے۔ دل تھم تھم گئے مگر قیامت نہ تھمی۔ ہر شخص نغمے کے سحر میں بہہ رہا تھا۔ اس کی کمان جیسی بھوؤں کے تیروں اور مسی سے سیاہ ہونٹوں کو بار بار کاٹنے کی ادا سے گھائل ہوا جا رہا تھا۔ البتہ تین آدمی ایسے تھے جو چاندنی میں ڈوبے ہوئے نغمے عطر حنا اور پان کی خوشبوؤں

سے دور، اپنی اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی عبدالجبار اور جاوید کی آنکھیں چار ہو جاتیں اور کرن سنگھ کی مونچھوں میں ایک مسکراہٹ جھلملا جاتی اور اسے لگتا کہ عبدالجبار کے گوشت اور چربی سے بھاری بدن میں بھی جھرجھری دوڑ گئی۔ عبدالجبار کو دو باتیں پریشان کر رہی تھیں۔ ایک تو جاوید کا آسیبی کھنڈر سے بچ کر نکل آنا اور دوسرے گلبیا کے پیٹ کا درد اور کرار خاں کی چیخ پکار...... اور اب پرمیشر سنگھ پھر شیر ہو جائے گا۔ نہ جانے اب کے عقدے میں کیا ہوگا...... دیکھئے شنکر مل کا کیا ہوتا ہے...... لیکن ڈپٹی نصیرالدین نے عقد کے فوراً بعد اپنے طنزیہ انداز میں ہسٹریا کا ذکر کیوں چھیڑا...... کیا یہ جاوید...... ڈاکٹر! سے اپنا سب سے بڑا دشمن نظر آیا۔

نیچے عورتوں کا ایک ریلا آیا دولھا دروازے لگنے والا تھا۔ شادی کی رات کی سب سے رومانی رسم کی گھڑی تھی...... فخرالدین بےچینی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

جاوید تیزی سے اس کے پاس سے گزرا تو فخرالدین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا" کیوں ڈاکٹر، تم نے سچ کیوں نہیں بتایا مجھے......" جاوید نے فخرالدین کی غصے سے سرخ آنکھیں دیکھیں، اور دولہا نے مہندی سے سرخ ہتھیلی اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا: "آخر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ میری ہونے والی بیوی کو ہسٹریا......"

"فخرالدین صاحب میں ڈاکٹر ہوں ڈھنڈورچی نہیں ہوں۔"

"میں سب سمجھتا ہوں......" فخرالدین غصے سے پھنکارا۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ...... نا سمجھ سے نا سمجھ آدمی بھی یہی دعویٰ کرتا ہے۔"

جاوید مڑا اور باہر نکل گیا۔ ولایتی کتوں نے جماہی لیتے ہوئے فخرالدین کو شب بخیر کہا۔ پاس ہی شادی کی سہانی رسم ادا کرنے کے لئے سرکاری گھوڑا دولھا کے انتظار میں خود دولھا بنا کھڑا تھا۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ چاندنی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا مگر جاوید اب تک کھڑکی کے سامنے بیٹھا تاڑ کے لمبے لمبے سایوں کو کھیتوں میں پگھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دور سے آتی ہوئی شہنائی اور سارنگی کی آواز دم توڑ رہی تھی۔ اس نے سکینہ کے تصور کو مٹانے کی جتنی

کوشش کی اتنی ہی شدت سے وہ اس کی نگاہوں میں پھرتی رہی۔ ہوا تیز ہو گئی تھی اور صبح کی خوشگوار خنکی میں ایک درد انگیز گیت کا رس گھلتا ہوا محسوس ہوا۔

اس رات کی بھی صبح ہو گئی۔ پچھلے چند دن کس قیامت کے گزرے تھے، جاوید کے دل میں خود اپنے خلاف ایک شکایت سر اٹھاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے روز کا خط صبح کی پہلی کرن کی روشنی میں شاید پچاسویں بار پڑھا اور پچھتایا۔ بار بار یہ سوچ کر اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا کہ وہ روز کے خط کے جواب میں اتنا جذباتی کیوں ہو گیا۔ اس وقت بھی اسے بار بار اداس رومانیت کے عطر میں ڈوبا ہوا اپنا خط یاد آ رہا تھا ...... میں ایک اجنبی جنگل میں ہوں لیکن یہاں بھی ایک شہر آباد ہے .... یہ ہے یادوں اور خوابوں کا شہر .... جہاں زمانہ ہوا صبح ہوئی تھی اب شام ہی شام ہے۔ مٹیالا دھندلکا .... نہ جانے میرے خوابوں کا سورج کہاں ڈوب گیا .... ہاں یادوں کا چاند البتہ چمک رہا ہے .... مگر اس کی روشنی مٹیالے دھندلکے کی چادر میں لپٹ کر رہ جاتی ہے .... یہ کہانی تو کب کی ختم ہو چکی۔ میں قصہ گو تو ہوں نہیں۔ کہانی ختم ہو اور پھر از سر نو داستان چھیڑ دوں .... ان ہی پچھاؤں کی گود میں ایک اور زخم ہرا ہو گیا .... کہیں سے ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور کی آغوش میں ایک دلہن کا پیکر کسمسایا .... لیکن اس دلہن کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں تیز ہوائیں کبھی اس کے ہونٹوں کو چومتیں، کبھی اس کی صندلیں پیشانی کو .... اور آنکھیں ان زلفوں کے جال میں دو زندہ مچھلیوں کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ تل ..... ایک سوگوار تل .... پسینہ اور ایک خوفناک چیخ .... اندھیرا اور خوفناک اندھیرا ...... چیخ جیسے بیچ منجدھار میں کوئی ڈوب رہا ہو اور ....

دروازے پر دستک ہوئی .... تیز اور تیز .... ایک لحیم شحیم راجپوت کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ڈاکٹر میں نے تمہاری پٹی اتار کر اپنی پگڑی باندھ لی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"لیکن پرمیشر سنگھ مجھے زخم تو دیکھنے دیتے ......"

"نہیں ڈاکٹر اب گھاؤ کہاں۔ اب تو اس کی چھاپ رہ گئی ہے۔ مجھے بہت دور جانا ہے۔

چلچلاتی دوپہریا سے پہلے ہی گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔ میرا گھوڑا تیار ہے ...." اس کے گلے میں کچھ پھنسنے لگا۔

"پرمیشر سنگھ تم اچھے ہوگئے .... تم نہیں جانتے میں کتنا خوش ہوں ......"

"ڈاکٹر مانگو کیا مانگتے ہو .... اپنا سر تمہارے پیروں پر ڈال دونگا ..... لو جنیو چھو کر کہتا ہوں .... کوئی تم کو آنکھ دکھائے مجھے اسارہ کردو اس کی آنکھیں نکال کر کوڑیوں کی طرح آگے ڈال دوں گا۔ یہ جیون تم نے دیا ہے .... اب میں دشمن سے حساب چکالوں گا۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپتھپایا۔ پرمیشر سنگھ نے شکر گزار نظروں سے اس کو دیکھا اور گھوڑے پر بیٹھ کر گھنے درختوں میں غائب ہوگیا۔

انسان موت سے قریب ہوتا ہے تو اس کا رنگ کتنا زرد پڑ جاتا ہے اور جب اس کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑتا ہے تو .... ۔جاوید نے نظروں نظروں میں اپنے مریض کو رخصت کیا جسے چند دن قبل موت قتل کرنے آئی تھی اور اب وہ موت کو قتل کر کے طوفان کی طرح اڑ رہا تھا۔

جنگلی نے چائے بنائی لیکن جاوید نے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا۔ شیو بھی نہیں کیا۔ اس کی کنپٹیوں میں درد ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو پپوٹوں میں آگ سی لگ جاتی۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا اور ہونٹ چباتا رہا۔ "جنگلی بندوق صاف کی؟"

"وہ تو میں نے رات ہی کر دی تھی .... پر بتاؤ جاوید میاں شکار کیا کیا ...... کوئی گیدڑ ...... جو گھر بھی نہیں لائے ...."

"ہاں گیدڑ ہی سمجھو ...." یہ کہہ کر اس نے بندوق کونے سے اٹھائی ۔ اسے ایک جھٹکے سے توڑا اور روشنی کی طرف نال اٹھا کر دیکھا .... "شاباش جنگلی میاں ...... تم نے تو شیشے کی طرح چمکا دیا۔"

"آج باہر نہیں جاؤ گے ؟"

"اونہہ ...... ہسپتال بھی تو ...... جاؤ کمپونڈر صاحب کو بلالاؤ۔"

لیکن جنگلی وہیں ڈٹا رہا۔

جاوید نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا۔ لیکن جنگلی کے چہرے پر غصہ دیکھ کر ہنس پڑا۔

"بنسو مت۔ میں اب زیادہ نہیں سہوں گا۔ نمک کی طرح گھلتے جا رہے ہو۔" جنگلی چیخا۔

"نمک کی طرح؟ میں تو سوچ رہا تھا موٹا ہو رہا ہوں ...." جاوید نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ منوں تو گھی پی رہے ہو ..... سب سمجھتا ہوں۔ تم کسی پھیر میں پڑ گئے ہو ....." اس نے کچھ اور سوچا اور وہیں دیوار کے سہارے کھڑا کھڑا ڈبڈباتی ہوئی التجا بھری آنکھوں سے گھورنے لگا۔ "تم جانتے ہو جاوید میاں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ تمہارے ابا نے مجھے کلیجے سے لگا کر رکھا۔ میرا کیا ہے۔ پکا ہوا آم ہوں۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ٹپک گیا۔ میں چلا جاؤں گا۔ پر اپنے کو دیکھو ...." بڈھا ایک منٹ کو رکا اور اپنے چکٹ دامن سے آنکھیں پونچھنے لگا۔ جاوید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مر گئی اور وہ بے چین ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ بڈھے کے ہونٹ پھر تھر تھرائے ....." جاوید میاں یہ کھیل ختم کرو۔ اگر کسی جالم سے آنکھ لڑ گئی ہے تو بیاہ کر گھر لے آؤ۔ میں کر لوں گا اپنی بہو کی دیکھ بھال .... لیکن اس طرح مت گھلو .... ارے تمہارے ابا نے کیا اسی دن کو پوسا تھا .... ان کو حسر کے دن کیا منہ دکھاؤں گا ...."

جنگلی ڈگمگاتا اور بڑبڑاتا ہوا باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ "مرغی کا اسٹو پکاؤں وہ نہ کھاؤ، کبوتر کا سوپ تم نہ چکھو، ترئی کی بھاجی گلے سے نہ اترے .... تو کیا کروں اپنا کلیجہ پکا کر کھلا دوں .... سو جتن کرو سب مٹی میں مل جائے ..... میں بھی اب کسی پیر کی درگاہ پر جا بیٹھوں گا۔ لو میں بکتا رہوں تمہاری بلا سے ..... کوا کائیں کائیں کرتا رہے اور دھان سوکھتا رہے اور سب ....."

جنگلی نے تو دل کی بھڑاس نکال لی لیکن جاوید کے پیروں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ وقت کس طرح گزر گیا تھا۔ اس کے سامنے دو جاوید کھڑے ہو گئے۔ ایک وہ جو کلکتے میں پڑھتا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ لڑکیاں آسانی سے جس کے قریب آ جاتی تھیں ..... وہ جاوید جو پوری دیوانگی سے سادہ مگر باوقار، بھولی بھالی مگر ذہین لڑکی سے عشق کرتا تھا اس کے لئے جیتا

تھا ..... ایک وہ جاوید تھا جو بہت سے معصوم خوابوں اور ارادوں کو دل میں سمیٹے ہوئے
اس دور افتادہ وادی میں آیا تھا اور اس دلدل میں دھنس گیا تھا۔ سکینہ سے اسے عشق نہیں
تھا۔ پھر اس کو کلیجے سے کیوں لگایا اور جب اُس کے دل میں کچھ کر گزرنے کی جرآت جاگی تو
...... کمزور، ڈرپوک، سکینہ نے غلط تو نہیں کہا تھا خیر وہ تو اب ٹھکانے لگ گئی۔ لیکن روز
نے اس کو کیوں خط لکھا اس کے دل کے تاروں کو اس طرح کیوں چھیڑا اور جب تار گونجے تو
اس نے اپنے کان بند کر لئے! آخر کیوں؟

نرلیش اور درگا پرشاد کمرے میں آگئے اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔

"ارے آپ کہاں غائب ہیں اس سمے؟" نرلیش نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

ڈاکٹر چونک کر کھڑا ہو گیا۔

گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے نرلیش نے کان کھجاتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر صاحب
آپ کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔"

درگا پرشاد اپنی دبیز عینک کے شیشوں سے اتنی رحم بھری نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا
کہ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ "سازش؟ کیوں؟ کیسی سازش؟"

درگا پرشاد نے اپنی روتی آواز میں کہا "ڈاک بابو ٹھیک کہتے ہیں۔ چٹھیاں لکھی جا رہی
ہیں۔"

"آپ کی شکایت اوپر بھیجی جا رہی ہے۔" نرلیش نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں یہی نا کہ یہ کمبخت ڈاکٹر جاوید اچھا ڈاکٹر نہیں ہے ..... ہم ایک راجپوت کو
قتل کرتے ہیں اور وہ اس کو مرنے نہیں دیتا....." اور اچانک درگا پرشاد پر نظر پڑی تو آواز
گلے میں اٹک گئی ...... "میں بہت چپ رہا میں گھاس نہیں ہوں کہ جو جانور چاہے چر
جائے!" جاوید بپھر گیا۔ اس کے خلاف یہ شکایت کی گئی تھی کہ وہ بندوق لے کر مریضوں کے
ہاں جاتا ہے اور ان کو دہلا کر دگنی تگنی فیس اینٹھتا ہے۔

تھوڑی دیر میں تینوں ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ جاوید کو پرمیشر سنگھ کے بغیر
ہسپتال بہت سونا لگا۔ نہ وہ جلے کٹے فقرے نہ چھت اڑا دینے والے قہقہے ..... لمبا تڑنگا چھ

باتھ کا راجپوت اپنی پوری ہماہمی ساتھ لے کر وہیں لوٹ گیا تھا جہاں سے آیا تھا۔

اس نے ہسپتال کے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ مسجد کی طرف سے بیگاروں کا کارواں نکلا اور تیز تیز قدموں سے ریلوے اسٹیشن والی سڑک پر بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے چار کہاروں کے کندھوں پر سرخ ڈولی چمکتی نظر آئی جس کی سات رنگی جھالر سے سات رنگی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ جاوید ٹھٹک کر وہیں رک گیا اور اس سرخ شعلے کو دیکھتا رہا۔

"زندگی کس طرح بل کھاتی ہوئی چلتی ہے ...... کہاں سے کہاں لے جاتی ہے اور انسان کو کیا بنا دیتی ہے ......" اس نے زیر لب کہا۔

نریش اور درگا پرشاد نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اداس اداس سے جاوید کے ساتھ برآمدے میں چلے گئے۔

دھوپ میں ابھی سے لو کی جھلسن پیدا ہو چلی تھی۔ آسمان ابھی سے گرد آلود تھا۔

19

سکینہ اپنے کمرے میں بیٹھی گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے حیران اور خوف زدہ نظروں سے اپنی کھڑکی کی سلاخوں کو دیکھ رہی تھی جن کی پرچھائیاں کمرے کے اندر تھرتھرا رہی تھیں۔ پچھلے دس دن سے وہ اسی کمرے میں بند تھی۔ وہ کوئی انوکھی لڑکی تو تھیں نہیں مایوں تو سبھی لڑکیاں بٹھائی جاتی ہیں۔ اس کو پیلا کرتا پاجامہ پہنا دیا گیا تھا۔ کرتا ململ کا تھا اور اس کے اندر اور کچھ پہننے کی اجازت نہ تھی۔ چوڑیاں اتار دی گئی تھیں۔ اس لئے شباب کی ساری عنگی، حسن و رعنائی

کی ساری معصومیتیں سپردگی اور گریز کی تھرتھراہٹ لئے سہمی سہمی سی ململ کی پیلی چاندنی سے چھنتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، بال بھی کھلے رہتے تھے ۔۔۔۔ سکھیاں سہیلیاں روزانہ اکٹھی ہوتیں، جو اس کی سہیلیاں کم اور شادی کی تماشائی زیادہ تھیں ۔۔۔۔۔ ہاں بھر آنکھ کاجل روزانہ ضرور تھوپا جاتا اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ تیل میں بھیگی ہوئی ہلدی کے دلدل میں دھنسی جا رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ کالی، اور زیادہ بڑی بڑی نکل آئی تھیں اور دھان پان جسم میں اور بھی نزاکت پیدا ہو گئی تھی ۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت نیند بھری رہتی اور ہونٹ گلاب کی کلیوں کی طرح چٹکتے ہوئے معلوم ہوتے ۔۔۔۔۔ کلیاں اب کھلیں کہ تب کھلیں، ان پیلے کپڑوں میں گریبان چاک اور کھلے سر جب وہ سر نہوڑا کر بیٹھتی اور اپنے خوابوں میں کھو جاتی تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور ہونٹ تھرتھرانے لگتے جیسے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی ہو۔

سکینہ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وقتی سکھیوں، سوتیلی بہنوں اور دوسری سہاگنوں کی پوری پلٹن اٹھلاتی ہوئی، چٹکتی مٹکتی آئی اور اس کے چاروں طرف بیٹھ گئیں۔ رنگا رنگ کپڑوں میں ملبوس بجی سجائی بنی سنوری، عطر، پان اور مسی سے مہکتی اور آرزوؤں سے دہکتی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے اس گھیرے نے اس کے جسم پر آخری بار ابٹن ملا وہ ہنس کر اسے چھیڑ رہی تھیں ۔۔۔۔ کسی شوخ کی شریر انگلیوں نے ابٹن ملتے ہوئے اس کے سینے پر ایسی چٹکی بھری کہ سکینہ سسک کر رہ گئی، "ہائے نگوڑی یہ کیا بیسودگی ہے۔"

"ہم سے نخرے کرتی ہو ۔۔۔۔ کیا دولہا سے بھی ڈھول ڈھپا ۔۔۔۔" لیکن جملہ پورا نہ ہوا اور چھت قہقہوں سے اڑ گئی۔

یہ قافلہ چلا گیا۔ سناٹا چھا گیا۔ وہ ڈر گئی اسے شادی کے گونجتے دھڑکتے بھرے گھر کا سناٹا کاٹنے کو دوڑا۔ مایوں کے دس دن پہاڑ لگ رہے تھے لگتا تھا کہ اس کی گردن میں ریشمین ڈور کا پھندا ڈال دیا گیا ہے ۔۔۔ آخر یہ تختہ پیروں کے نیچے سے سرکتا کیوں نہیں۔ قصہ ختم ہو، جان چھوٹے، دس دن وہ دل سے یہی سوال کرتی رہی۔ آخر وہ شام آ گئی۔ جب حویلی مراثنوں کے رنگین گرم گرم رسیلے گیتوں سے، ہجر و وصال کی صدیوں پرانی داستانوں سے جھنجھنا اٹھی۔ اور

ایک تڑپتی ہوئی روح، ایک جھنکار کے ساتھ ٹوٹ کر چور چور ہو گئی۔

شام ہونے کو آئی اور کھڑکی سے لو کی لپٹوں کے بجائے جنگل کی ہوائیں اپنے دامن میں ہلکی پھلکی پرچھائیاں سمیٹے اس کے کمرے میں آئیں تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ گیت گا گا کر مہندی چھڑائی گئی اور ایک بار پھر ابٹن ملا گیا۔ نہاتے وقت اُسے عجیب گدگدی اور انجانی سنسنی کا احساس ہوا۔ ایک نئی نویلی سہاگن نے مسکرا کر کہا۔ "کوارپن کا آخری نہان ہے بھنو......"

"کیا؟" سکینہ نے بھیگے بالوں کو ننگے شانوں پر سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"بنو مت، بڑی پکی ہو تم...... ہی ہی ہی" یہ ہنسی پتے کی بات کہہ گئی اور سکینہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ اور اس نے بالٹی سے ایک لوٹا پانی نکال کر سر پر انڈیل لیا۔

"ایک وہ پھول ہے جو اپنی ٹہنی پر ہنستا ہے اور اوس میں نہاتا ہے...... ایک وہ پھول ہے جسے کوئی توڑ لیتا ہے اور ہار میں..........."

گرمی میں بھی سکینہ کے دانت بجنے لگے اور وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ سکھیوں نے گیت گائے۔ گا گا کر جلدی جلدی اس کا بدن پونچھا مگر وہ کانپتی رہی۔ اسے اپنے کمرے میں پہنچایا گیا۔ اس کے بال سکھائے گئے۔ بڑی بی نے ہتھیلیاں دیکھیں اور ان کی آنکھیں چمک اٹھیں........"

"کیسا کھلا ہے مہندی کا رنگ، اللہ کرے تیرا سہاگ ایسے ہی لہکتا مہکتا رہے!"

سکینہ کو جھرجھری آ گئی۔ اس نے بھی اپنی ہتھیلیاں کھول کر دیکھیں۔

"ہائے لگتا ہے تازہ تازہ خون چمک رہا ہے......" وہ سب کی نظر بچا کر آسیبی چھت پر چلی گئی اسے وہ چٹپٹی بات یاد آ گئی جو نہاتے وقت ایک سہاگن نے کہی تھی۔ اس نے سورج کو ڈوبتے دیکھا۔ "کنوارپن کا سورج ڈوب رہا ہے" جی چاہا کہ لپک کے پیچھے کھلتی ہوئی شفق کو دونوں مٹھیوں سے رول لے۔ برگد کی ایک ڈالی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ آسیبی چھت پر سایہ فگن صرف یہ درخت تھا جو اس کے چھٹنے پر سوگوار تھا اور ٹھنڈی سانس بھر رہا تھا۔

رات بھیگی۔ اس کی پلکیں بھیگیں۔ مراثنوں نے شامیانے تلے ڈھولک پر تھاپ ماری چوڑیاں بجیں اور سینکڑوں دلہنوں کو سجا کر گرم گرم آغوشوں میں دھکیلنے کا تجربہ رکھنے والے ہاتھوں نے سکینہ کے بالوں اور پیشانی پر چمکیاں چن دیں۔ تنی ہوئی بھوؤں کے درمیان دمکتی پیشانی پر چاند لگایا اور گردن میں سونے کی ہنسلی۔ کلائیوں میں کنگن اور ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں زنجیروں میں پروئے ہوئے چھلّے پہنائے۔ پازیب، کمرزیب اور بازوبند کے گھونگھرو گنگنانے لگے۔ سکینہ کا سر اپنے گھٹنوں پر جھک گیا۔ اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور پورا جسم اکڑ سا رہا تھا۔ حویلی اسے دلہن بنا کر اس کی طرف سے بے نیاز ہو گئی اور وہ اپنے خوابوں اور اندیشوں کے ریلے میں بہنے لگی۔ اس کا دل پٹاخوں کے دھماکے سے لرز لرز اٹھتا ...... رات کے پچھلے پہر دولہا اندر آیا۔ شامیانے تلے اس کو زلفوں کا دھلا دودھ پلایا گیا۔ دولہا کی دی ہوئی اشرفی سے اس کی کنواری مانگ میں سیندور کی سرخ لکیر دوڑا دی گئی۔ اس کی سہمی ہوئی ہتھیلیوں پر پان کی گلوریاں رکھ دی گئیں اور دولہا نے جھک کر منہ سے مصری اور گلوریاں چن لیں۔ سکینہ کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے ہتھیلیاں کھینچ لیں اور کسمسانے لگی۔ مراثنوں نے گیتوں گیتوں میں دولہا اور اس کی سات پشتوں پر گالیوں کی بوچھار کر دی۔ دولہا سہرے کی لڑیوں میں سے خوبصورت لڑکیوں کو گھورتا رہا اور اپنی ران کو سبز ساٹن کے پاجامے میں تھرتھراتی ہوئی سڈول ران سے زیادہ سے زیادہ قریب کرتا رہا جو ہر لمس پر چونک کر ذرا سا ہٹ جاتی تھی۔

مراثنوں کی تھکی ہوئی آواز میں غنودگی نے بڑی غم انگیزی بھر دی تھی۔ دور کہیں سے مرغے کی بانگ سنائی دی تو عورتوں نے جلدی جلدی رسم ختم کی اور دلہن کو خلوت میں پہنچا کر دولہا کو اندر دھکیل دیا۔ اور باہر سے زنجیر چڑھا دی۔ بوس و کنار کے ہزاروں راز کھولنے والے گیتوں نے سکینہ کا گلا خشک کر دیا۔

فخرالدین نے اپنا سہرا اور صافہ ایک طرف رکھا اور سیدھا سکینہ کے پاس جا کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ سرخ دوپٹے میں لپٹی ہوئی سکینہ تکئے کی طرف سرک گئی۔ زیور چھن چھن چیخ پڑے۔ باہر سے گیت کے جو بول سنائی دیئے ان میں کنگن کی چغلی پر چوٹ کی گئی تھی۔ فخرالدین نے

آگے بڑھ کر جھٹ گھونگھٹ الٹ دیا۔ سکینہ کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ سنہرے گالوں پر لمبی لمبی پلکیں اپنا سایہ ڈال رہی تھیں۔ فخرالدین کی سانس تیز ہو گئی۔ "میری جان!"

سکینہ اس اجنبی آواز سے ڈر گئی۔

"ڈرتی کیوں ہو جانم۔ میں تمہیں پھول کی طرح رکھوں گا۔" فخرالدین کی سانس اور تیز ہو گئی۔ اس نے سکینہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن سکینہ نے تو پلنگ کی پٹی پکڑلی تھی۔ فخرالدین کو محسوس ہوا کہ پلنگ کو جھرجھری سی آرہی ہے وہ زری کے سلیم شاہی جوتے اتار کر پلنگ پر چڑھ گیا۔

"مجھ سے ڈرتی ہو۔ میں تو تمہارا ہوں۔ تم میری ہو پھر یہ ...."

سکینہ نے سہم کر پٹی کو اور زور سے پکڑ لیا۔ فخرالدین کو سکینہ کا نازک سا ہاتھ پٹی پر نظر آیا۔ اس نے ہنستے اور ہانپتے ہوئے اس کا ہاتھ پٹی سے کھینچ لیا اور وہ اس کی آغوش میں گر گئی۔ فخرالدین کچھ حیران ہوا کچھ ڈرا۔ اس کی دلہن کے گال اور ہونٹ ایسے ٹھنڈے تھے جیسے پھول جاڑے میں رات بھر اوس میں بھیگتے رہے ہوں .... اور سینے گویا پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے ..... لیکن تھوڑی دیر میں اس کی اپنی آگ ہر چیز کو جلانے لگی ....

دیکھتے دیکھتے پھولوں کے ہار ٹوٹ گئے نئی نویلی دلہن کے گہنے چیخ پڑے۔

صبح کی روشنی کھڑکی سے چھنتی ہوئی آئی تو کسی نے باہر سے زنجیر ہلائی۔ فخرالدین نے اٹھ کر سر پر دستار اور سہرا جمایا اور سکینہ کے سینے کو گدگدا کر باہر نکل گیا۔ سکینہ روندی ہوئی پڑی تھی۔ گالوں پر سرخ سرخ دھبے جلتے اور دھواں دیتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ روندے ہوئے پھولوں کو دیکھا اور اپنے بارے میں سوچنے لگی: "وحشی درندہ!" اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اسے ریچھ نے دبا رکھا ہے اور اپنے بساند بھرے نتھنوں سے اس کے گالوں اور سینوں کو سونگھ رہا ہے۔ پھر گرم پانی کا ریلا آیا اور اسے اپنی لہروں میں دور تک بہالے گیا۔ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں کھڑکی کے باہر سکون اور خاموشی سے جھومتے ہوئے درختوں میں ہوا کے پر پھڑپھڑاتے ہوئے لگ رہے تھے۔

اس نے اپنی رانوں اور سینے پر ہاتھ پھیرا تو درد کے کلنٹے چبھ چبھ گئے ...... "ظالم ......!"

بڑی بی سلفچی لے کر منہ دھلانے آئیں۔ پیچھے پیچھے کنواری لڑکیاں اور سہاگنیں آئیں۔ کسی نے اس کے گالوں کو دیکھا اور دانتوں تلے انگلی دبا کر چہکی: "ہائے بڑا ظالم دولھا ہے ...... بھنبھوڑ لیا بیچاری کو ...... اے بھنوا اتنی بھی کیا بے صبری ..... جیسے لاڈو کو کوئی بھگائے لئے جا رہا ہو ......"

ایک بار پھر کمرے میں سناٹا ہو گیا اور یہ آواز اور زیادہ شدت سے کانوں کے پردے سے ٹکرانے لگی: "جیسے لاڈو کو کوئی بھگائے لئے جا رہا ہو ......"

اس کی آنکھوں میں رات کا پُر اسرار سناٹا چھا گیا۔ چوکیدار کی للکار سُن کر رات کا دل ایک چھن کو دھڑکا اور خاموش ہو گیا۔ وہ دبے پاؤں تہہ خانے میں اُتری اور چھوٹا سا دروازہ کھول کر پچھواڑے والے باغ میں گئی اور سبک قدموں سے چلتی ہوئی جنگل کی آغوش میں چھپ گئی ...... وہ ایک چٹان کے سامنے کھڑی ہے۔ اندھیرے میں دو ہاتھ بڑھے اور وہ ایک چوڑے گرم اور دھڑکتے ہوئے سینے پر گر گئی۔ سانس کے ساتھ زمین گنگناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہزاروں ستارے ٹوٹے اور اس کے خون میں تیرنے لگے۔ ایک تتلی سی اس کے ہونٹوں پر اتری اور شہد چوسنے لگی ...... شہد ...... شہد زندگی کا۔ جوانی کا شہد! تتلی کہاں اڑ گئی۔ تتلی اپنے ساتھ اس پھول کو اڑا کر کیوں نہ لے جا سکی جس کی ایک ایک پنکھڑی میں تتلی کے لئے شہد کے نہ سوکھنے والے سوتے اُبل رہے تھے ...... اور اب یہ سوتے خشک ہیں اور سر پر بھڑوں کا چھتہ گر پڑا ہے۔ پھول کی ایک ایک پنکھڑی میں ہزاروں ڈنک کا زہر ..... غلیظ۔ جلتا ہوا زہر رس رہا ہے ..... اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں وہ مسلے ہوئے پھولوں کو اور مسل رہی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھی۔ طوطے کا پنجرا کھولا اور قیدی کو کھڑکی سے باہر اڑا دیا ..... جنگلوں میں۔ آسمان کی نیلی وسعتوں میں ..... کانوں میں پروں کی آواز آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ..... وہ بے بس اور نڈھال خون جیسے لال بستر پر گر پڑی۔ اس کے گھنگھروؤں نے احتجاج کیا ..... ادھر گیتوں کی گونج نے حویلی میں اداس ہیجان پیدا کر دیا۔

حویلی کی ماماؤں نے، سوتیلے رشتہ داروں نے، اپنوں اور پرایوں نے اس کی بلائیں لیں۔ باسمتی چاول سے بھری ہوئی پتیلیاں لے لے کر اس کے سر سے صدقہ اتارا اور ایک مضبوط عورت نے گود میں اٹھا کر اسے سرخ ڈولی میں ڈال دیا۔ کہاروں نے ڈولی اٹھائی اور آبدیدہ سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ وہیں بڑے دروازے پر چند منٹ ڈولی کندھوں پر اٹھائے کھڑے رہے۔ بابل کا گیت ایک ایک در و دیوار سے چیخیں مارتا ہوا آتا، سکینہ کو گلے سے لگاتا اور اس کا منہ چوم کر کہتا ...... جاؤ ...... جاؤ ...... ہم نے تمہارے بچپن کو دودھ پلا پلا کر پالا۔ جوان ہوئیں تو تمہیں کلیجے سے لگا کر رکھا۔ آندھی چلی تو ہم نے چراغ کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ہوا کا جھونکا آیا تو اپنے ہاتھ سے تمہارے گرد دیوار کھینچ دی۔ تمہاری ایک ایک ضد پوری کی، تمہاری ایک ایک انگڑائی کو دھنک کی طرح اپنے دل کے آسمان میں چھپا لیا۔ تم جا رہی ہو ...... جاؤ ...... اپنا نیا گھر بساؤ۔ مگر ہمیں نہ بھلانا۔ تم کو ہمارا پیار یاد آئے گا۔ ہماری ہواؤں کی لوری، ہمارے پانی کی مٹھاس، ہمارے چاند سورج یاد آئیں گے ...... جاؤ ...... تم جا رہی ہو اور تمہارے ساتھ ہماری مامتا جا رہی ہے جب تم چہکو گی یہ بھی چہکے گی جب تم روؤ گی تو یہ بھی آنسو بہائے گی ......

کہاروں نے چند قدم آگے بڑھائے اور پھر لوٹ کر دروازے پر آ گئے۔ سکینہ نے پردہ اٹھایا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کو ایک ایک چہرہ آنسوؤں سے تر نظر آیا۔ کہاروں نے ڈولی بڑھائی اور ان کے قدم تیز ہوتے چلے گئے۔ گیت آہستہ آہستہ سسکیوں میں کھو گئے۔

ڈولی تیزی سے سڑک پر اڑی جا رہی تھی ...... سکینہ نے ایک بار پھر اپنی وادی کو آخری بار دیکھنا چاہا ...... لیکن سامنے ہسپتال کی عمارت تھی اور اس کے زینے پر جاوید کھڑا تھا۔ سکینہ کے دل میں کسی نے چٹکی بھری ...... "ہائے تم کس آن بان سے کھڑے ہو۔ تم اکیلے نہیں ہو ...... تمہارے دوست پاس ہیں لیکن میں اکیلی جا رہی ہوں۔ کیسی اجنبی نظروں سے میری ڈولی کو دیکھ رہے ہو۔ کیسے مسافر ہو تم جو اپنے اس راہی سے کچھ پوچھتے بھی نہیں۔ کچھ کہتے بھی نہیں ...... کٹھور، اچھا ...... میں چلی خدا حافظ ...... میں چلی ......"

اس نے آموں کے باغ سے ایک بار پھر دیکھا ...... اب زینہ خاموش تھا اور کہاروں

کے پیروں تلے زمین تیزی سے سرک رہی تھی ...... ایک نیا سفر ہے۔ یہ سفر کہاں ختم ہوگا ... کون جانے۔

سرکاری فٹن دولھا کو لئے ڈولی کو پیچھے چھوڑتا ہوا تیزی سے اسٹیشن کی طرف نکل گیا۔ سکینہ کا سر چکرایا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اپنا سرخ دوپٹہ دانتوں میں دبا لیا۔

دور شکری ندی کے پل پر سے ریل گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی۔ جنگل اور پہاڑ دھڑک اٹھے۔

20

شام ہوتے ہوتے ہوا اور زیادہ تپنے لگی۔ سورج دم توڑ چکا تھا۔ افق پر شفق کھل رہی تھی اور سرمئی گرد آہستہ آہستہ ہر چیز پر چھا رہی تھی۔ چراگاہ سے تازہ دم مویشی اور کھیتوں سے تھکے ہارے کسان گاؤں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ مویشیوں کی گھنٹیوں کی گونج وادی کے دل میں غم کے آنسو کی طرح بوند بوند ٹپک رہی تھی .... شام کے اس غم انگیز سناٹے میں ایک لمبا چوڑا بوڑھا پٹھان گاؤں سے باہر ٹیلے پر شیشم کے اونچے اور خاموش درخت کے سہارے کھڑا تھا۔ وہ جنگل کے پیچھے لہلہاتی ہوئی شفق کو گھور رہا تھا جس کے شعلوں میں سفید بگلوں کی دور و یہ دودھیا قطار تیر کے پھل کی طرح پیوست ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے یہ سفید بگلے اس دہکتی آگ میں جل کر رہ گئے۔

یہ بڈھا پٹھان تھا کرار خاں ـــــ ہونٹ سوجے ہوئے، آنکھوں میں آنسو موم کی طرح جمے ہوئے ـــــ یکایک اس کی داڑھی تھرتھرائی اور سر سینے پر لٹک گیا۔ جیسے کسی نے ایک ہی وار میں پیچھے سے گردن کاٹ دی ہو۔ اس کا پورا ہیولا تھیلے کی طرح بے جان اور نرم پڑ گیا۔ جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا گیا اس کا ہیولا آسیبی اور بھیانک ہوتا گیا ـــــ اگر کوئی بھٹکا ہوا راہی اس طرف سے گزرتا تو یہ سمجھ کر چیختا اور بھاگ کھڑا ہوتا کہ کسی مجرم کو پھانسی دے کر رسی ڈھیلی چھوڑ دی گئی ہے۔

اسی وقت کنجڑے ٹولی سے پرے، ترکاری کے کھیت کے بیچ پھوس کا ایک جھونپڑا اندھیرے میں لپٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ کرار خاں کی بیٹی گلبیا اس اندھیرے اور خاموش جھونپڑے میں گودڑوں پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس نے سنکھیا کھا لیا تھا اور اس کے پیٹ میں سو پھلوں والی دہکتی ہوئی چھریاں ناچ رہی تھیں۔ اس نے پسینے کی بساند سے بسا ہوا گودڑ منہ میں ٹھونس رکھا تھا۔ کبھی کبھی درد کی ایک لہر کلیجے سے اٹھتی اور آگ کے تیر کی طرح اس کی ناف تک تیرتی چلی جاتی۔ اندھیرے میں یہ کیسے نظر آتا کہ گلبیا کی شربتی آنکھیں اس وقت باہر نکل آئیں تھیں اور لگ رہا تھا کہ پتھریلی زمین پر ہل کھینچتے ہوئے بھوکے پیاسے بیل کی آنکھوں کی طرح ٹپک پڑیں گی۔

گلبیا کی چڑھتی جوانی تھی۔ کرار خاں کو اس کا بچپن یاد آرہا تھا۔ جیسے کل کی بات ہو۔ جب گلبیا کی ماں مر گئی تو اس نے ایک دن باپ سے کہا تھا ـــــ "بابا ـــــ مجھے بھی وہاں لے چلو جہاں ماں چلی گئی ہے۔" کرار خاں نے اپنی بچی کے لمبے لمبے کالے بالوں کو دیکھا جو الجھے ہوئے تھے اور ساری کے پھٹے ہوئے کنارے کی دھجی اس کی الجھی ہوئی چوٹی کی دم سے لٹک رہی تھی۔ یہ چوٹی گلبیا کی ماں نے مرنے سے پہلے اپنے بیمار ہاتھوں سے گوندھی تھی۔ کرار خاں نے اپنی بے پروائی پر نادم ہو کر ڈنڈا ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی آٹھ سالہ بیٹی کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ اسے نہلایا تھا، بدن پر کڑوا تیل ملا تھا، اس کے بال سنوارے تھے اور جنگل کے پاس ببولوں سے گھرے ہوئے قبرستان میں ایک نئی قبر کے کنارے اسے گود میں لے کر بیٹھا تھا اور سسک سسک کر رویا تھا۔ بچی اپنی معصوم اور ہنستی ہوئی آنکھوں

سے کبھی قبر کو دیکھتی اور کبھی اپنے باپ کی آنکھوں سے برستی ہوئی ساون کی جھڑی کو۔

"ماں کہاں ہے۔۔۔۔۔۔۔ تم تو کہتے تھے۔۔۔۔۔" بیٹی نے پوچھا۔

"یہاں اس مٹی کے نیچے سو رہی ہے۔۔۔۔۔" کرار خاں نے کہا۔ نجانے وہ اپنی مرحوم بیوی پر آنسو بہا رہا تھا یا اپنی بیٹی کی مظلومی پر۔

اس دن قبرستان سے پلٹا تو اپنی بیٹی کو حویلی لے گیا۔ حویلی کی بیگموں کو یتیم لڑکی پر رحم آگیا اور انھوں نے اس کو وہیں رکھ لیا۔ چند دن میں گلبیا کا جی ایسا لگا کہ وہ حویلی ہی کی ہو کر رہ گئی۔ شروع میں تو وہ سکینہ کے ساتھ کھیلتی اور کودتی رہی۔ لیکن کھیلنے کودنے کو تو رکھی نہیں گئی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا کام خود بخود طے ہو گیا۔ وہ ایک آنگن سے دوسرے آنگن میں دوڑتی رہتی۔ کسی کے لئے چونا کتھا لاتی، کسی کے لئے پان، کسی کے لوٹے میں پانی۔ غسلخانے میں کوئی بیگم صاحبہ نہاتیں تو ان کی پیٹھ سے میل چھڑانے اور سر پر لوٹے کی ٹونٹی سے پانی ڈالنے کا کام اسی کا ہوتا۔ ایک آدھ بار بے خیالی میں ہاتھ سے لوٹا جو چھوٹا تو بیگم کا سر پھٹ گیا۔ لہو کم بہا اور کہرام زیادہ مچا، اور گلبیا کی خوب مرمت ہوئی۔

کرار خاں کا یہ دیپ اسی طرح جلتا رہا۔ اسی سے کرار خاں کے دل میں اور اس کے جھونپڑے میں روشنی تھی۔ کرار خاں کو اپنی بیٹی کی وجہ سے سکینہ سے بھی محبت ہو گئی۔ لیکن جیسے جیسے گلبیا بڑی ہوتی گئی، حویلی کی عورتیں اس کو سکینہ سے الگ کرتی چلی گئیں۔ جوان ہو کر وہ ایک سنسناتا ہوا تیر بن گئی۔ یہ بڑی بڑی کجلائی ہوئی شربتی آنکھیں، ہنستے ہوئے بھیگے بھیگے ہونٹ، ہر قدم پر سو سو بل کھاتی، ہرے دھان کی طرح لہلہاتی، گنگناتی۔۔۔۔۔۔ اکڑتی تو تیر، جھکتی تو کمان؛ حویلی میں ایک شعلے کی طرح لپکتی۔ اس کا جسم بڑا گرم تھا۔

اسی زمانے میں ایک رات عبدالجبار کی پہلی بیوی نے خشک میوے کا حریرہ گلبیا کے ہاتھ دربار میں بھجوایا۔ عبدالجبار ہرن کے شکار سے لوٹ کر اب اپنی مسہری پر لیٹا ہوا تھا۔ دن بھر کی تھکن اور شراب کی آگ نے اس کے خون میں عجیب سی گرمی بھر دی تھی۔ ایسے میں گلبیا جو آئی تو اس نے میوے کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور لڑکی کو فرش پر پٹک دیا۔

گلبیا کی شربتی آنکھوں میں خوف کا شعلہ بھڑکا۔۔۔۔

عبدالجبار کو یہ انداز کچھ ایسا بھایا کہ وہ خوف اور پسپائی کا یہ کھیل بار بار کھیلتا رہا۔
اسے ہر دفعہ وہی ہرن یاد آجاتا جو گولی کی مار سے چوکڑیاں بھول کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

ایک دن کرار خاں نے بیٹی کو ٹوکا: "گلبیا اتنی دیر سے آئی ہے۔۔۔ رات کو۔۔۔۔"
"وہ سکینہ بی بی۔۔۔۔۔"
"اچھا اچھا۔۔۔۔۔" کرار خاں نے کھانس کر چراغ بجھا دیا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا
"سکینہ بی بی کا جی کیسا ہے۔۔۔۔۔"
"اچھا نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ پیلی ہو گئی ہیں"
کرار خاں تو سو جاتا لیکن گلبیا کی آنکھیں رات رات بھر بند نہ ہوتیں۔
رات رات بھر کوئی سیاہ دیو اس کی بوٹیاں نوچتا رہتا۔ اس کے انگ انگ کو روئی کی طرح دھنتا رہتا۔۔۔۔۔۔
گلبیا حویلی میں اپنے کام میں لگی رہتی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو رہی لیکن قہقہے غائب ہو گئے۔ چہرے کی سرخی میں آگ کی دہک پیدا ہو گئی۔ لیکن دیکھتے دیکھتے آگ بجھ گئی اور سرخی پھیکی پڑنے لگی۔ کمر کی لچک کم ہو گئی اور قدموں میں جھجک پیدا ہو گئی۔
ایک رات بہت دیر سے لوٹی تو کرار خاں چوکھٹ پر بیٹھا نظر آیا۔ "تو کہاں تھی؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"وہ سکینہ بی بی۔۔۔" گلبیا نے بس اتنا کہا اور اندر گھس گئی۔
"سکینہ بی بی کی بچی، میری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتی ہے۔ سچ بتا کہاں سے آرہی ہے۔" کرار خاں اس کے پیچھے لپکتا ہوا گھٹی گھٹی آواز میں چیخا۔ وہ دیر تک بکتا جھکتا اور پیر پٹکتا رہا۔ لیکن گلبیا ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح ایک کونے میں پڑی رہی۔ ایک تیز خنجر تھا جو اس کے سینے میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اس رات کے بعد وہ حویلی میں واپس نہ گئی۔ سکینہ کی شادی کو ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ اور حویلی سے بلاوے پر بلاوا آرہا تھا۔ کرار خاں نے بھی گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ وہ نہ کھاتا نہ پیتا اور گھٹنوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر نہ جانے کہاں گھورتا رہتا۔ کبھی

کبھی اس کے دانت جکڑ جاتے اور ہڈیاں چٹخنے لگتیں۔ سکینہ کی شادی سے ایک دن پہلے شام کو کرار خاں بیٹی کے پاس آیا۔ اس نے گلبیا کا گلا پکڑا اور گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا:

"گلبیا سچ بتا تجھے کیا ہوا ہے۔ متلی کیوں ہوتی ہے تجھے؟"

گلبیا کا سر جھک گیا۔ پھر اس نے اپنے تانبے کے چھلے سے کھیلتے ہوئے نظریں جھکالیں اور ہولے سے بولی: "بابا مجھے مار ڈالو....."

"بتا... بتا کون.... کون... تھا" کرار خاں نے کچھ ایسی آواز میں کہا جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ "میں اس کا خون پی جاؤں گا..."

گلبیا کی آنکھیں جل اٹھیں۔ اس کے ہونٹ زخم کی طرح کھلے۔ اس نے اب کے زیادہ صاف مگر ڈرامائی آواز میں کہا.... "سرکار.....!"

کرار خاں تھوڑی دیر جھومتا رہا جیسے کسی بھرے ہوئے سانڈ نے دونوں سینگ سینے میں اتار دیئے ہوں۔ پھر اس کا بھاری ہاتھ اٹھا اور گلبیا ایک تھپڑ میں لڑھکتی ہوئی کونے تک چلی گئی۔ اس کے آنچل کی ہوا سے چراغ بجھ گیا۔

کرار خاں رات بھر کراہتا رہا اور گلبیا مسکراتی رہی۔ دوسرے دن صبح سویرے نہ جانے وہ جنگل میں کدھر نکل گیا... بیر ڈوبے لوٹا۔ اپنی بیوی کی قبر پر کھڑا اس کی مٹی کو گھورتا رہا۔ جو اندر دھنس گئی تھی۔ اس نے قبر کو گھونسا دکھایا۔ جیسے گلبیا کی تباہی کی ساری ذمہ داری اس قبر میں سوئی ہوئی عورت کی ہو۔ وہ بڑی رات گئے لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے اندھیرے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ جھونپڑے میں بلا کا سناٹا تھا۔ جیسے کوئی بھوت رینگ رہا ہو۔ کرار خاں کا سانس رک گیا اس نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "گلبیا....."

خاموشی!

"گلبیا..... میری بیٹی!"

خاموشی!

اس نے ٹٹول کر دیا سلائی اٹھائی اور کونے والے طاق پر چراغ جلایا۔ دھیرے دھیرے اندھیرے کی دھند سے گلبیا کا جسم ابھرا..... وہ گودڑ پر اوندھے منہ پڑی تھی۔

کرار خاں چراغ اٹھا کر اس کے قریب آیا۔۔۔ "بیٹی۔۔۔۔" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے پکارا۔

گلبیا نے آہستہ آہستہ چہرہ اٹھایا تو اس کے ہونٹوں کے کونے پر باپ کو خون کا قطرہ کبوتر کی آنکھ کی طرح تھرتھراتا نظر آیا۔

"یہ کیا!"

گلبیا زور سے چیخی اور اس کے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھ گئے۔

کرار خاں بھاگا اور جب جاوید کو ساتھ لے کر لوٹا تو گلبیا کی ٹھوڑی پر ایک سرخ دھاری آہستہ آہستہ تیر رہی تھی۔

جاوید نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد بڑی سرد آواز میں کہا۔ "تمہاری بیٹی نے تو زہر کھا لیا ہے۔"

کرار خاں سُن ہو گیا ڈاکٹر کی آواز اسے ہوش میں لے آئی۔

"گلبیا کو ہسپتال لے چلو۔۔۔۔"

چماری اور کرار خاں نے گلبیا کی چارپائی گودڑوں سمیت اٹھائی اور ہسپتال کی طرف دوڑے ہسپتال جاتے ہوئے وہ چارپائی سمیت دربار کے آگے سے گزرے۔ کرار خاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔۔۔ دربار کے ولائتی کتے ان کو دیکھ کر بھونکنے لگے۔ کرار خاں نے غصے میں لپک کر ایک لات کتے کے منہ پر جمادی۔

گلبیا کو اس پتلی چارپائی پر لٹایا گیا۔ جس پر کچھ دن پہلے پرمیشر سنگھ پڑا موت سے لڑ رہا تھا۔ گلبیا سے قے کرانے کی کوشش کی گئی۔ قے ہوئی مگر سرخ۔ جب دو تین گھنٹے کی کوشش کے بعد بھی کوئی کام نہ بنا اور گلبیا کے منہ سے کوئی چیز کٹ کٹ کر گرنے لگی تو جاوید نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور انتہائی مایوسی سے کرار خاں کو دیکھا۔

کرار خاں اس کے پاس دوڑا ہوا آیا۔ "ڈاکٹر بابو۔۔۔۔" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اسکا چہرہ بہت بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔

"تم نے بہت دیر کر دی کرار خاں۔

جاوید نے ٹھنڈی سانس لی: "بہت دیر کر دی اب نہ وہ بچ سکتی ہے نہ اس کا بچہ!"

درگا پرشاد نے زور سے گھبرا کر پکارا "ڈاکٹر صاحب جلدی!"

گلبیا کا ایک ہاتھ چارپائی سے لٹک گیا تھا اور خوبصورت ٹھوڑی پر خون کی دھار خشک ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے ڈر کر سکتے میں آ گئی ہو۔ ہرن چوکڑیاں بھرنا بھول چکا تھا...... مگر ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ جاوید کو اس جوان عورت کی لاش یاد آ گئی جس کی چیر پھاڑ سے کلکتے میں اس نے انکار کر دیا تھا اور چیخ کر بھاگ گیا تھا۔ یہ جسم بھی اتنا ہی جوان تھا، اتنا ہی لچکیلا، اتنا ہی گدرایا ہوا۔

جاوید کو لگا اس کی مسکراہٹ دنیا کا سب سے خوبصورت پھول ہے...... ہاں کوئی دیکھتا...... اس بہار آفریں خزاں کو...... وہ خود اپنی موت پر کس طرح ہنس رہی تھی۔

نہ کرار خاں کے منہ سے چیخ نکلی نہ آنکھوں سے آنسو۔ وہ آہستہ سے لاش کی طرف بڑھا اور اسے بازوؤں میں اٹھانے کے لئے جھکا۔

درگا پرشاد نے اس کو روکا: "کرار خاں صبر کرو۔ لاش کو یہیں رہنے دو پولیس کو رپورٹ دی جائے گی۔ پوسٹ مارٹم ہو گا...."

کرار خاں کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، اس نے پلٹ کر درگا پرشاد کو دیکھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے لاش بازوؤں میں اٹھالی۔ اسے یہ لاش پھول سے بھی زیادہ ہلکی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال بجری پر لٹک رہے تھے۔

کرار خاں اندھیری اور گرم سڑک پر اس طرح چل رہا تھا جیسے دلدل میں چل رہا ہو۔ اس نے مسجد کا پورا چکر کاٹ کر دربار کے سامنے سیمنٹ کی کرسی پر بیٹی کی لاش رکھی بھاری قدموں سے زینے پر چڑھا اور بیٹھک کے دروازے کا پردہ اتنی زور سے کھینچا کہ پردے کے ساتھ ساتھ پردے کا ڈنڈا بھی نیچے آ رہا۔ اس نے پردے کا چکنا ڈنڈا اٹھالیا۔ سرکار عبدالجبار نے آنکھوں کے سامنے سے مور کے پروں کے پنکھے کی طرح پھیلے ہوئے تاش کے پتے ہٹائے اور اس کی چیخ گلے میں اٹک کر رہ گئی۔

جب عبدالجبار کے کالے سر سے سرخ پچکاری چھوٹی تو کرار خاں کے دماغ سے گلبیا کا

جوان جسم نکل گیا اور اس کی آنکھوں میں ایک کالا سور ابھر آیا جس کی گردن مسہروں نے کاٹ دی تھی۔ اس کی موٹی سی نس سے خون کی پچکاری اسی طرح چھوٹ رہی تھی۔ اس نے پردے کا ڈنڈا پھینکا۔ خاموشی سے مڑا اور زینے سے اترنے لگا۔ لیکن ابھی اس نے گلبیا کی لاش اپنی کٹیا کے اندھیرے میں رکھی ہی تھی کہ اس کو سرکاری آدمیوں نے جا لیا۔ سرکاری لٹھیتوں نے منشی کی رہنمائی میں اصطبل کے سامنے اسے منڈیر پر دے مارا اور پھر گھنٹوں بھبھڑ مارے اس کا کلیجہ چھلنی کرتے رہے، اس کی داڑھی نوچتے رہے۔ آخر وہ بیہوش ہوگیا۔ آنکھ کھلی تو صبح کا جھٹپٹا پھیل چکا تھا اور مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن فوراً جھک گیا اور اس کے سینے میں چکی سی گھومنے لگی۔ وہ بانس کے جنگل کے کنارے کنارے رینگتا رہا آخر جب اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو گلبیا کی لاش پولیس والے اٹھا کر لے جا چکے تھے۔ جھونپڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک باریک سی کرن درختوں کو چیر کر جھونپڑے میں تیرتی ہوئی پہنچی اور گودڑوں پر خون کا ایک قطرہ یاقوت کی طرح چمک اٹھا۔ کرار خاں کسی بھیانک زخمی درندے کی طرح چیخا اور اپنے تہمد کی دھجیاں اڑاتا ہوا گھنے جنگل کی طرف بھاگ گیا ...... دربار سے دور بہت دور جہاں عبدالجبار اپنے بستر پر بے چینی سے کروٹ بدل رہا تھا۔

عبدالجبار کی مرہم پٹی جاوید نے رات ہی کر دی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر نہایت بے رحم جھٹکے کے ساتھ اس کی ران میں ایک انجکشن بھی لگا دیا تھا۔ عبدالجبار سوئی کے چبھتے ہی بہت زور سے چیخا۔ ''بس اتنی سی چبھن پر چیخ پڑے۔ یہ تو سوئی ہے۔ تلوار نہیں ہے ...... وہ جو پرمیشر سنگھ پر گری تھی، جو مجھ پر جھپٹی تھی۔'' جاوید نے سوچا اور دواؤں کا بکس اٹھا کر تیز تیز قدموں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں عبدالجبار کی آنکھ کھلی۔ پھر اسے کرار خاں کا بھیانک چہرہ دانت پیستا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں ...... اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کلکلاتے ہوئے تکیے سے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔ تکیہ نرم پڑ گیا۔ اس کی نرمی میں پیچ و خم پیدا ہوئے نرم و گرم زاویے اس کی انگلیوں میں گدگدی پیدا ہوئی اور ہر ہر لمس سے سو سو چراغ جل

اٹھے۔ اس کے نتھنے پھولنے لگے ...... یہ شربتی آنکھیں ہیں۔ چوکڑیاں بھرتے ہوئے ہرن کی آنکھیں، یہ آنکھوں کا چڑھتا اور ٹوٹتا ہوا نشہ ہے، یہ مسلے ہوئے پھول ہیں، پسینہ ہے، خون ہے ...... یہ خون ہے اور اس خون میں ایک لچکدار جسم تیر رہا ہے ...... اچانک جسم میں جان پڑ گئی ...... ہاتھ جسم پر دوڑ رہا ہے ...... یہ ناف ہے اور گرم گرم گولائی ...... یہ سر ہے ...... کسی نے ہاتھ بڑھایا اور ایک ہی وار میں یہ سر ناریل کی طرح ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔ ...... پاتال میں کھو گیا۔ اچھا ہی ہوا ...... لے جاؤ ...... یہ عورت نہیں۔ ہے، لاش ہے اسے اس کے باپ نے زہر دے دیا ہو گا ...... اسے تھانے لے جاؤ ...... تھانیدار اور تم بڑے کائیاں ہو ...... تمہارے جیسے لوگوں کے دم سے شرافت اور انسانیت کا چراغ اس طوفان میں بھی جل رہا ہے ...... عبد الجبار نے ایک جھٹکے سے تکیہ اٹھا کر پھینک دیا۔ کئی بار آنکھیں کھولیں۔ لیکن اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اب ایک ننھا سا گلاس سورج کی طرح چمکنے لگا ...... اور تھرتھراتے ہوئے دو سیاہ ہاتھ ...... ارے یہ تو میرے ہاتھ ہیں۔ اور یہ سفید سفید سی کیا چیز گلاس میں گر کر پانی میں جا رہی ہے ...... اور یہ "دارو" "ابا جان بس دوا پی کر سو جائیے ...... نیند آجائے گی!" اچانک ایک نورانی چہرہ سامنے آگیا۔ اتنا قریب کہ کافور کی بو اس کے سانس کو چھیڑنے لگی۔ ابا جان آپ یہاں؟ میں تو آپ کو جنت میں سلا آیا تھا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے زہر دیا آپ کو؟ نہیں نہیں آپ کے فرشتے جھوٹ بکتے ہیں۔ آپ کا خدا بھی جھوٹا ہے۔ توبہ ہے۔ یا اللہ موت آجائے مجھے۔ میری زبان جل جائے جو میں جھوٹ کہوں۔ ابا جان آپ کو یقین دلاتا ہوں یہ دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو زہر دیا ہو تو روسیاہ! جی ویسے روسیاہ تو ہوں ہی۔ لیکن ... لیکن ... دیکھیے یہ نہ کہیے۔ میں نے سکینہ کو نہیں بیچا۔ میں نے تو اس کے لئے بہترین بر ڈھونڈا ہے۔ زمانہ گواہ ہے۔ میں نے ابا آپ کی امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھا ہے۔ رنڈیوں کے کوٹھے پر کون نہیں جاتا۔ ذرا شوقین لڑکا ہے۔ نہیں ابا نہیں۔ بہن سے زیادہ شکر مل کیسے عزیز ہو سکتی ہے۔ پھر بھی آپ نے جو کچھ چھوڑا ہے دگنا کر کے آپ کے پوتوں کے سپرد کروں گا۔ تاکہ وہ چار چار چادریں چڑھائیں آپ کے مزار پر۔ قیامت تک عرس ہوتا رہے، قوالیاں ہوتی رہیں ......

جی بجا ارشاد۔ میں ڈاکٹر سے ہوشیار ہوں۔ جی وہ گلبیا...... اس نے کچھ کہا آپ سے؟۔ جی ہاں تھی تو پھول۔ جی نہیں میں بھلا کیوں چھوتا اسے۔ کسی اور نے مسل دیا ہوگا۔ ویسے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں یہ پٹھانیاں وٹھانیاں..... نہیں نہیں اب مجھ سے یہ گناہ نہیں ہوگا۔ نہیں سچ کہتا ہوں میں کسی کو زہر نہیں دوں گا۔ جی ضرور..... آج ہی کفارہ ادا کروں گا۔ ابھی.....

اس کی آنکھ کھل گئی۔ سر میں شدید ٹیس محسوس ہوئی اس نے بھاری ہاتھ اٹھایا اور آنکھ پر لے گیا...... ایک آنکھ پٹی کی پلیٹ میں آگئی تھی اور دوسری سے اب تک پوری طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ روشنی کے دھندلے دھندلے گالے کہیں دور بھڑکتے اور بجھتے اور رنگین بھنور میں تیرنے لگتے۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں تر تھا۔ وہ باپ کے خیال سے خوف زدہ تھا۔ یہ سب کچھ اس کے گناہوں کی سزا ہے۔ اس خیال سے اس کا دم گھٹ کر رہ گیا کہ جنت میں اس کے باپ کی روح بے چین ہے۔ عرس، قوالی، نذر نیاز، کسی دوا اور دعا نے کام نہ کیا۔ کیا اس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ "میرا گناہ معاف کر دیجئے ابا۔ اپنے گنہگار بیٹے کو بچا لیجئے۔ اپنے کلیجے سے لگا لیجئے......"

اسے بنن کا آنسوؤں سے دھلا ہوا چہرہ یاد آگیا۔ اس نے خیال ہی خیال میں بنن کو چمکارا۔ پھر باپ کا چہرہ نظر آیا.....زہر پی کر بھی پرسکون چہرہ! اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس نے خیال ہی خیال میں پھر سکینہ کو پیار کیا اور اس کی سیندور سے دہکتی ہوئی افشاں بھری مانگ پر ہاتھ پھیرا۔ "اللہ کرے تو سدا سہاگن رہے۔"

آہستہ آہستہ سر کی تکلیف کم ہوئی اور پٹی سے آزاد آنکھ سے کچھ نظر آنے لگا۔ سب سے پہلے باپ کی تصویر نظر آئی۔ وہ ڈر گیا۔ اس کا دل بھر آیا..... وہ پہلی فرصت میں اجمیر شریف جائے گا اور مسجد کے ساتھ ایک مسافر خانہ بنوائے گا..... اس نے منشی کو بلوایا اور حکم دیا کہ مسجد کے سایہ میں بیٹھے ہوئے فقیر کو لنگی، چاندی کا پیالہ، ایک چادر اور سو روپے دے کر رخصت کر دو۔ منشی فرشی سلام کر کے واپس چلا گیا۔ دودھ پینے کے بعد عبدالجبار کو پھر طاقت کا احساس ہوا اور جب اسے معلوم ہوا کہ فقیر سلامتی اور پھولنے پھلنے کی دعائیں دے کر چلا گیا ہے تو اس کے سینے پر سے ایک سل ہٹ گئی۔ "منشی، کرن سنگھ کو یہاں بھیجو۔"

اس نے منہ میں پان کی گلوری رکھی مگر فوراً اگالدان میں تھوک دی ۔۔۔۔ منہ چلاتے ہی جبڑوں سے لیکر منہ تک کوئی چیز جلنے اور چھٹنے لگی تھی ۔۔۔۔ "کرار خاں کا بچہ! اتنے جوتے پڑیں گے کہ ۔۔۔۔۔"

کرن سنگھ نے آتے ہی جھک کر سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ اس کے چہرے پر ایک بناوٹی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس اداسی کے ثبوت کے طور پر اس نے خلاف عادت اپنی مونچھوں پر تاؤ بھی نہیں دیا ۔۔۔۔۔

"گلبیا کا معاملہ دبا دو!"

"اس کو دباتے کیا دیر لگتی ہے سرکار، مگر ۔۔۔۔"

"مگر ڈاکٹر ۔۔۔۔۔ لگتا ہے اب تم کچھ بھی نہیں کر سکتے ۔۔۔ فالج مار گیا ہے۔ ڈاکٹر تو تمہارے گلے میں مچھلی کے کانٹے کی طرح پھنس گیا ہے ۔۔۔۔۔"

"کانٹا ۔۔۔ حضور آپ فکر نہ کریں یہ کانٹا بھی نکل جائے گا ۔۔۔۔"

"نکل جائے گا ۔۔۔" عبدالجبار نے کچھ اس طرح منہ بگاڑا کہ خبیث اور سیاہ روح کی ساری کرختگی، سارا کرب چھلک پڑا۔ اور پھر دونوں سر جوڑ کر اتنے آہستہ آہستہ بات کرنے لگے کہ دیواریں بھی نہ سن سکیں ۔۔۔۔ "جلدی ۔۔۔۔ بس بس ۔۔۔ ٹیڑھی انگلی سے گھی ۔۔۔۔"

برکھا رُت آئی۔ اُمڈ کے گھٹائیں چھائیں۔ جنگلوں اور پہاڑوں پر نم نم سا خنکی بھرا سکون چھا گیا۔ شیشم، گولر، پیپل، برگد، امرود اور آم کے درختوں پر جھولے پڑ گئے اور ان میں ان دیکھی اپسراؤں کے آنچل سرسرانے اور ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو بکھیرنے لگے۔ یہ خوشبو

صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب برکھا رُت کی پہلی پھواریں پیاسی دھرتی، جلتے ہوئے درختوں اور جھلستے ہوئے پتوں کو چومتی ہیں اور جب ہر چیز سے بھیگا بھیگا سا لیکن گرم دھواں اٹھتا ہے۔ یہ دھواں افق سے سیاہ دریا کی طرح امڈتا ہوا چلا اور کاہی پہاڑوں اور جنگلوں پر آہستہ آہستہ تیرتا چلا گیا۔ گھر کے بادل آئے اور ٹوٹ کے برسے۔ جاوید بارش میں گھر گیا۔ وہ ابھی گاؤں سے کوئی ایک کوس کی دوری پر تھا۔ اسے امید تھی کہ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی ہسپتال پہنچ جائے گا۔ لیکن چھاچھوں برستے ہوئے پانی میں اب تو ایک قدم بھی آگے بڑھنا ناممکن ہو رہا تھا۔ قدم قدم پر گھوڑا بھٹکتا، نتھنے پھڑکاتا اور ہنہناتا۔ ہر قدم پر جنگل میں بھٹک جانے کا خطرہ تھا۔ جاوید ایک بلند چھتنار درخت کے نیچے گھوڑے سے اتر گیا۔ وہ سر سے پیر تک شرابور ہو چکا تھا۔ بجلی کڑکتی تو زمین پر تیرتا اور ناچتا، پانی سونے کے آئینوں کی طرح چمکتا اور برستے ہوئے پانی کی دھاریاں سنہری لڑیوں کی طرح جھلملا جاتیں۔ رات کا اندھیرا چھانے لگا۔

یکایک اسے آسیبی کھنڈر کا خیال آیا تو جسم میں ٹھنڈی تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑے نے بھی کان پھڑپھڑائے اور اتنے زور سے ہنہنایا کہ اس دھواں دھار بارش میں بھی درخت سے پرندے اڑے، اور ایک بڑا سا گھونسلہ انڈے سمیت اس کے قدموں پر آن گرا۔ اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور گھونسلے کو اٹھالیا۔ مینا کے گھونسلے میں ایک انڈا رکھا ہوا تھا۔ جاوید نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر بھیگا ہوا گھونسلہ درخت کے دو شاخے میں اٹکا دیا۔ پھر بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گھوڑے کی طرف دیکھا، "کیوں دوست آگے چلیں۔ یہ بادل تو کھلتے نظر نہیں آتے جانے کب کی کسر نکال رہے ہیں؟"

اسے ایک بار پھر آسیبی کھنڈر کا خیال آیا اور سر سے پیر تک پھر ٹھنڈی کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس کے پاس بندوق نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں تو آنکھوں میں بھرا ہوا پانی آنسوؤں کی طرح بہنے لگا۔ "اوہ مجھے بخار تو نہیں آرہا ہے" اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی لیکن گھٹنے کانپنے لگے ...... بڑی مشکل سے بایاں پیر رکاب میں رکھا اور گھوڑے کی زین پر بیٹھ گیا ...... ایک بار پھر درخت کے اوپر دیکھا جس سے بڑی بڑی بوندیں مٹر کے دانوں کی طرح ٹپ

ٹپ زمین پر گر رہی تھیں۔ بلبلے بنتے تھے اور ٹوٹ جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ بارش کا زور تھما۔ ہوا تیز اور خنک ہوگئی۔ جنگل کے آگے سے یکایک سرمئی سا پردہ ہٹا اور شعلوں کی سرخ زبانیں لہرانے لگیں۔ اس نے گھوڑے کا رُخ دہکتی ہوئی آگ کی طرف پھیرا اور گھوڑا سنبھل سنبھل کر اسی راستے پر دلکی چلنے لگا جو آسیبی کھنڈر کی طرف سے گزرتا تھا۔ کھنڈر تک پہنچتے پہنچتے بادل پھٹ گئے، پچھم سے نارنجی کرنوں کا جال فضا میں ناچتا ہوا آیا اور بھیگے ہوئے درختوں پر پھسل گیا۔ اس کے رنگین عکس سے ایک ایک پتہ تتلیوں کے پروں کی طرح تھر تھرانے لگا۔

جاوید کوارٹر کے سامنے آکر رکا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ گھوڑے سے اترتے ہوئے اس کے پیر لرزے اور وہ پھسل کر گرا اور بیلے کے پودے تک لڑھکتا چلا گیا۔ کلیا اور جنگلی دونوں گھوڑے کی ہنہناہٹ سُن کر دوڑے۔ جب انہوں نے جاوید کو اٹھایا تو اس کے دانت بج رہے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ دونوں نے اس کی جلتی ہوئی سانس کو محسوس کیا۔ جنگلی اس کے کپڑے بدلنے لگا اور کلیا کمپونڈر کو بلانے کو دوڑا۔

گھنٹہ بھر بعد بخار نے ایک بپھرے ہوئے ریچھ کی طرح جاوید کو دبوچ لیا۔ آہستہ آہستہ سردی دور ہوئی اور لحاف جلتا ہوا لگا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ لیمپ کی زرد روشنی میں اس نے درگا پرشاد، کلیا اور جنگلی تینوں کو عجیب بدحواسی کے ساتھ اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تو اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔

"ارے تم تینوں تو بالکل گھبرا گئے۔ بھئی ملیریا یا ٹائیفائڈ نہیں ہے موسمی بخار ہے۔ اطمینان رکھو کل صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا"۔ اس نے کمپونڈر کو نسخہ لکھوایا۔

درگا پرشاد نسخہ لے کر ہسپتال چلا گیا۔ کلیا بھی اصطبل کی طرف چل دیا۔ جنگلی جاوید کے لئے چائے بنانے لگا...... اور چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑایا۔ "یہ لڑکا اپنی جان ہلکان کر کے رہے گا۔ بے نکیل اونٹ ہے۔ ...... میری کون سنے گا۔ میں ہوں ہی کون۔ دودھ کی مکھی۔ بوا تھیں سو وہ بھی چل بسیں ...... میں بھی چل بسوں گا۔" اس نے اپنے میلے آنسو پونچھے اور کھولتا ہوا پانی چائے دان میں انڈیلنے لگا۔

درگا پرشاد کے ساتھ منشی بھی آیا اور کان کھجاتے ہوئے بولا:" وہ سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ نے شام کو آنے کا وعدہ ...."

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ لیکن آپ دیکھ نہیں رہے بیمار ہوں۔ اور اچھا بھی ہوتا تب بھی ہرگز ...." اس نے خود کو روک لیا۔

منشی سلام عرض کرتا ہوا لوٹ گیا۔

درگا پرشاد بھی اسے سونے کی ہدایت کر کے چلا گیا۔ جنگلی نے مرغی کا گرم گرم شوربہ لاکر رکھا۔ اور بولا۔ "آج پرمیشر سنگھ نے دس مرغیاں بھجوائی ہیں اور کہا ہے ...."

" پرمیشر سنگھ نے مرغیاں بھجوائیں اور تم نے قورمہ پکالیا .... ہزار بار کہا ہے .... کبھی کسی سے ...." جاوید کی آواز غصے سے کانپنے لگی۔

"لے جاؤ جہنم میں اپنا شوربہ ...."

جنگلی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "پی لو .... آئندہ کبھی ...."

"تم ہمیشہ یہی کہتے ہو بڑے میاں .... اور .... تم خوب جانتے ہو لوگ رشوت بھیجتے ہیں۔ میری ایمانداری پر شک کرتے ہیں ...."

گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ جاوید چونک گیا۔ جنگلی نے آکر بتایا "کھود .... سرکار .... کھود سرکار .... باپ رے ...."

"بکومت .... جاؤ یہاں لے آؤ"

جاوید کا سر چکرانے لگا .... "قصہ کیا ہے؟"

کسی نے اس کے کان میں کہا .... "پیاسا کنوئیں کے پاس آرہا ہے ...."

"میاں حیرانی کی کیا بات ہے!" عبدالجبار نے ایک بڑی سی آرام کرسی میں دھنستے اور ہانپتے ہوئے کہا۔ جیسے فتن کو خود ہی کھینچ کر یہاں لایا ہو۔

"لیکن آپ نے تکلیف کیوں کی؟" جاوید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بتاتا ہوں، اچھی طرح بتاتا ہوں .... ذرا دم لینے دو ...."

دونوں نے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا۔ جاوید کو اس احساس سے بڑی راحت

ہوئی کہ عبدالجبار اس سے آنکھیں چار کرنے سے کترا رہا ہے۔ اس کی نظر جلتے ہوئے لیمپ پر جمی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف پروانے اڑ رہے تھے۔

"برسات آئی نہیں کہ پروانے جل مرے۔ لیکن ڈاکٹر تم کیسے کیسے بیمار ہو گئے۔"

"جیسے سب بیمار ہوتے ہیں ۔۔۔" ڈاکٹر نے شہتیر تکتے ہوئے کہا۔

یہ جواب سن کر عبدالجبار خاموش ہو گیا اور چھڑی سے جوتے کی گرد جھاڑتا رہا جس پر گرد کا ایک ذرہ نہ تھا "جانتے ہو میں اس وقت تمہارے پاس کیوں آیا ہوں۔ تم برے وقت بیمار پڑ گئے ۔۔۔۔۔۔"

"بیمار پڑنے سے پہلے آپ سے مشورہ کر لینا چاہئے تھا!"

عبدالجبار کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ جاوید نے جنگلی سے چائے لانے کو کہا۔

"جاوید آخری بار میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم چاہو تو ۔۔۔۔۔"

"وہی باتیں کہنا چاہتے ہیں جو پہلے بھی پچاسوں بار کہہ چکے ہیں؟"

"آج دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو کر رہے گا یہ سب برداشت نہیں کر سکتا میں۔ مجھ سے دشمنی کر کے آگ سے کھیل رہے ہو ڈاکٹر!"

"میں دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے دشمنی کرتا ہوں ۔۔۔ آپ خود ہی سوچئے کھیلنے کو آگ کے سوا اور کچھ نہ ہو تو آدمی کیا کرے ۔۔۔۔۔!"

"میں بحث کرنے نہیں آیا!"

"میرا بھی یہی خیال ہے!" جاوید نے لیٹ کر کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر ایک بے تکی سی خاموشی اور تناؤ قائم رہا پھر اچانک جاوید اٹھ بیٹھا لالٹین کی بتی تیز کی اور سیدھے عبدالجبار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ عبدالجبار کا ہاتھ بے ارادہ اپنی دائیں بھول کے اوپر زخم کے ہلالی نشان کو سہلانے لگا۔

"عبدالجبار صاحب میں بھی چاہتا ہوں ہم چبا چبا کر باتیں نہ کریں۔ آپ بڑے آدمی ہیں ۔۔۔ میرا مطلب ہے مالدار آدمی ہیں۔ آپ کے پاس زمین ہے۔ آپ کے پاس پتہ نہیں کتنے کمیرے ہیں جن کی پیٹھ پر آپ جوتوں کی گرد جھاڑا کرتے ہیں۔ آپ کی کلالی ہے۔ شکر مل

بنوانے والے ہیں آپ۔ کرن سنگھ دن رات آپ کی جوتیاں چاٹتا ہے۔ آپ چاہیں تو لوگوں کے گھروں پر......"

"ہاں ہاں لوگوں کے گھروں پر گدھے سے ہل چلوا سکتا ہوں!" عبدالجبار اپنی چھڑی کو زور سے جوتے پر مارتے ہوئے چلایا۔

"بہت خوب! یہ سب میں سُن چکا ہوں!" جاوید نے عبدالجبار کے چہرے پر غصے اور گھبراہٹ کی جھلک دیکھی اور مسکرایا۔

جنگلی نے چائے لاکر رکھی۔ جاوید نے کانپتے ہاتھوں سے چائے بنا کر عبدالجبار کی طرف بڑھائی۔ عبدالجبار نے پیالی پکڑلی، لیکن پیے بغیر ایک طرف رکھ دی۔ جاوید اپنے ہاتھ کانپتے دیکھ کر جھلا گیا۔

"ڈاکٹر..... کان کھول کر سُن لو۔ تم نے فخرالدین سے جو کچھ کہا ہے۔ اس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا!"

جاوید چونک گیا۔ اس نے گرم چائے کا گھونٹ پیا۔ اس کی زبان جل گئی لیکن اس نے دوسرا گھونٹ پیتے ہوئے عبدالجبار کو گھور کر دیکھا۔

"عبدالجبار صاحب میں آپ کا کمیرا نہیں ہوں مجھ سے اس طرح بات نہ کیجئے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے کسی سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر مجھے شرم آنی چاہیے..."

"تم بے شرم آدمی ہو۔ تم نے سکینہ کی زندگی تباہ کر دی اور اب..... جانتے ہو یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا......"

"کیا ہوا میری وجہ سے؟"

"تمہاری وجہ سے سکینہ کو سسرال میں روک لیا گیا یہاں نہیں آنے دیتے۔ حد تو یہ ہے کہ فخرالدین دکھانے بھی نہیں آیا.......یہ خط دیکھو!"

جاوید نے خط پڑھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کا اپنا کہیں ذکر نہ تھا، بار بار اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ایک بیمار لڑکی کو زبردستی ایک شریف نوجوان کے گلے منڈھ دیا گیا ہے......اور یہ کہ اس میں کوئی غرض پوشیدہ تھی......اور ایسی بہت سی شکایتیں، بہت سی دھمکیاں!

"میں کچھ سمجھا نہیں عبدالجبار صاحب!" اس نے خط لوٹاتے ہوئے کہا
"ڈاکٹر، ہمارے یہاں ڈاکٹر ہمیشہ دربار کا آدمی بن کر رہتا ہے۔۔ لیکن تم۔۔۔۔"

"ہاں میں نہ دربار کا آدمی ہوں نہ بنوں گا۔"

"اب بھی چاہو تو۔۔۔۔"

"دھمکی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں سرکار عبدالجبار کی سواری مجھ جیسے ناچیز کے گھر کیوں آئی ہے۔ مجھے نہیں خرید سکتے آپ۔ آپ کی دھمکی اور جوڑ توڑ کی اتنی سی بھی پروا نہیں ہے مجھے۔ میں جانتا ہوں مجھے یہاں سے ہٹانے کے لئے آپ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ میری بلا سے۔ اور مجھے آپ کے جنگلوں اور آپ کی فوجداریوں سے عشق نہیں ہے۔۔۔۔" جاوید چیخ چیخ کر بولنے لگا۔

عبدالجبار اٹھ کر چل دیا۔ باہر منشی کو دیکھ کر غرایا۔۔۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔۔ کوچوان دیکھتے نہیں۔۔۔۔ کمبخت سب حرام خور ہوگئے ہیں۔۔۔۔ فٹن کے پہیے سڑ تے چلے جا رہے ہیں اور تم سے اتنا نہ ہوا کہ۔۔۔۔" فٹن تاڑ کے پاس پہنچ کر مسجد کی طرف مڑ گیا۔

جاوید نے شوربہ نہیں پیا۔ اس کا سارا جسم کانپتا رہا کچھ غصے سے اور کچھ چڑھتے ہوئے بخار سے۔ جنگی نے دل ہی دل میں سرکار کو سڑی سڑی گالیاں دیں اور بولا بالکل سانڈ دکھتا ہے۔۔ جاوید دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند نہیں آئی۔ اس کو امید تھی ایک دو دن میں اس کا بخار اتر جائے گا۔ لیکن اس کا جسم ہفتہ بھر جلتا رہا اور جب بخار اترا تو معلوم ہوا کہ بخار نے اس کے جسم کا ایک ایک قطرہ خون جلا دیا ہے۔ اس کے گال پچک گئے تھے اور چہرے پر ایک بجھی بجھی سی زردی چھاگئی تھی۔

جس دن اس کا بخار اترا اسی دن اس کو روز کا خط ملا۔ بہت ٹوٹا پھوٹا سا خط تھا۔ اس کی جذباتی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔۔۔۔ "تم سے ملاقات ہو سکتی تو کتنا اچھا ہوتا۔۔۔۔" یہ آخری جملہ بار بار پڑھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کمزوری سے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے روز کی تصویر باہر کے کمرے سے منگوا کر سرہانے والی میز پر رکھ دی۔ اسی رات ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین کے نام درخواست لکھی اور جنگی کو سائکل پر خط لے کر روانہ کر دیا۔ اسے کو معلوم تھا کہ چیرمین

اور عبدالجبار کی رقابت عروج پر ہے اور جاوید اسی کی ضد پر ہسپتال میں ٹکا ہوا ہے۔
ورنہ عبدالجبار تو اُسے اکھاڑ پھینکنے کے لئے سارے داؤ چل چکا تھا۔

رات بھر جاوید کی آنکھوں میں روز کا تصور جاگتا رہا۔ لیکن روز کا تصور بار بار بلبلے کی طرح مٹ جاتا اور مکھی کی طرح ایک دوسرا مکھڑا آہستہ آہستہ اُبھرتا...... سکینہ کا چہرہ۔ شاکی، ستا ہوا، پیلا، درد سے ہونٹ کاٹتا ہوا..... کانپتی ہوئی پلکیں پسیجتا ہوا تل۔

ایک بار اس کی آنکھ بھی لگی تو ایک آواز نے چونکا دیا...... "آؤ بھاگ چلیں......"

بیماری کا پورا ہفتہ بڑی بے چینی میں گزرا۔ اچانک جاوید کو تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ جب تک وہ اچھا تھا ہسپتال سے، مریضوں کے علاج سے اور گاؤں گاؤں کی دوڑ دھوپ سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ ان جھمیلوں سے نکلنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ دربار سے ٹکر لے کر گویا اسے اپنی روح کے کربناک سناٹے سے کترا کر نکل جانے کا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ ماسٹر شاہ عالم اور مولوی نے ہوا کا رُخ دیکھ کر اب اس کے پاس آنا بند کردیا تھا۔ ہاں نریش صبح شام آتا اور گھنٹوں عجیب عجیب باتیں کرتا۔ زیادہ تر خواب کی باتیں۔ یہ آدمی پہلی بار جاوید کو کتنا چاپلوس لگا تھا۔ اور اب وہ اپنا دل ایک معصوم بچے کی طرح اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا تھا۔ اسے تو بس یہاں سے نکل بھاگنے کا خبط تھا۔ جیسے دنیا بھر کی برائیاں صرف اس جنگلی وادی میں اکٹھا ہوگئی ہوں.... باقی دنیا روشن اور پاک ہو۔ جاوید ہمیشہ اس کے خوابوں پر حقیقت کے اولے برسا دیتا تھا۔ "نریش جہاں جاؤ گے یہی اندھیرا ملے گا۔ لیکن اسی اندھیرے میں وہ روشنی تھرتھراتی ہے جو......" وہ خاموش ہوکر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ آنکھیں بند ہوجاتیں اور پیشانی پر بل پڑجاتے۔ نریش اٹھ کر چلا جاتا اور جاوید بخار سے جلتے ہوئے سر کو جھنجھوڑ کر زور سے کہتا...... "آخر یہ مایوسی کیوں! کبھی میں بھی نریش کی طرح سنہرے خواب دیکھتا تھا۔ اب بھی دیکھتا ہوں۔ خواب بھی نہ دیکھوں تو کیا کروں.... شاید جنگل کے اس پار اندھیرا نہ ہو...... روشنی ہو...... روشنی ہو......!

اور دیکھتے دیکھتے تصور کے افق پر ایک چہرہ اُبھرتا، پھر دوسرا۔ ایک چاند ڈوبتا، پھر دوسرا۔
اور ان طلوع اور غروب ہوتے ہوئے مہتابوں کی روشنی میں وہ خود ڈوبتا اور اُبھرتا رہتا۔

تین دن بعد جب اس کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی طاقت آئی تو شام کے سرُخی مائل دھندلکے میں آسمان برس کر کھل چکا تھا۔ خنک ہوا سنسنا رہی تھا اور جنگل کو نیند سی آگئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ کلیا، چماری، درگا پرشاد اور نریش اسے چھوڑنے آئے۔ اس نے کسی سے کوئی خاص بات نہ کی۔ صرف کلیا کا شانہ تھپتھپایا ......
"گھوڑے اور پھولوں کا خیال رکھنا ...... بس سات دن ......"

گاڑی آگئی اور وہ سوار ہوگیا۔ جب گاڑی شنکری ندی کے پل پر سے گذری تو اس نے کھڑکی سے دیکھا ...... دور جنگل میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ پہاڑیوں پر آگ لگی ہوئی تھی۔ جنگل اور پہاڑیوں کے سائے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے سر کھڑکی سے باہر نکالا اور آنکھیں بند کرلیں۔ مسافر سمجھے ہوں گے کہ یہ گھبرایا گھبرایا زرد گالوں اور الجھے بالوں والا اداس اور بیمار مسافر برسات کی بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے کھا کھا کر سوگیا ہے۔ اس کے چہرے پر اکا دکا بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔ اور وہ ایک بڑے شہر اور لہراتے ہوئے ایک دلربا پیکر کے تصوّر میں کھویا ہوا تھا ...... اس میں برسات کی ہواؤں کی لچک اور لطافت تھی ...... اور پھواروں کے لمس کی ٹھنڈی چنگاریاں ...... "دور بہت دور ....." جاوید کے دل کو ایک دھکا سا لگا ...... "اف یہ گاڑی کتنی سست رفتار ہے!"

22

جاوید کی آنکھ کھلی تو گاڑی ہوڑہ اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ بت سا بیٹھا اپنے جانے پہچانے اسٹیشن کو دیکھتا رہا۔ سارے مسافر اتر گئے تو قلی نے اس کا سوٹ کیس اٹھایا اور سوالیہ نظر سے اس کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"ہاں ہاں چلو ..... " جاوید اس کے پیچھے ہولیا۔ کلکتے کی زندگی کے شور اور ہنگامے نے اس کو اپنی بے چین لہروں میں کھینچ لیا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر جب وہ ایک کھلے ہوئے فٹن میں بیٹھا اور پتہ بتائے بغیر ہگلی کی مٹیالی لہروں پر تیرتی ہوئی ڈینگیوں کو دیکھنے لگا تو بوڑھے کوچوان نے چابک اٹھایا اور پلٹ کر دیکھا... مسافر نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور فٹن کو پل کی طرف موڑ دیا۔ "چل بیٹا چل!" اس نے گھوڑے کو چمکارا۔ سورج کی ترچھی کرنیں پانی میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ جہازی مزدور اپنے بڑے ہیولوں کو لچکاتے ہوئے زنجیروں کو کھینچ رہے تھے۔ کھلا ہوا پل ابھی ابھی بند ہوا تھا۔ جہاز دھواں اڑاتا ہوا پل کے کھلے سینے میں سے گزر چکا تھا اور اپنی کامیابی پر خوش ہو کر زور زور سے بھونپو بجا رہا تھا جیسے مٹی کے گھڑے میں بند کتا بھونک رہا ہو۔ پل کے برابر ہوتے ہی بگھیں، موٹروں سائیکلوں اور راہگیروں کا قافلہ اُمڈتے دریا کی طرح دوسری طرف بڑھنے لگا۔

جاوید بھی اس تیرتے بھڑکتے ہوئے ہنگامے میں سے ایک بت کی طرح گزرتا رہا۔ کوچوان نے بار بار پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ ..... بڈھے نے پان کی پیک کے پورے

گھونٹ کا مزا لیا اور ہنس کر دل ہی دل میں بولا۔ "صاحب گو ننگا جان پڑتا ہے سالہ۔ بیٹا .... بولتا ہی نہیں ....!"

جاوید ہگلی کی لہروں کو دیکھ رہا تھا اور ان لہروں کے ساتھ نہ جانے یادوں کی کتنی لہروں میں بہہ رہا تھا۔ ان کے جوار بھاٹے میں اپنی کشتی کھے کر بوٹانیکل گارڈن تک لے جا چکا تھا۔
لیکن تب وہ کشتی میں اکیلا نہیں تھا اس نے ملاح کو چھٹی دے دی تھی جو منہ زور ہواؤں میں اطمینان سے بیٹھا چلم پی رہا تھا اور روز بڑے تیکھے پن سے کشتی کی دیوار سے اڑی ہوئی اپنے اڑتے ہوئے بالوں کو سمیٹ رہی تھی ... موجیں کشتی سے ٹکرا رہی تھیں۔ کشتی زور زور سے ہچکولے کھا رہی تھی۔ ... لیکن روز اور جاوید دونوں کو ڈوبنے کا ڈر نہ تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں کے سرمئی سائے دریا کے متلاطم سینے پر سو گئے تھے۔ ایک طرف آسمان گلنار ہو گیا تھا۔ اور ناریل اور کیلے کے درختوں میں آتشیں کرنیں بجھ رہی تھیں۔ ہوا تیز ہوتی گئی ..... یہی ہوا روز کی زلفوں سے کھیل رہی تھی اور اس کے آنچل کو بادبان کی طرح اڑائے لئے جا رہی تھی۔ یہی ہوا ان کے کانوں میں چیخ رہی تھی آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی تھی اور ان کے دل میں بھی ہلچل مچا رہی تھی۔ اس شام گھنے پیڑ کے نیچے چاند کی سنہری مسکراہٹ درخت۔ کے ایک ایک پتے اور گھاس کے ایک ایک تنکے کو چومتی رہی۔ ان کی رگ رگ میں ایک ہیجانی آگ بھرتی رہی تب ان دو دلوں نے اس طوفانی ہوا کا اقرار کیا اور اچانک ہوا کے ایک ایک جھونکے سے سو سو جام چھلک پڑے۔

"صاحب ... پتہ بتاؤ نا! ..... ہاں سالہ بیٹا ....!" کوچوان نے بڑا بازار کے نکڑ پر گھوڑے کو چمکارتے ہوئے پوچھا۔

جاوید چونک گیا۔ جلدی سے ہکلاتے ہوئے پتہ بتایا اور خاموش ہو گیا۔ اس کے تنکے ہوئے خشک ہونٹوں پر پھر ایک بار خوابناک مسکراہٹ ابھری۔ یہ مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ اس کا دل ماضی کی سب سے دل آویز یادوں اور مستقبل کے سب سے حسین خوابوں کا سنگم بن گیا ہے۔ دل ایک انجانی حسرت کے بھنور میں ناچ رہا ہے۔ ڈوب رہا ہے کچھ اس طرح جیسے ڈوب نہ رہا ہو۔ ناچ رہا ہو...

فٹن کو لوٹوں اور چونا گلی کے نکڑ پر رکا۔ جاوید سوٹ کیس ہاتھ میں لئے ہوئے تھوڑی دیر بھونچکا کھڑا رہا۔ جیسے اس سے کوئی بے تکی غلطی ہو گئی ہو کچھ سہما ہوا۔ اور اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ آخر وہ روشنی اور پر شور سڑک سے ہٹا اور اندھیرے زینے پر چڑھنے لگا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ سب سے اوپر والے مانوس دروازے پر اسے روز کے باپ کے نام کی تختی نظر آئی اس نے گردن سے پسینہ پونچھا سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کی اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کا اپنا دل اس آواز سے ڈر کر ایک گھونسے کی طرح اس کے سینے سے ٹکرا گیا۔ اس کے کانوں میں ایک مانوس آہٹ ابھری۔ آہٹ اور قریب آئی۔ دروازے کے پاس رکی۔ زنجیر بجی اور دروازہ کراہتا ہوا کھل گیا۔ اندر بہت اندھیرا تھا۔ بلب کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں اسے دو آنکھیں بھیڑ کے سمور کی طرح گھنی بھوؤں کے سائے میں جھلملاتی نظر آئیں۔ آنکھیں ٹھٹک کر رہ گئیں ـــــــ بڈھے کے ہونٹوں میں لرزش پیدا ہوئی "ارے تم ـــــ کیا نام ہے تمہارا بھلا سا ـــــ ارے تم ـــــ" روز کے بڈھے باپ کی گرجدار آواز گونجی۔

جاوید نے بڈھے کا ہاتھ پکڑا اور اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر اندر آگیا۔ چھوٹے سے گھر میں ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی تھی جہاں وہ آخری بار دیکھ کر گیا تھا۔ روز کا اسٹر بھی اپنی جگہ پر تھا چپلیں ایک طرف اوندھی پڑی تھیں۔ کوردار ململی ساری کرسی کی پشت پر بے ترتیبی سے لٹکی ہوئی تھی۔ میز پر کتابیں الٹی پلٹی نظر آئیں۔ جاوید یہ تبدیلی دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن اس نے ان چیزوں کی طرف سے نظریں ہٹا کر روز کے باپ کو دیکھا جو اب لیٹ گیا تھا اور چادر سے سر نکالے جاوید کو گھورے جا رہا تھا۔

"پرسوں روز کہہ رہی تھی کہ ـــــ تم شاید کلکتے آنے والے ہو۔"

"پرسوں ـــــ" جاوید نے کچھ حیرت سے پوچھا "جی ـــــ اس وقت کہاں ہے روز؟"

"پگلی نے ایک مرتی ہوئی ڈاکٹرنی کی ڈسپنسری میں کام شروع کیا ہے۔ اس ڈسپنسری کو اپنی ڈسپنسری سمجھتی ہے۔ بڈھی ڈاکٹرنی اسے خوب الو بنا رہی ہے مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ خیر چھوڑو۔ یہ تو میری روز کی پرانی عادت ہے ـــــ تم اپنی سناؤ۔"

بڑی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔

جاوید کو خیال آیا کہ شاید اس کے یہاں ٹھہرنے سے ان دونوں کو تکلیف ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چلے؟" بڈھے نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل......"

"ہوٹل؟ یہاں کوئی ہوٹل کھولنے آئے ہو؟"

"نہیں وہ ذرا......"

"چپ چاپ سوٹ کیس رکھو اور منہ ہاتھ دھو لو۔ میں بیمار ہوں۔ پھر بھی تم جیسے نالائق بیٹے کے لئے چائے ضرور بناؤں گا ....."

جاوید نے بہت روکا لیکن اس نے اٹھ کر اسٹوو پر چائے بنائی، مکھن، اور خستہ بسکٹ ایک پلیٹ میں رکھے اور کراہتا ہوا لیٹ گیا۔

"تم یہیں ٹھہرو گے۔ ورنہ روز میرا سر کھا جائے گی .... دیکھنا وہ کتنی بدل گئی ہے۔ .... تم تو جانتے ہو جنم کی بیوقوف لڑکی ہے ....."

"بدل گئی ہے؟" یہ آواز بار بار جاوید کے کانوں میں گونجتی رہی۔ "تم بھی بہت بدل گئے ہو۔ تم بیمار دکھتے ہو۔" بڈھے نے ڈانٹ ڈانٹ کر اس کو چائے پلائی۔ اس کے کپڑے بدلوائے اور کہا: "شرافت سے لیٹ جاؤ۔ وہ کوئی دو بجے آئے گی .... اور پھر اس کے دوست آ جائیں گے اور بالکل آرام نہیں ملے گا!"

جاوید لیٹ گیا ... "پھر اس کے دوست آئیں گے ....کون سے دوست؟" یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ سفر کی تھکن نے اسے بیہوش کر دیا۔ نیند میں اس کے دانت بجتے رہے اور وہ کچھ بڑبڑاتا رہا۔ بڈھا چونک کر اٹھتا اور اس کی طرف گھور کر دیکھتا "قصہ کیا ہے ...... یہ لڑکا اتنا بیمار کیوں ہے؟ کتنا پیلا ہو گیا ہے۔ سارے نوجوان پیلے پڑتے جا رہے ہیں۔ یہ کیسی بیماری ہے۔ کیسی ہوا چل رہی ہے ......؟" وہ لیٹ گیا۔

بڈھا بڑا عجیب و غریب کردار تھا ...... اب تو خیر بڑھاپا تھا۔ جوانی میں بھی وہ کم عجیب نہیں تھا۔ جوانی میں داڑھی رکھتا تھا۔ لیکن بڑھاپے میں داڑھی مونچھ دونوں صاف۔ جوانی میں رنگ کھلتا ہوا تھا مگر اب چہرہ جھلسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میٹرک پاس ہونے کے بعد جب

نوکری نہیں ملی تو اس نے ایک پادری سے میل جول بڑھایا اور مذہب بدل کر کرستان بن گیا داڑھی بڑھا کر بڑی پابندی سے گرجا جانے لگا۔ پادری کی سفارش نے کام کیا اور اسے ریلوے میں نوکری مل گئی ترقی کر کے گارڈ بن گیا لیکن رہا اپنی سنکی طبیعت کی وجہ سے مال گاڑی کا گارڈ۔ ایک بار اسٹیشن پر ایک سانولی اور بھولی بھالی لڑکی دل میں کھب کر رہ گئی۔ اس کے عشق کا اتنا بخار چڑھا کے وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا۔ لڑکی ایک بوڑھی استانی کی بیٹی تھی۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ لڑکی ماں کے گھر سے بھاگ آئی۔ روز کی ماں پوجا پاٹ کرتی لیکن اس کا باپ گرجا جاتا رہا۔ روز ابھی پانچ ہی برس کی تھی۔ اس کا باپ مال گاڑی لے کر دھنباد گیا ہوا تھا۔ بچی پڑوس میں کھیلنے چلی گئی تھی۔ ماں کی ساری میں چولھے سے آگ لگ گئی اور وہ آخر میں ہسپتال میں تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ روز کا باپ اپنی بیٹی کو لے کر اس مکان میں اٹھ آیا۔ یہیں اس نے روز کو پال پوس کر جوان کیا۔ نوکری کی میعاد ختم کر کے وہ سبکدوش ہونا چاہتا تھا گانے کا شوقین تھا اور کبھی کبھی صبح اٹھ کر ہارمونیم پر بھیروں گاتا تھا۔ جب وہ گاتا تو لگتا کہ رات بھر جل کر بجھتے ہوئے الاؤ سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ وہ مذہبی نہیں تھا اگرچہ گرجا اب بھی جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہنس کر خود ہی کہتا۔ "جوانی کی عادت بڑھاپے میں کب جاتی ہے۔"

لیکن روز اگر گرجا نہ جاتی تو بہت بکتا اور خود کشی کی دھمکی دیتا۔ ذرا موقع ملتے ہی فوراً کرستان صاحبوں کی ریاکاری، طمع، اور اینگلو انڈین دوغلی تہذیب پر ہزاروں لعنتوں کی بارش کر دیتا۔ اپنی میز پر بائبل بھی رکھتا اور گیتا بھی۔ روز کو وہ ایک انوکھی لڑکی سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی بیوقوف اور پاگل بھی......

کوئی تین بجے کے بعد دروازے پر بڑی ہلکی دستک ہوئی بڈھا جلدی سے چادر پھینک کر بھاگا۔ اسے ڈر تھا کہ دوبارہ دستک نہ ہو اور جاوید کی آنکھ نہ کھل جائے۔

روز نے اندر آتے ہی اپنے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیے اور پیشانی چھو کر دیکھی۔ بڈھے نے کانپتی ہوئی انگلی اپنے مسکراتے ہوئے خشک ہونٹوں پر رکھی اور اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ روز سفید ساری میں گندمی کم اور زرد زیادہ لگ رہی تھی۔ اس نے جاوید کے تھکے ہوئے زرد دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں کو معصوم مسکراہٹ سیراب کر گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی بڑی بڑی سیاہ اور روشن آنکھوں میں خوف کی لو جھلملا گئی۔ اس نے بڑھ کر کمرے کے درمیان میں دوڑ سے لٹکتا ہوا پردہ کھینچا تو

ایک کمرہ دو کمروں میں بدل گیا۔ اس کا بستر اور اس کی ساری چپلیں، میز کاغذ اور کتابیں سبھی کچھ پردے کے پیچھے چھپ گیا اور اس نے "باپ سے پوچھا" جاوید کب آیا؟"

"صبح، تجھے پوچھ رہا تھا۔ بیمار دکھتا ہے۔" بڈھے نے کہا اور کنکھیوں سے بیٹی کو دیکھنے لگا جس کے ہونٹ اور زیادہ بھنچ گئے تھے۔ اور آنکھیں اور زیادہ بڑی بڑی اور چمکدار نظر آرہی تھیں، اور ......

"ہاں بیمار معلوم ہوتا ہے۔ بابا لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہارا جی کیسا ہے؟ دوا پی تم نے؟"

"میری فکر نہ کر۔ اپنے مہمان کو دیکھ، اپنے بیمار کو ...." اس نے لفظ بیمار بڑی جھجک کے ساتھ پُراسرار لہجے میں کہا اور بھنکتا ہوا اپنے بستر پر لیٹا اور خراٹے لینے لگا۔

روز میز پر دونوں کہنیاں ٹیکے جھکی ہوئی تھی۔ گردن سے آکے لٹک رہا تھا اور خشک بال گالوں پر لٹک آئے تھے۔ اسے اپنے گال بہت گرم معلوم ہوئے، جاوید کتنا بدل گیا ہے۔ بیمار ہے،" اس نے سوچا اور منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں تولئے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی بڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اسے اپنے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ پر بڑی حیرت ہوئی وہ بے اختیار گنگنانے لگی ..... لیکن جیسے ہی پردے کے پیچھے سے پلنگ کے چیخنے کی آواز سنائی دی اس کا ترنم بند ہو گیا۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں اور وہ پردے کے باہر آگئی۔

جاوید آنکھیں کھولے ہوئے جالے میں لپٹے ہوئے بلب اور ایک چکراتی ہوئی مکھی کو دیکھ رہا تھا۔ روز سامنے آکر کھڑی ہوئی تو جاوید کی نگاہیں اس پر جمیں تو جمی رہ گئیں۔

"روز ....." وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اس نے روز سے ہاتھ ملایا تو روز نے آہستہ سے کہا "لیٹے رہو حرارت ہے تمہیں۔"

جاوید اسی طرح بیٹھا رہا۔ روز ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ باورچی خانے کی طرف چائے بنانے چلی گئی۔ وہ ٹھکتی ہوئی جا رہی تھی اور جاوید سوچ رہا تھا "روز ڈیڑھ سال میں کتنا بدل گئی ہے ..... اور زیادہ حسین اور من موہنی ہو گئی ہے۔" پہلے

بھی جب کبھی وہ اسے دیکھتا تھا تو اسے گرم رات کے بعد پو پھٹتے سمے ہوا کے خنک جھونکے کا احساس ہوتا تھا۔ "اور اب خنکی بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے!" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے سوچا۔

روز نے چائے نکالی اور اپنے بالوں کو جو اب کھل کر گھٹاؤں کی طرح امڈے چلے آرہے تھے ایک طرف شانوں پر جھٹکتے ہوئے ہنس کر کہا: "تو تم آہی گئے!"

"یقین نہیں آتا؟"

"اوں ہوں!" روز نے اسے شرارت سے دیکھا۔ مسکرائی اور بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولی "کتنے دن کی چھٹی ملی؟"

"سات دن کی۔ وہ بھی بہت مشکل سے!"

"بس!" جاوید اس کی آنکھوں میں ڈوب گیا۔ اس "بس" نے اس کے کانوں میں شہد کے قطرے ٹپکا دیئے۔ اس "بس" پر تو نہ جانے کتنی بار اس کی روح کا ایک ایک تار جھنجھنا اٹھا تھا۔

"کیوں سات دن بہت کم ہیں؟"

"ڈیڑھ برس بعد صرف سات دن!" روز نے جاوید کی پیاسی نظروں سے کتراتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جاوید چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے" پھر اٹھتے ہوئے بولی "آؤ پردے کے پیچھے میرے شاندار محل میں آجاؤ۔ یہاں بابا کو نیند آگئی ہے۔ بیچارے اب بہت بیمار رہتے ہیں۔"

دونوں اپنی اپنی پیالی لے کر پردے کے پیچھے چلے گئے۔

باتوں کی گاڑی کسی طرح آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ تب روز نے آہستہ سے کہا "کیا اب بالکل ٹھنڈی چائے پیتے ہو؟"

جاوید نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

"اچھا بتاؤ تم بیمار کیوں پڑ گئے مسٹر۔ کس نے کہا تھا تم سے؟"

"میں بیمار بالکل نہیں ہوں۔ تم باپ بیٹی نے تو بیکار ....." وہ واقعی بالکل شگفتہ اور تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

جاوید گاؤں کے تجربوں کا حال بتانے لگا اور ایک بار زبان چلی تو پھر رُکی نہیں، جیسے خاموشی سے ڈرتا ہو۔ اس نے نہ اس پوری کہانی میں دربار کا ذکر کیا نہ حویلی کا بس کسانوں کی محبت اور دکھ درد، خون پسینہ ایک کرنے اور بھوک اور بیماری سے مرنے کا قصہ سُنایا۔ البتہ پرمیشر سنگھ اور کرن سنگھ کے بارے میں سرسری طور پر دو تین جملے کہے ......"کرن سنگھ تو بھیڑیا ہے!" جاوید کی باتوں کا سوتا خشک ہوا تو روز نے میز تھپتھپاتے ہوئے کہا "دوست تم بہت بدل گئے ہو۔ اب تو خدا تمہیں بری نظر سے بچائے، خوب دھڑلے سے بولنے لگے ہو ...... بالکل پہاڑی چشمہ!" وہ ہنسی اور جاوید کو لگا کہ وہ دور افتادہ جنگل اور پہاڑوں میں پہنچ گیا ہے۔ لو چل رہی ہے وہ درختوں کے سائے میں ایک پہاڑی چشمے کے کنارے چل رہا ہے ... کہیں دور آم کے پیڑ پر کوئل کوک رہی ہے۔ وہ کچھ کھو سا گیا۔ اس کی آنکھیں روز کی پیشانی اور آنکھوں کو چومتی رہیں۔ روز گھبرا گھبرا اٹھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ بڈھے نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک بھاری آواز سُنائی دی "کیا روز نہیں آئی اب تک؟"

یہ آواز ... جاوید سپنوں کے جگ سے نکل آیا ... "کس کی آواز ہے یہ۔ یہ آواز تو جانی پہچانی ہے!" اس نے روز کو دیکھا۔

"تم جانتے ہو یہ کون ہیں؟" روز نے کچھ چونکتے ہوئے پوچھا۔ جاوید کو روز کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"آواز تو پہچان رہا ہوں۔"

جیوتی پردہ ہٹا کر اندر آگیا۔ جاوید اور جیوتی دونوں ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے "ارے تم جیوتی۔ تم تو میرے مریض سلیم ہو"

"اوہ میرا ڈاکٹر ... " دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ جاوید کے مریض کی صحت بہت بہتر معلوم ہو رہی تھی۔

"بھئی مجھے تو دور دور خیال نہیں تھا کہ اپنے پُر اسرار مریض سے دوبارہ ملوں گا ..... رگھو نے کبھی کچھ بتایا ہی نہیں ......"

"کیا تم مجھے ڈاکو سمجھے تھے ......" جیوتی مسکرایا تو اس کا پورا چہرہ آئینے کی طرح چمک اٹھا۔ لیکن چند منٹ بعد ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس نے کچھ سوچتے ہوئے روز کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور انگلیاں پلو سے اس طرح کھیل رہی تھیں جیسے وہ بھیگا ہوا کپڑا نچوڑ رہی ہو۔

جاوید نے بھی روز کی طرف نظر اٹھائی۔ "روز کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ یہی زردی اس نے کئی بار سکینہ کے چہرے پر دیکھی تھی۔ لیکن روز کے چہرے پر زیادہ تھکن تھی۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ پردہ اٹھا کر دوسری طرف چلا گیا۔ تکیے کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ پھر پردے کی طرف بڑھا لیکن پردے کے پیچھے سے سرگوشی کی آواز سن کر اس کے قدم رک گئے دل سے ایک بھاپ سی اٹھی اور گلے میں پہنچ کر کانچ کے ذروں کی طرح چبھنے لگی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا ..... غسلخانے میں جا کر کپڑے بدلے اور دروازے کی طرف بڑھا۔ بڈھا اٹھ بیٹھا: "کہاں چل دیئے لاٹ صاحب؟"

"ذرا سڑک تک ..... ایک دوا خرید لوں ....."

جاوید نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے سگریٹ نکال کر بڈھے کی طرف بڑھائی اور خود بھی ایک سگریٹ جلائی۔ پردے کے پیچھے سے دبی دبی آواز میں جلدی جلدی بات کرنے کی آواز رہی تھی۔ اس نے زور سے کش کھینچا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ زینے سے اتر رہا تھا تو دو مشتبہ نوجوان زینے پر چڑھتے نظر آئے۔ "کون لوگ ہیں یہ؟ کیا قصہ ہے؟" جاوید تیزی سے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

کلکتہ میدان کے چاروں طرف چوڑی چکلی سڑکوں پر گھومتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک اجنبی جزیرے میں گھوم رہا ہے۔ لوگ، عمارتیں، چورنگی کی روشنیاں، مہکتے ہوئے سفید گجرے اور گجروں سے بھی زیادہ سفید کرتے اور دھوتیاں، خوانچے والے، عورتیں، بچے ..... بل کھاتی ہوئی ساریاں، ہنستے ہوئے چہرے... سبھی اجنبی انجانا لگا۔ وہ چلتے چلتے تھک کر چور ہو گیا۔ ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ خضر پور کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر درخت جھومنے لگے۔ چاند نکل آیا اور وکٹوریہ میموریل دور سے مرمریں مزار لگنے لگا جب

اس نے فٹن لیا۔ اور کولوٹولہ کے نکڑ پر اتر گیا۔ اس کا ایک ایک قدم نو نو من کا ہو گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے زینے پر چڑھا "میں نے غلطی کی۔ کسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ میں گدھا ہوں۔ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔۔۔ مجھے!" اس نے سوچا اور آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

بڈھے نے دروازہ کھولا۔ جاوید کو دیکھ کر مسکرایا اور کھانسنے لگا۔ جاوید کو لگا کہ اسکی کھانسی پہریدار کا سگنل تھی۔ اسے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ پردے کے پیچھے خاموشی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک سگریٹ پیتا رہا "کھانا کھالو!" بڈھے نے اس سے کہا۔

"نہیں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ بھوک نہیں ہے!"

بڈھے نے آنکھیں میچ لیں "اچھا لاؤ سگریٹ لاؤ!"

جاوید نے ڈبیہ بڑھا دی اور اسی طرح پتلون اور قمیص پہنے ہوئے لیٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں گرم گرم ریت چبھنے لگی۔ "کیا کرنا چاہیے؟ میں کتنا بے وقوف ہوں؟" اس کا بس چلتا تو اس وقت خود کو کسی درخت سے باندھ کر اپنے گھوڑے کے چابک سے اتنا مارتا، اتنا مارتا۔۔۔۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔ بڈھے نے سر جھٹکا۔ "یہ بچے بدنصیب اور بیوقوف بچے۔۔۔۔"

اس نے گیتا اٹھالی اور پڑھنے لگا، گیتا رکھ کر بائبل اٹھائی پھر بائبل بھی رکھ دی۔ شیشی سے دوا پی اور کڑوا سا منہ بنا کر لیٹ گیا۔

سونے میں جاوید کو محسوس ہوا کہ پردے کے پیچھے سے بہت سے جنگلی کبوتر اڑے اور پر پھڑپھڑاتے ہوئے کہیں دور نکل گئے۔۔۔۔ پھر سرگوشی کی آواز صاف ہونے لگی۔۔۔۔۔ اس کے کانوں میں بارود۔۔۔۔۔ بم، پستول، چٹا گانگ، لاہور، بھگت سنگھ۔۔۔۔ لڑکیاں لڑکے۔۔۔۔ ریل گاڑی۔۔۔۔ جیسے مبہم لفظ ابھرے اور کہیں کھو گئے۔ پھر ایک بار کبوتر پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑے اور ان دیکھے افق کی طرف غائب ہو گئے۔

روز کے دوست چلے گئے اس نے قریب آکر جاوید کو دیکھا جس کے ہونٹ نیند میں کچھ کہتے ہوئے معلوم ہوئے۔ بڈھے کا پلنگ خالی تھا۔ اس نے جاوید کی پیشانی چھوئی۔۔۔ پیشانی جل رہی تھی۔ پھر روز نے جاوید کے جوتے اتارے اور اسے چادر اڑھا دی۔ وہ سر جھکائے وہاں سے ہٹ رہی تھی کہ اس کے کانوں نے صاف سنا۔۔۔۔۔ روز۔۔۔۔ روز۔۔۔۔۔

وہ کون ہے ...... اس سے محبت کرتی ہو تم؟ اچھا میں خودکشی کر لوں گا ... !" روز نے پھر اپنے باپ کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ پلنگ اب تک خالی تھا۔ وہ جاوید کے پلنگ پر جھکی اور بڑبڑاتے ہوئے دوست کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ جاوید اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے کسی بھیانک خواب سے چونکا ہو۔ "ایں؟" اس نے گھبرا کر روز سے پوچھا۔

روز کی آنکھوں میں ایسا رحم اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا ...... جاوید نے سوچا: "شکریہ!"

"اب سو جاؤ!" روز نے عجیب نظر سے اسے دیکھا اور سیاہ بالوں کو سمیٹتے ہوئے پردے کے پیچھے چلی گئی۔ "گڈ نائٹ!"

تین دن اسی دھوپ چھاؤں میں کٹ گئے۔ جس طرح دھوپ سے چھاؤں بھاگتی ہے اسی طرح روز اس سے کتراتی رہی۔ وہ ایک گھنٹہ بھی اس کے ساتھ اکیلے نہ بتا سکا اس کو ہر وقت حرارت رہنے لگی، اس کے منہ کا مزا خراب ہو گیا۔ لگتا کوئی نیم جیسی کڑوی چیز اس کی زبان پر تیر رہی ہے۔ بڈھا بھی اور زیادہ نڈھال، اور خاموش ہو گیا۔ روز صبح سویرے نکل جاتی اور شام تک لوٹتی۔ جاوید کو محسوس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر دیر سے آتی ہے۔ وہ آتی، اس سے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرتی اور پھر اس کے دو تین اجنبی بپھرے ہوئے، پُراسرار دوست آ جاتے جو دیکھنے میں فاقہ زدہ نظر آتے۔ پردے کے پیچھے ان کی باتیں ہمیشہ سرگوشی میں ہوتیں۔ "یہ لوگ کیسی سازش کر رہے ہیں!" وہ سوچتا ...... چیانگ کائی شیک ... انگریز ..... بم ..... بندوق ..... ایک بار اس نے صاف سنا ..... روز کہہ رہی تھی ..... نہیں نہیں میرے دوست پر پورا بھروسہ کر سکتے ہو۔ چند دن کو آیا ہے ..... چلا جائے گا۔

اسی شام روز ذرا جلدی آ گئی۔ جاوید پہلے ہی سے کپڑے پہنے بیٹھا تھا بڈھا ڈنڈے کے سہارے اتر کر کہیں چلا گیا تھا۔

جاوید نے اپنے گرم ہاتھوں سے روز کا ہاتھ پکڑ لیا "میری سمجھ میں نہیں آتا ..." جاوید کی آواز روز کو بہت عجیب لگی۔ وہ کچھ ڈر گئی۔ آہستہ سے جاوید کے ہاتھ سے ہاتھ نکالتے ہوئے بولی: "ناراض ہو۔ تم میرے یہاں مہمان آئے ہو اور میں بیٹھ کر بات چیت بھی نہ کر سکی۔

میں خود چاہتی تھی کہ ..... " اس نے ٹائم پیس کی طرف دیکھا " اچھا چلو آج ذرا ٹہل آئیں۔ تمہارا جی بہل جائے گا!"

"اور تمہارا؟" جاوید نے اکڑ کر پوچھا۔

"میرا؟ تم خود جانتے ہو۔ اس طرح بگڑے تیور سے مت دیکھو!"

سورج ڈوب چکا تھا۔ ہر طرف سے روشنیوں کے ستارے ہگلی کی لہروں میں ٹوٹ رہے تھے اور بہہ رہے تھے۔ روز اور جاوید کی کشتی ان ہی ستاروں میں تیر رہی تھی ..... ملاح بڑی درد بھری آواز میں طوفان کا گیت گا رہا تھا .... "ما نجھی نیا چلی منجدھار ...."

"تو تم اپنے گاؤں میں خوش ہو ...... " روز نے شاید کچھ کہنے کی خاطر یہ سوال کیا تھا۔

"روز تم کس خوشی کا ذکر کر رہی ہو ...... نہیں، میں خوش نہیں ہوں!"

روز کی لمبی لمبی انگلیاں پانی میں تیرتی ہوئی روشنی کی کرنوں کی طرح کانپنے لگیں۔ جیسے یہ بات چھیڑ کر پچھتا رہی ہو۔ جاوید کے دل پر کوئی گھونسے مار رہا تھا۔ کسی نے جاوید کے کان میں کہا، "تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں ہو؟ جس پودے کو پالا مار گیا ہو اس میں پانی ڈالنا بے کار ہے! بیکار ہی یہاں آئے۔ یہ لڑکی تمہارے پہلو میں بیٹھی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر دیکھ لو۔ معلوم ہو جائے گا۔ وہ تم سے بہت دور ہے اس ستارے سے بھی دور جو اندھیرے افق پر لٹک رہا ہے.. روشنی کے مینار سے بھی زیادہ چمکدار جو ملاح کے چپو سے کٹ کر بھی اسی طرح جگمگاتا رہتا ہے ....."

ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ چودھویں کی رات تھی۔ چاند کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا کبھی نکل آتا تھا۔ دہکتی ہوئی آگ اور کبھی بجھتی ہوئی چاندنی میں روز کی آنکھیں بھی کبھی بہت اداس لگ رہی تھیں، کبھی بے حد بے قرار۔

جاوید نے روز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر تک روز کا ہاتھ نو گرفتار پرندے کی طرح تھرتھرایا پھر پرندہ خاموش ہو کر سمٹ سا گیا۔

"جاوید تم بیمار ہو، بہت بیمار یہیں رہ کر علاج کراؤ ..... میں ڈرتی ہوں ....."

جاوید ٹھیک اسی وقت روز سے چاندنی کے جادو کا، آنکھوں میں تڑپتے ہوئے پارے

کا اور ہواؤں کے سنگیت کا ذکر کرنے والا تھا لیکن روز کے لہجے اور آواز کی ترس کھاتی ہوئی ملائمت نے اسے چونکا دیا۔ وہ چٹان جو اس کے دل پر سے سرکنے والی تھی وہیں دوبارہ جم گئی۔ اس نے ایک بار زور سے روز کا ہاتھ دبایا اور تیزی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب اس کی آنکھوں میں نہ چاندنی تھی نہ ستارے اور نہ روشنیوں کے بگڑتے اور بنتے ہوئے مینار؛

اس نے زور سے ٹھنڈی سانس لی: "میں سچ مچ یتیم ہوں!"

"کیا؟" روز نے کہا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جاوید کا ہاتھ اور زیادہ گرم محسوس ہوا۔ "جاوید میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے جیوتی کا علاج اتنی محبت سے کیا۔"

"اچھا!" جاوید نے زور سے ہاتھ کھینچ لیا۔ "تمہاری سادگی پر حیران ہوں ... اس کا شکریہ تم کیوں ادا کر رہی ہو۔ اس وقت تو وہ میرے لئے اجنبی تھا اور شاید اب بھی ....."

روز تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "شاید اب بھی .... تم اس کو نہیں جانتے وہ بہت بڑا انسان ہے!"

جاوید نے سوچا بڑا انسان کیا ہوتا ہے۔ کوئی نقشہ بنا نہ کوئی تصویر ابھری۔ البتہ اتنا اندازہ ہو گیا کہ وہ جن آنکھوں میں روشنی کو جھلملاتے دیکھ رہا تھا ان میں وہی بڑا انسان بسا ہوا تھا۔

"میں تو چھوٹا انسان ہوں ....."

روز خاموش ہو گئی یکایک ہنسی اور بولی "آؤ یہاں اتر جائیں ناؤ سے ....."

"کس ناؤ سے؟"

"اس ناؤ سے اور کس ناؤ سے!"

"یہاں تو ڈوب جائیں گے۔ تم تو جانتی ہو یہاں دریا کتنا گہرا ہے؟"

"جانتی ہوں لیکن چلو اب تو ناؤ کنارے لگنے والی ہے ....."

"ڈوبنے والے تو کنارے پر بھی ڈوب جاتے ہیں۔ میں نے ایسی لہر دیکھی ہے جو ڈوبنے والے کو کنارے پر بھی ڈبو دیتی ہے!" جاوید نے کشتی سے اترتے ہوئے روز کو سہارا

دیا اور جاوید نے روز کے ہونٹوں کو دوہراتے ہوئے سُنا! "۔۔۔۔۔ لہر۔۔۔۔۔"

چند قدم چلنے کے بعد دونوں ایک چھوٹے سے سنسان پارک میں بیٹھ گئے۔ جب ہوا میں آندھی کی سنسناہٹ پیدا ہو گئی تو روز نے پوچھا" تم۔ اب گھر جاؤ گے ؟"

"اور تم؟"

"میں ۔۔۔۔ مجھے کہیں اور جانا ہے۔"

"جاؤ۔ میں گھر چلا جاؤں گا۔ تم کہیں اور چلی جاؤ۔ کتنی امیدوں کے ساتھ کلکتے آیا تھا!" جاوید کو اپنی بے اختیار بات پر غصہ آ گیا۔ وہ انگلیاں چٹخانے لگا۔ روز تھوڑی دیر سر جھکائے کھڑی رہی۔ "اچھا جاؤ۔ میں آج رات کو سب کچھ بتا دوں گی ۔۔۔ ٹھیک!"

وہ سخت الجھن میں تھی۔ کیسے بتا دیتی کہ جیوتی کو الوداع کہنے جا رہی ہے۔ جو غیر قانونی ہتھیار لے کر جا رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ پارک سے باہر چلی گئی۔ "لو مسرت آئی اور چلی گئی" کسی نے جاوید کے کان میں کہا۔ روز کے قدموں کی آہٹ دور ہوتی چلی گئی "مسرت، مسرت، فریب!" اس نے گرم گرم سا پانی رگوں میں دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ کسی کی دہکتی ہوئی انگلیوں نے اس کی آنکھیں زبردستی بند کر دیں ۔۔۔ سنکی ہوئی ہوائیں، پتوں کی آواز، چاندنی میں لہراتا ہوا آنچل، جھلملاتی ہوئی آنکھیں، آنکھوں کا نشہ بانہوں کی دھنک، لہراتی ہوئی، ٹوٹتی ہوئی ۔۔۔۔ روشنیوں کے مینار ۔۔۔ ملاح کا گیت ۔۔۔ سب جھوٹ ہے! وہ تیزی سے اٹھا، بھاگتے ہوئے فٹن کو روک کر اس میں بیٹھا اور ہانپتے ہوئے چیخا "ہوڑہ اسٹیشن" اسے سوٹکیس لینے اور روز کے سنکی باپ کو خدا حافظ کہنے کا خیال آیا۔ لیکن اس نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر گویا اس خیال کو زبردستی ایک طرف ہٹا دیا۔ "بھئی جلدی چلو گاڑی ۔۔۔۔" یہ لمحہ جاوید کی زندگی کا سب سے کمزور لمحہ تھا اور وہ اس لمحے سے بغاوت پر تلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور ہونٹ دانتوں تلے بھینچے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے سے آنچ نکل رہی تھی۔

وہ ٹکٹ لے کر بھاگتا ہوا سیدھا پلیٹ فارم پر پہنچا اور لپک کر ایک ڈبے میں گھس گیا گاڑی کھسکنے لگی اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی روح جسم کو چھوڑ رہی ہے۔ اس کا پورا دھڑ

دروازے سے باہر لٹکا ہوا تھا پلیٹ فارم کی دوسری طرف ایک اور گاڑی کھڑی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے اس کو ایک مانوس پیکر نظر آیا۔ بل کھاتا ہوا پیکر گھٹاؤں کی طرح اڈے ہوئے بال۔ وہ گاڑی بھی کھسکنے لگی۔ اس کا ہاتھ بھی الوداع کے لئے اٹھ گیا۔ دوسری گاڑی کے دروازے میں جیوتی کا بکھرا ہیولا ایک پرچھائیں کی طرح گزرتا نظر آیا۔ جاوید کا ہاتھ بے ساختہ ہوا میں اٹھ گیا اور اس وقت تک اٹھا رہا جب تک کہ گاڑی اسٹیشن سے دور نکل آئی۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: "دروازہ بند کر دو آندھی ہے ..... اس طرح لٹکنا خطرناک ہے!" جاوید دروازے سے ہٹ گیا اس کے شانے پر ایک اجنبی بڈھے مسافر کا ہاتھ تھا۔ جاوید کا سر اس کے شانے پر گر گیا اور ڈبڈبائی ہوئی سرخ آنکھیں چھلک پڑیں۔

"ارے یہ تو بخار میں پھنک رہا ہے" مسافر نے اسے اپنی جگہ لٹا دیا اور اس کے ماتھے کو سہلانے لگا۔ ایک عورت کی آواز گونجی: "بیچارا جوان آدمی ہے! ٹھنڈے پانی کا چھینٹا دو منہ پر!" جاوید آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ بار بار اس کے کانوں میں گونجتا رہا "بیچارا جوان!" "رحم! رحم ہر رحم! اس کے سوا اور کچھ نہیں کسی کے پاس۔

یکایک یہ ساری آوازیں مٹ گئیں اور اسے سرگوشی کی آواز سُنائی دی .....

..... کھڑکی سی چھنتی ہوئی روشنیوں ..... سرکنڈے کے سنہرے پروں میں لرزتی ہوئی، سوگ میں ڈوبی ہوئی بیمار اور خاموش روشنیوں ..... میں تم سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ لیکن تمہیں کیا پرواہ۔ میں اپنی محبت کی قبر تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ پھوارو اور روشنیوں تمہارے سوا اور کوئی اس اُجڑی ہوئی قبر پر آنسو بہانے نہیں آئے گا.....

پھر یہ آواز بھی مٹ گئی اور وہ خواب میں ایک ایسے درخت کا جلا ہوا ٹھنٹھ دیکھ کر ڈرتا رہا جس پر بھری بہار میں بجلی گر گئی تھی۔

برسات گرج برس کر گزر چکی تھی۔ اور اب گلابی سردی کا کلیجہ بھی تیز اور کٹیلی پچھیا کے تیروں سے چھلنی ہونے لگا تھا۔ ان چند مہینوں میں اس جنگلی وادی میں سورج اسی طرح نکلتا اور ڈوبتا رہا تھا۔ برسات کی جل تھل کے بعد آہر اور پوکھر، ندی اور جنگل میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی اور ہوا کبھی کبھی سبک خرامی سے اور کبھی پورے جنون سے، جھنڈ والے درختوں میں ناچتی اور چیختی رہتی تھی ...... لیکن ڈھلان میں دوڑتی ہوئی اٹھلاتی، شکری ندی اور جنگل، سدابہار درختوں اور نکلتے ڈوبتے چاند سورج، شام اور صبح کے دھندلکوں میں گھلتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز اور بانسری کی تان کے علاوہ اور شفق کے پھولوں کے علاوہ بھی تو اس وادی میں بہت کچھ تھا۔ وادی کبھی دھڑکتی گرجتی اور کبھی خاموش ہو جاتی۔

رئیس عبدالجبار کی بچھائی ہوئی شطرنج کی بساط کا رنگ بدل گیا تھا۔ اس کے مہرے پٹ رہے تھے اور اسے بار بار شہ پڑ رہی تھی۔ اسے دن میں تارے نظر آنے لگے تھے۔ موٹا تو شاید پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہو گیا تھا لیکن اب چہرے پر چھائی ہوئی کاہلی کی جگہ ایک چونکے ہوئے بھوکے بھیڑیئے کی سی چستی اور عیاری پیدا ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد جھریوں کے حلقے اور زیادہ گہرے اور سخت ہو گئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے سب کچھ لٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ انتہائی چڑچڑا اور بھیانک ہو گیا تھا۔ ایک بار تو کرن سنگھ پر صندل کی چھڑی لے کر ٹوٹ پڑا۔ ہوش آیا بھی تو اس وقت جب کرن سنگھ بلی جیسی آنکھیں میچ کر کہہ رہا تھا سرکار کا دماغ خراب ہو

رہا ہے۔ "میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ سنبھلیے سرکار، سنبھلیے ورنہ سودا بہت مہنگا پڑے گا۔" سرکار نے اپنی صندل کی چھڑی غصے میں کھڑکی سے باہر پھینک دی جو ولایتی کتوں کے سامنے سیمنٹ کی کرسی پر گر کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ "بس بس بکواس مت حرامخور، دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" کرن سنگھ نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ سرکار عبدالجبار کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی رات کے سناٹے میں مسہری پر لیٹتا تو باپ زہریلی مسکراہٹ بکھیرتا نظر آتا، تب اسے اپنا انجام بڑا بھیانک معلوم ہوتا۔ اس کا سر پھٹنے لگتا۔ اس کی حالت اس خونی کی سی ہو جاتی جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ وہ ململ کے کرتے کا گریبان چاک کر دیتا اور اس کے سیاہ سینے سے کالے بال جھانکنے لگتے۔ ڈپٹی نصیرالدین نے اس کو ایسا چرکا دیا تھا کہ اس کی ناؤ بیچ منجدھار میں ڈوب گئی تھی اور وہ چیخ بھی نہ سکا تھا۔ سکینہ بیاہ کر گئی تو چھ مہینے تک وہیں گرفتار رہی۔ فخرالدین نے خط میں گالیوں کے سوا اور کچھ نہ لکھا۔ ایک دن جب وہ ڈپٹی نصیرالدین کو محبت پیار اور چاپلوسی بھرا خط بڑی محنت سے لکھ رہا تھا تو اچانک سکینہ کی ڈولی ڈپٹی نصیرالدین کے گھریلو ملازم کے ساتھ حویلی کے دروازے پر آ گئی۔ اس نے خط پھاڑ دیا اور فوراً حویلی میں گیا۔ ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھا بہن کے زرد چہرے، سوجی ہوئی آنکھوں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھتا رہا۔ اٹھتے ہوئے بہن کا سر سینے سے لگایا۔ اس کی مانگ کو چوما جس پر نہ افشاں تھی نہ سیندور اور بڑبڑاتا ہوا حویلی کی تاریکی سے نکل آیا۔ ڈپٹی نصیرالدین کا ملازم شہری شان سے ملازموں کے جھرمٹ میں بیٹھا خاموش فلم "جان عالم" کا قصہ سنا رہا تھا۔ عبدالجبار نے سمدھیانے کے گستاخ ملازم کو صحن میں بندھوا کر پچاس جوتے لگوائے اور کہا۔ "اپنے مالک سے کہہ دینا اگر کبھی ادھر کا رُخ کیا تو اسی طرح جوتوں سے خبر لی جائے گی۔" ملازم اپنے شہری کپڑوں پر سے جوتوں کی گرد جھاڑتے ہوئے اٹھا اور آنکھیں جھکائے ہوئے ان دیہاتی ملازموں کے درمیان سے گزر گیا جو چند منٹ پہلے تک اسے لارڈ صاحب سمجھ رہے تھے۔

ڈپٹی نصیرالدین نے خاموشی سے عبدالجبار کے رقیب چیرمین سے معاملہ کر لیا تھا۔ اسٹیشن سے تھوڑی دور ایک بڑے سے تختے پر کئی خیمے لگ گئے تھے۔ بیلداروں نے زمین

کھود کر مٹی کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ بیل گاڑیوں سے ریت گرائی جا رہی تھی۔ اور بیلدارنیں سانچوں میں مٹی بھر بھر کر اینٹ اور کھپرے بنا رہی تھیں ...... اکثر شام کو اس تختے سے گیت کی کوئی غمگین لے پھوٹتی اور سنکی ہوئی ہواؤں میں تیرتی ہوئی دربار کی دیواروں سے جا ٹکراتی۔

دھرتی میں سورج کی کرنیں
اور اپنا پسینہ منھ کر ،
بنا رہے ہیں راج محل ہم ـ
بنا رہے ہیں راج محل !
سونے کی پریاں ناچیں گی اس میں ـ
بادل کے رتھ سے اکاش میں اترے گی
راج کماری سندر ایک ـــ
ہاں راج کماری سندر ایک !
روپ نگر کا بانکا راجہ
بوہ کے اس کو تھامے گا !
تب دونوں کنوادیں گے ہاتھ ہمارے ـ
بہے گی ہمرے کھون کی ندی
دھرتی اس میں ڈوبے گی ـ
چھا جائے گا اندھیارا چاروں اور !

کبھی کبھی اس گیت کی لے حویلی کے پچھواڑے والی آسیبی چھت تک پہنچتی۔ شام ہر طرف اداسی پھیلا دیتی، افق پر دھواں اٹھتا، سارس، بگلے اور مرغابیاں سنسناتی ہوئی کسی تالاب یا جھیل کی طرف اڑتی ہوئی چلی جاتیں اور ہوا کے قدم تھمنے لگتے تب ایک انجانے گیت کی لٹکتی ہوئی، درد میں ڈوبی ہوئی لے بازو پھیلا کر سکینہ کو پکارتی اور وہ کمزور قدموں سے زینے پر چڑھتی اور اپنے پرانے ساتھی برگد کے سائے میں بیٹھ جاتی۔ اس کے زرد چہرے پر ایک

لمحے کو چمک پیدا ہوتی جیسے کسی نے بجھتے ہوئے الاؤ کو کرید دیا ہو۔ وہ دور جنگل کے پیچھے بجھتی ہوئی آگ کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا دیتی ...... "اپنی گود میں چھپا لے مجھے بھی ...... یوں نہ جا سیرے بن۔ نہ جا۔ نہ جا۔" اس کے پیٹ میں کوئی چیز پر پھڑ پھڑاتی۔ بہت ہی ننھی منی چڑیا جسے اپنے پروں کی قوت پرواز پر بھروسہ نہ ہو۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتی اور ہونٹ دانتوں تلے دبا لیتی جیسے اس کے پیٹ میں چڑیا نہ ہو، بچھو ہو اور کھٹا کھٹ ڈنک مار رہا ہو..... وقت کس تیزی سے پرواز کرتا ہے، ہر شام اس کی زندگی میں ہزاروں زخم خون اگلنے لگتے۔ فخرالدین کا خباثت بھرا چہرہ زبردستی اس کی آنکھوں میں ابھرتا اور کچھوے کی طرح اس کی نگاہوں میں رینگنے لگتا۔ وہ بے بس ہو کر دونوں ہتھیلیوں سے منہ چھپا لیتی۔ شام کا جھٹپٹا گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو جاتا..... اس کی آنکھیں ایک عالیشان بند مکان کی کھڑکیوں سے دیکھتیں ...... کان میں کام کرنے والے مرد عورتیں زخمی بیلوں کی طرح آہستہ آہستہ کھان سے لوٹ رہے ہیں..... کوئی ہنستا نہیں، کوئی روتا نہیں..... سب خاموش ہیں۔ دن بھر کی یہ تھکن دارو کے ابال میں جھونک دی جائے گی ...... اور پھر رات ...... رات اور ..... پہاڑ غائب ہو گئے ہیں۔ فیکٹری کی چمنیوں سے شعلوں کے رنگ کا دھواں آسمان کی طرف اڑ رہا ہے اور اندھیرے کو چاٹ رہا ہے۔ شعلے ایک خوبصورت لڑکی کی طرف لپکتے ہیں اور اس کی دوشیزگی کو اس کی روح کو جو کبھی چنبیلی اور جوہی کے ادھ کھلے پھول کی طرح مہکتی تھی۔ اپنی آغوش میں چھپا لیتے ہیں..... دانت نکال دیتا ولایتی شراب کے نشے میں دھت ایک بھیڑیا جو کسی رنڈی کی آغوش گرم کر کے آ رہا ہے۔ وہ دانت نکوستا ہے اس لڑکی کو گھن آ رہی ہے۔ لیکن بھاگ کر جائے تو جائے کہاں..... بھیڑیا تو اس کا جنم مرن کا ساتھی ہے ..... لو وہ کس طرح گھور رہا ہے۔ اس کے ہاتھ کس طرح بڑھ رہے ہیں..... اف فخرالدین کے ہاتھ میں کتنی طاقت ہے۔ کیسا گھونسا مارا ہے اس نے پیٹ پر..... "میں اس حرامی اولاد کے ساتھ تجھے بھی قبر میں سلا دوں گا۔ آخر تو اپنے یار ڈاکٹر کے ساتھ بھاگ کیوں نہیں گئی...... میں تجھے طلاق بھی نہ دوں گا میں گھونسے مار مار کر تجھے بانجھ بنا دوں گا۔ دیکھتا ہوں تیرا کمینہ بھائی کیا کرتا ہے....."

اپنی حویلی کی چھت پر بھی اسے یہ آواز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اچانک بہت سے بھوت اندھیرے میں اسے گھیر لیتے اور پاگلوں کی طرح چیختے۔ اس کا جی چاہتا کہ ان بھوتوں کے ساتھ ناچے ...... اتنا ناچے، اتنا چیخے کہ کلیجہ پھٹ جائے۔

ایک شام تو بھوتوں کے اس ناچ سے وہ کچھ ایسا ڈری کہ اپنے ساتھی برگد کے پیڑ کو چھوڑ کر بھاگی۔ زینے پر اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ لڑھکی اور جیسے تیسے گھسٹتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر اوندھی پڑ گئی۔ ایک بپھری ہوئی بلی تیز پنجوں سے اس کے پیٹ کو نوچ رہی تھی .....

بڑی بی لالٹین لے کر دوڑیں۔ سکینہ کا زرد چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں اور ابھرے ہوئے پیٹ پر دھرے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا تو سینہ پیٹنے لگیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی۔ ڈاکٹر جاوید حویلی کے خاموش سایوں کے درمیان چلتا ہوا، سکینہ کے سسرال سے واپس آنے کے بعد پہلی بار، پچھواڑے والے چھوٹے آنگن کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور دل بیٹھ رہا تھا۔ صبح ہوتے، جب آخری ستارے بجھ رہے تھے تو سکینہ نے ایک ساتھ ماسو بچے کو جنم دیا۔ دروازے اور کھڑکی سے چھنتی ہوئی صبح کی روشنی میں جاوید نے آخری بار مریضہ کو دیکھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن جب اس نے آنکھیں کھولیں، ہونٹ بھینچ کر مسکرائی اور ٹھنڈی سانس لی تو جاوید کا دل دھک سے ہو گیا۔ سکینہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ اس نے منہ تکیے میں چھپا لیا۔ سکینہ کے کانوں میں ایک بچے کی پہلی چیخ اب تک گونج رہی تھی .... اسے علم تھا کہ وہ یہ آواز پھر کبھی نہیں سن سکے گی، کیونکہ یہ ایک ننھے مسافر کا اس دنیا کے خلاف پہلا اور آخری احتجاج تھا۔ اس کو بڑی بی کی بات یاد تھی: "بچہ جب پیٹ کے اندھیرے سے اُجالے میں آتا ہے تو روشنی سے ڈر کر چیختا ہے۔" سکینہ نے زور سے کہا ...... "نہیں یہ نہیں ہو سکتا ....." "اس کا پیٹ تو نور کا سرچشمہ ہے۔ وہاں اندھیرا کہاں، اندھیرا تو باہر ہے" "میرا بچہ تو اس دنیا کے اندھیرے سے ڈر کر چیخا ہوگا۔ وہ بھاگ گیا اس اندھیرے سے ..... ہائے میرا ننھا سا دل، میرا مرجھایا ہوا پھول،" نور کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا اور ہر طرف اندھیرا تھا۔

جاوید سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔ اسے سکینہ کا مسکرانا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا بہت عجیب لگا۔ "سکینہ تم جلدی اچھی ہو جاؤ ......"

"اچھی، کیوں؟" سکینہ چلائی "جانتی ہوں میں مردہ بچے کی ماں ہوں، چلے جاؤ!"
جاوید اٹھا اور باہر نکل گیا۔ آنگن میں بڑی بی سکینہ کے مردہ بچے کو کلیجے سے لگائے رو رہی تھیں۔ جاوید نے دوسرے آنگن کے دروازے پر قدم رکھا ہی تھا کہ وہی چیخ سنائی دی جو اس نے حویلی میں پہلی رات سنی تھی۔ یہ چیخ تھی یا قہقہہ۔ جاوید لرز گیا!
اس روز صبح سے شام تک جاوید کو ہلکی ہلکی حرارت رہی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں، اب اُسے ہر ہفتہ دس دن بعد حرارت ہو جاتی تھی اور سینے میں کوئی چیز چٹکیاں بھرتی رہتی تھی۔ اس روز اس کی آنکھوں میں سکینہ کے بچے کی بھولی بھالی صورت پھرتی رہی۔ اس کی اُجلی پیشانی پر نیلا نشان تھا جیسے کسی نے بڑی بے دردی سے گھونسہ جڑ دیا ہو۔ اس کے کانوں میں بار بار جنگل کی سرگوشی اُبھرنے لگتی ...... "میں بھاگنا چاہتی ہوں ...... آؤ بھاگ چلیں ......" وہ سر جھٹک دیتا ...... اُف یہ سب بھاگنا چاہتے ہیں نرگس بھاگنا چاہتا ہے۔ سکینہ بھاگنا چاہتی ہے۔ میں بھاگنا چاہتا ہوں۔ میں کس چیز سے بھاگ رہا ہوں۔ ...... اپنے آپ سے ...... شاید، وہ دن بھر اناپ شناپ سوچتا رہا اور اپنے آپ سے اُلجھتا اور لڑتا رہا۔
شام کے وقت اس کے سینے میں جلن ہونے لگی۔ اسے ایک دو بار کھانسی بھی آئی۔ غضب کی ٹھنڈک تھی۔ ہر چیز ٹھٹھر رہی تھی۔ درخت تک جمتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ہلکی گرم پتلون اور کوٹ میں پھولوں کی کیاریوں کے پاس ٹہل رہا تھا۔ کلیا اپنی محنت کے رنگین معجزوں کے درمیان اپنے ڈاکٹر کو ٹہلتے ہوئے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ دوڑا ہوا گیا اور مرلی اٹھالی۔ شام ایک اداس نغمے میں ڈھل گئی۔ جاوید نے سگریٹ کے دو تین کش لئے۔ اس کے گلے میں سرسراہٹ ہوئی اور زبان پر نمکین سا مزا محسوس ہوا ...
جب دوبارہ اس کا منہ بھرا تو ڈاکٹر کی تیز حس نے بتا دیا کہ اس کا منہ خون سے بھرا ہوا ہے۔

وہ اپنے کمرے میں گیا تو جنگلی اس کو دیکھ کر زور سے چیخا ...... "یہ کیا؟"

"کچھ نہیں!" جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ پرسکون تھی مگر اس کے ہاتھ اور پیر کانپ رہے تھے۔

اسے پھر ابکائی آئی۔ جنگلی نے اگالدان بڑھا دیا ۔۔۔ "کھون ۔۔۔۔ کھون!" جنگلی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا اور خاموشی سے وہاں سے چلا گیا ۔۔۔۔۔۔۔ "چلو کہانی ختم!"

جاوید دیر تک بیٹھا روز کی تصویر کو گھورتا رہا۔ جس پر گرد کی موٹی تہہ تھی۔ لیکن اس کی کانپتی ہوئی نگاہوں میں مسکراہٹ کی ایک کرن تڑپ گئی۔

جنگلی نے ٹھیک کہا کہانی ختم ہوئی!

دوسرے ہی لمحے وہ ایک جھونکے سے اٹھا اور میز کے قریب گیا، تصویر اٹھائی اور اس کے پرزے پرزے کر کے اگالدان میں ڈال دیئے۔ اس کی آنکھیں دیر تک جھکی رہیں جیسے چپکے چپکے رو رہا ہو۔ لیکن جب جنگلی گلاس میں پانی لے کر آیا اور اس نے چہرہ اٹھایا تو آنکھیں خشک تھیں اور سیپ کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے جنگلی سے گلاس لیا اور سر جھٹک کر بولا: "گھبراؤ مت۔۔۔۔۔ کہانی اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتی ۔۔۔۔ ذرا لالٹین کی بتی تیز کر دو ۔۔۔۔ اندھیرا اندھیرا سا لگ رہا ہے!"

وہ بستر پر گر گیا۔ لالٹین کی بتی تیز ہو گئی۔ لیکن کمرے میں اندھیرا چھایا رہا۔ وہ اپنی بیماری اور انجام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس خیال سے بہت لطف آیا ۔۔۔ یہ میٹھا میٹھا درد، یہ تنہائی، یہ سناٹا! اسے ذرا احساس نہ تھا کہ دروازے کی دراڑ سے جنگلی جھانک رہا ہے اور درود پڑھ پڑھ کر پھونک رہا ہے۔ جاوید ڈاکٹر تھا، جانتا تھا! سے بیماری کے جراثیم ماں سے ملے ہیں ۔۔۔۔ ماں، ماں! اسے محسوس ہوا کہ وہ اکیلا ایک تاریک راستے پر کالے کوسوں دور نکل آیا ہے۔ چلچلاتی دھوپ اسے جھلسے دے رہی ہے۔ ہر طرف سے جھکڑ چل رہے ہیں ۔۔۔۔ "ماں، ماں، تیرا آنچل کہاں ہے۔ میں اس چلچلاتی دھوپ سے بچنا چاہتا ہوں!" رات بھر اس کی آنکھ لگتی اور کھلتی رہی۔ آنکھ بند ہوتے ہی وہ ایک انجانے ریگستان میں بھٹکنے لگتا۔ لو کے تھپیڑے اسے کھانے کیلئے دوڑتے اور دور دور پانی نظر نہ آتا ۔۔۔ نہ درخت کا سایہ نہ دیوار کا۔ کبھی تلوار کی دھار کی طرح پانی کی لہر چمکتی، وہ لپکتا اور پانی کی لہر ریت کی لہر میں بدل جاتی۔ آنکھ

کھل جاتی۔ نوُس کی رات کی برفیلی ہوا کھڑکی پر دستک دیتی اور اس کے اوپر سے برف پگھلتے ہوئے سمندر کی دیو جیسی موج گزر جاتی اور اس کی چنگھاڑ اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہتی۔ اس کے سینے پر گھونسے برستے۔ اس کی روح جھنجھنے کی طرح جھنجھنا اٹھتی۔ وہ اٹھ بیٹھتا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیتا۔ ...... درد ...... درد ... پیاس ... درد ... درد ... ! اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ رات جائے دن آئے ! .... لگتا ہے یہ اندھیرا جنم سے سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ ہے۔ رات کب کوچ کرے گی۔ سورج کب نکلے گا !

اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک شعلہ سا لپکتا ہوا اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا۔ کتنا حسین کتنا گرم جسم تھا .... مہکتی ہوئی دوشیزگی ! اوس میں بھیگا ہوا سانس لیتا ہوا پھول ! اس نے ہاتھ بڑھایا، ٹھوڑی اٹھائی۔ کجلائی ہوئی آنکھیں کھلیں اور گہرے آسمان میں چمکتے ہوئے ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ فضا میں اُجالا ہی اُجالا پھیل گیا۔

جاوید کے ہونٹ کھلے اور بھنوروں کی طرح دو کانپتے ہوئے لبوں پر جھکے ... ستارے ٹکرائے اور روشنی کی بھیگی بھیگی گرم گرم دھند دو روحوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر افق کے اس پار پرواز کرنے لگی۔

لیکن یہ کیا ہے۔ کیا یہ وہی پھول ہے ؟ کیا یہ وہی شعلہ ہے ؟ یہ تو جلی ہوئی کچی لکڑی ہے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ دم گھٹتا جا رہا ہے۔ یہ لکڑی نہیں ہے۔ یہ تو وہی ہرن ہے۔ اس کی آنکھیں کس طرح تڑپ رہی ہیں اس کا تل سیاہ نہیں۔ یہ تو خون کی بوند ہے۔ یہ شعلہ اب کتنا زرد ہے ! اور اٹھتا ہوا دھواں بھی زرد ہے۔ سونے کی طرح زرد اور مٹی کی طرح بے چمک !

جاوید کی کئی راتیں اسی طرح کٹ گئیں۔ وہ سب کچھ بھول جاتا لیکن چوکڑیاں بھرتے ہوئے ہرن کی آنکھوں کی بے بسی اور ایک چھوٹے سے بچے کے سفید کفن کو نہ بھلا سکا۔ اکثر وہ خواب دیکھتا رہتا۔ لیکن یہ خواب بعض مرتبہ بہت بھیانک اور بے جوڑ ہوتے اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ خواب اس کا ماضی ہیں یا مستقبل۔

ایک دن شام کے وقت وہ اپنے برآمدے میں خاموش بیٹھا ان کیاریوں کو دیکھ رہا تھا جن پر بھونرے اڑ رہے تھے۔

وہ اپنی زندگی کے اور اپنی تنہائی اور سناٹے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ ایک بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے آپ پر ترس آیا۔ "لعنت ہے اس آدمی پر جو اپنے آپ پر ترس کھائے۔ مجھ سے تو بھونرے ہی اچھے ہیں!" وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

نرلیش چپکے سے آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ اسی طرح آکر اس کے پاس بیٹھتا تھا جیسے ڈر رہا ہو۔ وہ سر جھکائے۔ جھکائے ایک دو باتیں پوچھتا اور خاموش بیٹھا رہتا۔ کبھی ڈاکٹر کو دیکھتا۔ کبھی پھولوں کو ۔۔۔۔ بار بار ایک آواز گونج جاتی ۔۔۔۔ "ذرا اس آدمی کو دیکھو۔ کتنا بدل گیا ہے دیکھتے دیکھتے۔ انسان کی زندگی بھی کیا ہے۔ لیکن اب بھی اس اداس اور تھکے ہوئے نوجوان میں غضب کا کس بل ہے!" وہ اپنے دل کی آواز سنتا سر جھکتا ہوا اٹھتا اور چپکے سے ٹہلتا ہوا ہسپتال کے احاطے سے نکل جاتا۔

"جاوید صاحب میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں یہاں سے چلے جایئے!" نرلیش نے بیٹھتے ہی سانس روک کر کہا۔ جاوید کو اس کی آواز میں اجنبیت محسوس ہوئی۔ اس نے آہستہ سے گردن گھمائی ۔۔۔ "کیوں؟"

"آپ یہاں تباہ ہو جائیں گے۔ عبدالجبار پاگل کتے کی طرح کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ آپ اب زیادہ دن اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتے!"

"میں کسی بھی طوفان کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔"

"اگر آپ کتے کی موت مرنا نہیں چاہتے تو یہاں سے چلے جایئے! میں آپ کا دوست ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں۔ تیز روشنی دینے والے بہت سے چراغوں کو بجھتے دیکھا ہے میں نے! آپ کتنے بھی ضدی کیوں نہ ہوں۔ لیکن جہنم کی آگ موم سے نہیں بجھتی!"

جاوید نے بپھری ہوئی نظروں سے اسے دیکھا! "چلے جاؤ!"

نرلیش نے اس کو گھور کر دیکھا اور اچانک اٹھ کر تیز قدموں سے چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ جاوید کو محسوس ہوا کہ اس وادی میں اس کا آخری دوست بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے ہلکی سی کھانسی آئی اور ایک بار پھر محسوس ہوا کہ ستار کا تار ٹوٹ گیا۔ وہ دم بخود ایک گھنٹہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ جنگلی بار بار آتا اور جھانک کر اسے دیکھ لیتا۔ اس نے بولنا بالکل

بند کر دیا تھا۔ وہ اب صرف اشاروں میں بات کرتا تھا۔ جاوید کو اس شکست خوردہ خاموشی سے اور بھی گھٹن اور تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

اچانک اسے پیروں تلے سے زمین ریت کی طرح بھاگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کلکتے سے واپس آکر پورے چھ مہینے بڑے عذاب میں کاٹے تھے۔ اس کے راستے میں قدم قدم پر کانٹے بچھائے گئے۔ لیکن وہ لہو لہان پیروں سے بھی اسی طرح چلتا رہا۔ وہ گاؤں گاؤں جا کر مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا علاج کرتا۔۔۔ کسی کے دل کا درد دور کیا، کسی کے سینے میں پھنسا ہوا دھواں پگھلایا، کسی کی آنکھوں کی جلن کو ٹھنڈک اور سکون میں بدلا۔ اسے وہ شام یاد آئی جب وہ گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑے آہستہ آہستہ پہاڑی کے کنارے کنارے بڑھ رہا تھا۔ وہ دن بھر کی تھکن کے بعد تیز ہوا کے بڑے بڑے گھونٹ پینا چاہتا تھا۔ اچانک پہاڑ کے اوپر سے ایک چٹان لڑھکی۔ اس نے سر اٹھایا اور کچھ انسانی سائے ایک طرف ہٹتے ہوئے نظر آئے۔ چٹان راہ کی ایک بہت بڑی چٹان سے ٹکرائی اور آکر گھوڑے سے چند قدم کے فاصلے پر گری۔ گھوڑا ہنہنایا اور راستہ کاٹ کر شکری ندی کی طرف سرپٹ بھاگا۔ لیکن اب ایک دوسری ہی چٹان تھی جو اندر ہی اندر آ رہے کچلے ڈال رہی تھی۔

"میں پاگل کتے سے نہیں ڈرا۔ میں لڑھکتی ہوئی چٹانوں سے نہیں ڈرتا۔ اب میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں۔ میں خود ایک بھیانک خطرہ بن گیا ہوں۔ خون تھوکتا ہوں۔ میں اب اپنے مریضوں کا درد کیا دور کروں گا۔ اب تو میرا وجود ان کے لئے زہر ہے! اب میں مرتے ہوؤں کو نہیں جلا سکتا۔ ختم ہوئی مسیحائی!"

وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی لپکی اور کوارٹر کے اندر تک کسی کی طرح روتی چلی گئی۔

"روؤ .... روؤ .... اب مجھے آنسوؤں کی ضرورت نہیں!"

وہ اپنے پلنگ پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے اپنی ٹھنڈی انگلیوں سے گرم گرم نبض دیکھی۔ "چل رہی ہے! ہونہہ!"

کلیا نے بانسری کی تان اڑائی۔ دوسری طرف جہاں شکر مل بن رہی تھی وہاں عورتوں

نے ایک درد انگیز گیت چھیڑ دیا ۔۔۔ برہا کی رات آوازوں اور بولوں میں ڈھل کر لہو کی گرم بوندوں کی طرح اس کے دل میں ٹپکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"جنگلی؟" جاوید نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پکارا۔

"ہاں جاوید میاں ۔۔۔۔۔" وہ تو دروازے کی اوٹ ہی میں کھڑا تھا۔

"کاغذ اور قلم دو ۔۔۔۔۔"

"کیا لکھو گے ۔۔۔۔۔؟"

"اپنی موت کا پروانہ ۔۔۔۔۔" وہ اپنی شکست کی آواز سن کر جھنجھلا گیا ۔۔۔۔

جنگلی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے کاغذ اور قلم بڑھا دیا۔ جاوید نے لالٹین کی روشنی تیز کی اور بہت آہستہ آہستہ انگریزی میں جیرمین کے نام خط لکھنا شروع کیا ۔۔۔ جنگلی منہ کھولے اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتا رہا۔

کلیا کی بانسری کی تان اور بیلداریوں کا لہکتا ہوا گیت جاڑے کی سرد اور اندھیری رات کا دل گرماتا رہا۔

24

ریشمیں پردہ ہوا کے زور سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ پردہ اڑتا تو صبح کا نرم نرم دھندلکا اندر جھانک کر غائب ہو جاتا۔ عبدالجبار نے کڑکڑاتی ہوئی سردی کی وجہ سے وضو کرنے کے بجائے مٹی کے تودے پر ہاتھ مارا جس میں کعبہ شریف کی ریتیلی مٹی بھی ملی تھی۔ نماز فجر ادا کرنے کے بعد اس نے اپنی نئی نویلی بھرکلہ داڑھی کا نظارہ کیا۔ لیمپ کی روشنی تیز کی پھر بھی

اسے اپنے چہرے پر وہ روحانی نور جھلکتا نظر نہ آیا جو اس کے باپ کی تصویر سے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی ضو کی طرح پھوٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اتنے ریاض کے بعد بھی اب تک اس کی پیشانی پر گھٹے کا دور دور نشان نہ تھا۔ اس نے سوچا رنگ ہی اتنا زیادہ سیاہ ہے آخر سجدے کی پرنور سیاہی ا جاگر ہو تو کیسے! وہ دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے روزہ نماز، پیر فقیر اور دین دنیا کی باتوں سے اپنے خیال میں اپنے چاروں طرف ایک پاک فضا کا جالا سا بن دیا تھا۔ وہ چلتا تو جالا بھی ایک بلوریں تابوت کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلتا۔ وہ ٹھہرتا تو تابوت بھی ٹھہر جاتا۔ اب وہ روزانہ اپنے باپ کے مزار پر جاکر پھول چڑھاتا درود بھیجتا اور پچھتاوے اور توبہ کے آنسوؤں سے اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ آنے والی سات پشتوں کے گناہ بھی دھوتا۔ اس نے پیرس کی شہوت انگیز تصویریں اور مقوی باہ معجون کی بوتلیں پھنکوا دی تھیں، اور تہہ خانے کے دروازے پر ایک بڑا سا تالا لگا دیا تھا۔ جب دل میں ایمان کی شمع جلتی ہے تو کچھ دروازے کھل جاتے ہیں اور کچھ دروازوں پر قفل پڑ جاتے ہیں۔ بہت سی بجتی ہوئی زنجیریں خاموش ہو جاتی ہیں۔ بہت سی خاموش زنجیریں بجنے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی زنجیروں کی گونج سے وہ ڈر جاتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ ایک پورا قافلہ سا تپتے ہوئے ریگستان میں پابہ زنجیر گھسٹ رہا ہے۔ "میں بھی ہوں ان گنہگاروں میں!" وہ سوچتا اور واجب اور فرض کے علاوہ نفلیں بھی پڑھنے لگتا۔ لیکن نیک چلنی اور خدا ترسی کے یہ سارے حربے بیکار گئے۔ ایک ناقابل تسخیر قوت تھی جو اسے کھل رہی تھی۔ اس کی حالت بڈھے شیر کی سی تھی جس کے سارے دانت جھڑ چکے ہوں۔ وہ دل ہی دل میں کہتا۔ لوگو مجھے دیکھو اور عبرت پکڑو۔ سارے پاپ کرو مگر باپ کو زہر نہ دو۔ جتنی مچھلیاں چاہو پیٹ میں اتار لو مگر مچھلی پھنسانے والی بنسی خود۔ نگل جاؤ ۔۔۔۔ بس یہی ہے زندگی کا راز!" وہ گھنٹوں یوں ہی بڑبڑاتا رہتا۔ ملازم سمجھتے اس پر وجد کا عالم طاری ہے۔ "اے خدا تیرے بھی کھیل نیارے ہیں!" کسی بڈھے ملازم کے منہ سے نکلتا اور وہ اپنی عاقبت کے بارے میں سوچنے لگتا اور تب اسے مالک کے تلوے سے تسنیم و کوثر کا چشمہ پھوٹتا نظر آتا۔

نور اور وجدان کے اسی طوفان میں ایک اور طاقت بھی سر اٹھاتی ہوئی نظر آتی۔ اب

سرکار کے سوتیلے بھائی خاموشی کی کینچلی سے نکل آئے تھے ایک دن تینوں سرکار کے سامنے آئے اور دو زانو ہو کر تخت پر بڑے ادب سے بیٹھ گئے۔ ان میں سرکار کا وہ پہنچا ہوا بھائی بھی تھا جو خود کو مخدوم اجمیری کہتا تھا اور افیون کھا کر غنے میں کھٹا کھٹ تسبیح کھٹکھٹاتا رہتا تھا۔ "سبحان اللہ! سبحان اللہ!"

سرکار نے داڑھی کھجاتے ہوئے، بڑی نشیلی نظروں سے اپنے مؤدب۔ شریف اور بے زبان بھائیوں کو دیکھا جن کو اس سے آنکھ برابر کرنے کی تاب نہ تھی۔ لیکن انہوں نے آنکھیں جھکائے۔ جھکائے وہ پتے کی باتیں کہیں کہ سرکار کو پسینہ آگیا۔

"خدا سے ڈرو تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں سرکار..." مخدوم اجمیری نے مراقبے سے نکلتے ہوئے اور چونے اور پان سے سڑے ہوئے دانتوں پر زبان کا تازہ لعاب پھیرتے ہوئے کہا" بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے اس کے کپڑے چھوٹے ہوتے جاتے ہیں اور ماں باپ اس کے لئے بڑے کپڑے سلوا دیتے ہیں۔ تم ہمارے مائی باپ ہو، چادر چھوٹی پڑ رہی ہے...... کچھ کرو۔ ابا کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے ہمیں تھوڑی تھوڑی زمین دو۔ اتنی کہ سر اور پاؤں دونوں چھپ جائیں!"

"تم تو واقعی پہنچے ہوئے مخدوم معلوم ہو رہے ہو! میاں کیسی باتیں کرتے ہو؟ ابا نے تمہارے لئے جو چھوڑا تھا تمہیں مل گیا۔ اب اور کیا چاہیے؟ ارے چار چار محل کیوں بسائے تم لوگوں نے! اور پھر حویلی کی ماماؤں کے حرامی بچوں سے حویلی کو بھر دیا ہے! خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ شرم کرو خیر تم لوگ جاؤ میں سوچوں گا مرحوم کی روح کو خوش کرنے کے لئے تمہیں کچھ نہ کچھ دے دوں گا۔"

سرکار کی باتیں سن کر مخدوم کی تسبیح لرز گئی۔ پھر مراقبے میں جاتے جاتے مسکرایا.....

"یہ آپ فرما رہے ہیں سرکار..... گلبیا کو مرے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا۔ لو صاحب... نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی!"

تینوں بھائی آداب بجا لائے اور ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے ہوئے چوہوں کی

طرح اپنے اپنے بل کی طرف چل دیئے۔ عبدالجبار بپھری ہوئی نظروں سے انہیں غائب ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لیکن وہ اس اچانک حملے سے بالکل چت ہو گیا تھا۔ اس نے تو یہ دیوار .... کچی مٹی کی یہ دیوار بے پروائی سے یونہی چھوڑ دی تھی۔ اور لو اب ان کمبخت بھائیوں نے اسی طرف سے بلہ بول دیا تھا۔ اب کیا کروں!" فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ اسی طرح سوچ رہا کہ اچانک منشی تنگے سر ہانپتا ہوا آیا۔

"سرکار غضب ہو گیا!"

عبدالجبار نے ایک ہی جھٹکے سے سارے خیال اپنے ذہن سے نکال دیئے اور تسبیح اٹھا لی۔ اس نے چونکی ہوئی نظروں سے منشی کے بدحواس چہرے کی طرف دیکھا جس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

"چیرمان کے تین آدمی ...... اور اپنے چار گھائل ہو گئے۔ سب کی حالت غیر ہے۔ جگوا سالہ تو اب تب ہو رہا ہے۔ وہ جی سے لڑا ہی نہیں حرامی! سرکار، لگتا ہے اس کی مٹھی گرم کر دی گئی تھی۔" مٹھی کا لفظ منہ سے نکلتے ہی اس کی اپنی ہتھیلیوں میں کھجلی ہونے لگی۔

"یہ کون پوچھ رہا ہے کہ کتنے آدمی کٹے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے آدمیوں نے درخت کاٹے یا نہیں؟"

"درخت تو سرکار، چیرمان کے آدمی کاٹ لے گئے!"

"دور ہو جاؤ!" عبدالجبار نے تسبیح فرش پر دے ماری۔ صندل کے دانے بکھر گئے۔ منشی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور زینے سے لڑھکتے لڑھکتے بال بال بچا۔ کسی نے پوچھا: "کہاں بھاگے جا رہے ہو منشی جی؟"

"ہسپتال اور کہاں؟" اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔

عبدالجبار ٹہلتا رہا اور دونوں بازو کٹے ہوئے درخت کی موٹی موٹی شاخوں کی طرح ہلتے رہے۔ جب کبھی پاؤں تسبیح کے دانے پر پڑتا تو وہ لرز جاتا۔ جیسے اس کے تلووں میں کانٹے چبھ گئے ہوں۔

اس کو اپنی زندگی ایک بڑے سے جہاز کی طرح نظر آئی۔ سمندر میں طوفان تھا۔ کالی کالی

موجیں منہ پھاڑے ہوئے اژدہوں کی طرح جھپٹ رہی تھیں۔ آسمان میں ایک ستارہ نہ تھا۔ ہیرے جواہر اور دنیا کی نت نئی دولتوں سے لدا ہوا جہاز ڈوب رہا تھا۔ "...... دوڑو ..... بچاؤ ......" لیکن اس کو معلوم تھا کہ کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ اب نہ کوئی سنگی تھا نہ ساتھی۔ کرن سنگھ بھی نہیں وہ تو چیرمین کے سامنے ہاتھ باندھے کہہ رہا ہوگا ......: "گھبرائیے مت سرکار جب تک کرن سنگھ کی جان میں جان ہے آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ آپ کے حرامزادے دشمن کو ایسا مزا چکھاؤں گا کہ حرامی کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا!"

اس کی شراب کی بھٹی کے خلاف شہر میں جعلی مقدمہ کھڑا ہو گیا تھا اس کے گرداب سے بھی نکلنے کی امید نہ تھی۔ وہ بڈھا ڈپٹی نصیرالدین شہر میں بھی رشوت دینے میں بڑا استاد تھا رشوت سے بھڑکتی آگ پر تیل کا کام لیتا تھا۔ عبدالجبار بھی دوڑ میں شریک تھا۔ مگر اب اس میں وہ دم خم، وہ جوڑ توڑ، وہ داؤ پیچ کہاں تھا! کیا کروں ڈوبنے دوں جہاز کو؟"

"خبردار جو جہاز ڈوبا ......" باپ کی کانپتی ہوئی آواز ابھری تو وہ باپ کی تصویر کے آگے گر پڑا ..."وعدہ یاد نہیں رہا بیٹے؟"

"یاد ہے، یاد ہے ابا! اپنا ایک ایک گناہ یاد ہے لیکن۔ یہ جہاز تو ڈوب کر رہے گا اس میں ایک ایک ہیرے کے ساتھ سو سو گناہ لدے ہوئے ہیں ... گناہوں کے اس جہاز کو ڈوبنے سے کون بچائے گا!"

"کوئی نہیں ......" کیسی گھن گرج تھی اس آواز میں ...... "کوئی نہیں" جیسے آسمان کے گنبد میں توپیں دغ رہی ہوں۔

ہسپتال میں سات زخمی ایک ہی قطار میں پڑے ہوئے تھے۔ چند بیہوش تھے، چند کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ان کے زخموں سے خون رس رہا تھا جیسے ان کی زندگی اپنے تمام جادو کے ساتھ قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہو۔

جاوید اور درگا پرشاد نے مرہم پٹی کر دی مگر کمرے میں ان کے لئے جگہ کافی نہیں تھی۔ انہیں برآمدے میں ہی لٹا دیا گیا تھا۔ منشی نے پرمیشر سنگھ کو ہسپتال آتے دیکھا تو دم دبا کر ایک طرف چلدیا۔

پرمیشر سنگھ کا چہرہ سرخ تھا زخموں کے نشان میں ابھی تک چمک باقی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو کلیجے سے لگالیا۔ "کیا بتاؤں ڈاکٹر کیسا رن پڑا ہے آج!" اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکلتے ہوئے جاوید کو لگا کہ پرمیشر سنگھ نشے میں دھت ہے لیکن اس کے منہ سے بو تو نہیں آ رہی تھی۔

"میں کہتا ہوں ڈاکٹر تم کو گھن لگ گیا ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے!"

"پرمیشر سنگھ میں ڈاکوؤں سے مشورہ نہیں لیتا..... تم چلے جاؤ یہاں سے!"

پرمیشر سنگھ نے چمکتی ہوئی تیز آنکھوں سے اسے دیکھا۔ گھنی مونچھوں سے چاندنی جیسی دوستانہ مسکراہٹ چھن رہی تھی۔ "تمہارے بھلے کو کہتا ہوں۔ اب اس جنگل میں آگ لگ چکی ہے اور جب آگ لگتی ہے تو پھیلتی چلی جاتی ہے۔ جھلستے جنگل میں شیشم بھی جلتا ہے اور ببول بھی کچھ بھی نہیں بچتا۔ کچھ بھی نہیں! دیکھتے نہیں یہاں شکر مل بن رہی ہے۔ عبدالجبار پاگل ہو رہا ہے ......" وہ تیزی سے گھوڑے پر بیٹھا اور شکری ندی کی طرف والی ڈھلان پر جنگل کے پیچھے غائب ہو گیا۔

رات آئی۔ جاوید کے سینے کا درد بڑھ گیا۔ وہ زخموں کی رپورٹ لکھنے کے بعد ہسپتال کے آگے ٹہل رہا تھا۔ فوجداری کے زخمی ایک دوسرے کے پاس پڑے کبھی آہستہ آہستہ کراہتے، کبھی بڑبڑاتے اور کبھی زور زور سے گالی گلوج پر اتر آتے۔

پھر سناٹا چھانے لگا۔ ایک درد بھری کراہتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہم سب مر جائیں گے پیڑ کٹ گئے۔ پیڑوں کے ساتھ ہم بھی کٹ گئے۔ پیڑ چولھوں میں جل جائیں گے اور ہم ......"

"ہم بھی جل جائیں گے ......" دوسری آواز پہلی آواز سے زیادہ جوان اور جوشیلی تھی ... "ہم بھی جل جائیں گے ...... اور یہ حرامی آگ تاپیں گے!"

جاوید کی آنکھوں میں ابھری ہوئی زمین سے بھالے اور برچھیاں چمک اٹھیں جہاں شکر مل کی نیو کھد رہی تھی۔ چنگاریوں کی طرح گیت کے بول اڑے اور ہسپتال کی دیواروں سے ٹکرا گئے۔ جاوید رات بھر ان زخمیوں کے بارے میں سوچتا رہا جن کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔

"شاید بچ جائیں:" اسے کھانسی آئی اور اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اچانک دور جنگل کے ایک طرف شکری ندی کے پار پہاڑی کی گود میں ایک سنہرا پھول کھلا... آگ کا پھول... اس پھول سے سینکڑوں پنکھڑیاں اڑیں اور پہاڑی کی گود جل اٹھی... چیخ پکار مچنے لگی جیسے شکری ندی کی موجوں میں آگ لگ گئی ہو اور ندی چیخ رہی ہو۔

درگا پرشاد ٹھٹھرتا ہوا رضائی لپیٹے ہوئے آیا۔ "ارے آپ جاگ رہے ہیں؟"

"ہاں یہ... سب کیا ہے کمپونڈر صاحب؟"

"پرمیشر سنگھ کا بدلہ۔ سرکاری کٹھری جل رہی ہے۔ برسوں کی قسم پوری ہوئی:" جاوید صبح تک اس آگ کو دیکھتا رہا اور اپنے سینے کی آگ کو دبانے اور بھولنے کی کوشش کرتا رہا۔

25

"میں ایک خطرہ ہوں:"

پو پھٹ رہی تھی۔ جاوید آہستہ آہستہ شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر ٹہل رہا تھا وہ چلتے چلتے سورج مکھی یا رات کی رانی کے پودوں کو چھیڑ دیتا اور آنسوؤں کے ہزاروں موتی ٹپ ٹپ زمین پر گر کر بجھ جاتے۔ گھاس پر جمی ہوئی اوس پر اس کے قدموں کے نشان نے ایک ہری ڈگر سی بنا دی تھی۔ اس کے منہ سے گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے ہتھیلیوں کو ملتے ہوئے ایک بار پھر سوچا۔ 'میں ایک خطرہ ہوں!' اس خیال سے اسے بہت تکلیف ہوئی۔

'اب میں یہاں نہیں رہ سکتا!..... یہ جنگل یہ وادی..... یہ گوری گوری صبح، یہ سانولی

سانولی شام ..... نیلے آسمان میں اڑتے ہوئے یہ بگلے اور مرغابیاں ..... گاتی اور جھومتی ہوئی ہوائیں ..... یہ سکون، یہ اتھاہ خاموشی، اتھاہ تنہائی ..... یہ شکری ندی، مریضوں کی آہ اور کراہ ..... سیکڑوں مریض مرد، عورتیں، بچے ..... یہ بچے مرجھائے ہوئے بیلے اور چنبیلی جیسے ..... پھولے پھولے پیٹوں اور پیلی پیلی آنکھوں والے یہ ننگے اور بھوکے بچے ان کی سہمی سہمی مائیں، جن کے آنچلوں میں دنیا بھر کی ممتا بھری تمنائیں مہک رہی ہیں اور آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی ہے، کیا یہ جنگل، جنگل کی یہ پوری دنیا چھوٹ جائے گی ..... سب کچھ؟ اس کے سوا میرے پاس اور رہ ہی کیا گیا تھا؟ یہ بھی نہیں رہا تو کچھ بھی نہیں رہا، مگر میں ایک خطرہ ہوں ..... اب یہاں نہیں رہ سکتا۔"

اس کا دل لبالب بھرے ہوئے پیالے کی طرح چھلکنے لگا۔ اس نے سرمئی چٹانوں سے آگے ہرے بھرے جنگل کے سائے میں بہتی ہوئی شکری ندی کے اس پار پہاڑی کی طرف دیکھا جہاں پچھلی رات آگ کا گل زار کھل اٹھا تھا اب وہاں دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔

ہسپتال میں مریض اکٹھے ہونے لگے۔ لیکن وہ اسی طرح اپنے کوارٹر کے برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی ہاتھ پہلو میں لٹک جاتے، کبھی دونوں پشت پر بندھ جاتے، کبھی وہ ہونٹ بھینچ کر پیشانی سہلانے لگتا۔ "اب میں اس خطرے کو کہاں لے جاؤں؟"

نریش تیزی سے اس کے پاس آیا۔ وہ کئی دنوں سے نہیں آیا تھا۔ ایک آدھ بار راستے میں ڈاکٹر کی نظر بھی پڑی تو وہ کترا کر نکل گیا۔ شاید روٹھا ہوا ہے؛ جاوید یہ سوچ کر بڑی تلخی سے مسکرایا تھا۔ لیکن اس وقت جب چپکے سے آکر اس نے جاوید کے ہاتھ میں ایک نیلا لفافہ پکڑایا تو جاوید نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

"کس کا خط ہے؟" وہ بار بار سوچ رہا تھا ..... کبھی دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، کبھی درخت سے گرے ہوئے پیلے پتے کی طرح خلا میں اڑنے لگتا۔ وہ جانتا تھا یہ کس کا خط ہے؟

جاوید کو اتنے زور سے کھانسی آئی کہ وہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ نریش نے اسے سہارا دیا مگر وہ اٹھ نہیں سکا۔ زبان پر پھر کوئی نمکین سی چیز تیرنے لگی۔ اس نے سر جھکا لیا اور مسکراتے ہوئے تھوک نگل گیا۔

"نزیش، مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے!" اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے نیلا لفافہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"جانتا ہوں!" نزیش سر اٹھاتے ہوئے سورج مکھی کو دیکھنے لگا۔ اس نے زور سے سانس لی اور دھیرے سے بولا "میں نے بہت سے ضدی دیکھے ہیں پر آپ سا پتھر نہیں دیکھا!"

نزیش خاموشی سے ہسپتال چلا گیا۔ جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا "فوجداری کے زخمیوں کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟" اور جاوید کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہسپتال کے زینے پر چڑھ گیا۔

"اسے مقتولوں اور شہیدوں سے اتنی محبت کیوں ہے؟" جاوید کھانسی روکتے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف گیا اور جنگی کو بھیج کر کمپونڈر درگا پرشاد کو بلوایا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے دیوار کے سہارے کھڑا تھا، انگلیوں کے نیچے وہی نیلا لفافہ چرمرا رہا تھا۔ جاوید نے کمپونڈر کی جھپ جھپ گرتی اور اٹھتی ہوئی پلکوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا: "میں ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ مریضوں کی دیکھ بھال آپ کا کام ہے۔ میں بیمار ہوں!"

درگا پرشاد نے کچھ دیر غور سے اسے دیکھا۔ اپنی عینک اتاری، عینک کے شیشوں کو منہ سے بھاپ چھوڑتے ہوئے اپنی بنڈی کے دامن سے صاف کیا اور چپ چاپ برآمدے سے باہر نکل گیا۔ جاوید کے دل کو کچوکا سا لگا۔ میں ہسپتال سے کترا رہا ہوں۔ زندگی سے کترا رہا ہوں، اس کا دل خون ہونے لگا۔ ہاتھ سینے پر چلا گیا، اس کی جیب میں لفافہ چرمرا رہا تھا۔ درختوں میں ظالم ہوا چیخ رہی تھی اور اس کے منہ پر سوئیوں کی بارش ہو رہی تھی لیکن وہ چلتا رہا جیسے نشے میں ہو۔ آخر ایک بہت اونچی سی چٹان پر جا کر بیٹھ گیا۔ نیلا لفافہ جیب سے نکالا اور جھجکتے جھجکتے چاک کیا۔

روز نے اپنی زندگی کا سب سے پیارا خط لکھا تھا۔ اس خط میں بڑی دوستی تھی، بڑا اپنا پن تھا۔ جاوید خط پڑھتا جاتا تھا اور روز کی خوبصورت تحریر آنسوؤں کی دھند میں ڈوبتی جاتی تھی۔

آخر میں روز نے لکھا تھا..... "جیوتی شہید ہو گیا، مگر اس کی یاد کا چراغ آج بھی جل رہا ہے۔ ہم جانتے تھے یہ آگ اور بارود کا کھیل ہے۔ کبھی نہ کبھی تو دھماکا ہو گا۔ سو ہوا۔ جیوتی

کے ساتھیوں کے بھی پرزے ہو گئے۔ سنا ہے تم بیمار ہو۔ رگھوناتھ تمہاری بیماری سے خفا معلوم ہوتا ہے۔۔ دوست بتاؤ کیا تم اب دوبارہ نہیں آؤ گے، اور کچھ نہیں تو آکر اپنا سوٹ کیس ہی لے جاؤ اس بہانے تم سے مل لوں گی۔" اس نے دو تین جملے کاٹنے کے بعد لکھا تھا۔
"ابا کی حالت اچھی نہیں ہے۔ وہ بھی تم کو یاد کرتے ہیں ۔۔۔۔"

جاوید نے خط ختم کرتے ہی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور چھوٹے چھوٹے پرزے نیچے شکری ندی کی لہروں میں پھینک دیئے کاغذ کے ٹکڑوں کو ہوا لے اڑی اور جاوید دیر تک ان بکھرتی ہوئی پنکھڑیوں کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا

"بس کھیل ختم ہوا،" وہ دانت بھینچ کر چٹان پر لیٹ گیا اور آسمان کے جگمگاتے ہوئے پرسکون نیلے سمندر کو دیکھا۔ وہاں کتنا سکون ہے۔ کتنا سناٹا ۔۔۔۔۔۔" اس کا سر چکرانے لگا۔۔۔ "کیا میں اس سمندر میں اپنی ناؤ کھے سکتا ہوں؟" اس نے کروٹ بدل لی اور بازوؤں سے آنکھیں چھپا لیں۔ "مجھے تو ہسپتال کا شور پسند ہے لیکن اب میں وہاں قدم نہیں رکھ سکتا!"

تھوڑی دیر میں روز کے خط کا خیال آیا، جیسے تیز دوڑتی ہوئی موج اچانک کسی بڑی چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹتی ہے۔

"جیوتی چلا گیا۔ وہ نوجوان تھا۔ اس آندھی میں آزادی کا چراغ جلانے نکلا تھا ۔۔۔۔۔ خود بجھ گیا۔ روز کا کیا حال ہوگا جیوتی کے بغیر کیسے زندہ رہے گی۔؟ اسے جیوتی کی ضرورت تھی۔ میں تو ایک کمزور اور بے جان نوجوان تھا، اس کے خوابوں کی تسکین کیسے کرتا!"

وہ دن بھر اسی چٹان پر بیٹھا اپنے ماضی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کبھی باپ نظر کے سامنے آتا ۔۔۔ وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا اس پار غائب ہو جاتا۔ کبھی روز بال لہراتی ہوئی آہستہ آہستہ ابھرتی۔ اس کی آنکھوں کی چومتی اور ہوا میں اڑتی ہوئی بادلوں میں کھو جاتی۔ وہ کبھی افق کی طرف ہاتھ بڑھاتا کبھی بادلوں کی طرف۔ جب گھنٹوں بعد آنکھیں کھولیں تو اس کو نیلا آسمان نظر نہ آیا۔ وہ ڈر گیا۔ شام کا دھندلکا درختوں سے کاجل کی طرح ٹپک رہا تھا۔ ٹھنڈک بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اوس گر رہی ہے۔ شام اور اوس! اس کو محسوس ہوا کہ درخت کا ایک ایک پتہ کجلائی ہوئی آنکھ ہے اور ہر آنکھ سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔

وہ آہستہ آہستہ جنگل میں چلتا رہا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ صرف اس کے قدموں کی آہٹ اور اس کے دل کی دھڑکن گونج رہی تھی۔ باغ کی چہار دیواری کی طرف مڑا تو اسے سکینہ کی کھڑکی روشن نظر آئی۔

اس کے قدم تھم گئے۔ وہ دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کی نظر اوپر اٹھی اور اس نے پچھواڑے والی چھت پر گھنے برگد کے سائے میں ایک دھندلا سایہ دیکھا۔

جاوید کا دل چاہا کہ دوڑ کر جائے اور اسے پکارے، سکینہ!، سایہ بہت دور تھا۔ لیکن جاوید کو قریب محسوس ہوا۔ بہت قریب اور بہت روشن جیسے شفق کی روشنی اس میں مجسم ہو گئی ہو۔

"تم کون ہو؟" شہد کی طرح میٹھی آواز گونجی۔

"مسافر"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"کیا معلوم..."

سایہ آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ ہرن کی تڑپتی ہوئی آنکھیں بھی اندھیرے میں کھو گئیں۔ جو ابھی ابھی اتنی قریب معلوم ہوئی تھیں...... زرد ہونٹ کے اوپر سیاہ تل جیسے کاجل کی بوند!

"اچھا تو یہی وہ آسیبی سایہ ہے جس کا اتنا چرچا ہے آج کل!"

رات کے وقت وہ بالکل اندھیرے کمرے میں بیٹھا رہا۔ جنگی لالٹین رکھ گیا لیکن اس نے لالٹین بجھا دی۔ اندھیرے میں اس کو زیادہ روشن روشن محسوس ہوتا تھا۔ جب درگا پرشاد اس سے بات کرنے آیا تب بھی اس نے لالٹین نہیں جلانے دی۔

"ڈاکٹر صاحب سات میں سے چار کی حالت بہت خراب ہے۔ بخار بڑھتا جا رہا ہے!"

"انجکشن لگایئے......"

"لگا چکا......"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

"اب انہیں موت سے لڑنے دیجئے۔ اگر دم خم ہوگا تو موت کے پیر اکھڑ جائیں گے۔"
تھوڑی دیر خاموشی رہی کمپونڈر کا ہاتھ اندھیرے میں عینک کی طرف اٹھا۔
"ڈاکٹر صاحب" پھنسی پھنسی بھرائی ہوئی آواز ابھری "آپ کے دوست........"
"کون دوست...."
"وہ رگھوناتھ جی...."
"کیا ہوا ان کو؟" جاوید کی آواز چنگھاڑ کی طرح گونج گئی۔
"کرن سنگھ گرفتار کر کے لے گیا......."

اس کے بعد کمپونڈر لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بہت کچھ بولتا رہا۔ لیکن جاوید خاموش رہا۔ اس نے کرسی کے ہتھوں کو زور سے دبوچ لیا تھا۔

"سالے کہتے ہیں وہ ڈاکوؤں سے ملے ہوئے تھے ان کے پاس غیر قانونی ہتھیار تھا۔ وہ تاج کے باغیوں کو ہتھیار دیتے تھے......" درگا پرشاد بولتا رہا پھر تھک کر دوبارہ فوجداری کے زخمیوں کو دیکھنے کے لئے ہسپتال کی طرف چلا گیا۔

اندھیرے میں کون دیکھتا کہ جاوید کی کنپٹیوں کی ہڈیاں کتنی ابھر آئی ہیں۔ آنکھیں کس طرح جل رہی ہیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آہستہ آہستہ رات کی سیاہی پر سنہرا سا پانی پھرنے لگا۔ تاڑ اور کھجور کے درخت انگڑائی لیتے ہوئے نظر آئے اور سورج مکھی کے پودے اور رات کی رانی کی ڈالیاں جھومنے لگیں۔

اس نے اٹھ کر لیمپ جلایا۔ اس کا چہرہ زرد تھا جیسے جسم سے ایک ایک قطرہ خون چوس لیا گیا ہو۔ اس نے لیمپ کی چمنی اتاری اور بہت سے خط جلا ڈالے۔ جب ڈائری کی باری آئی تو اس کے کان جل اٹھے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد آخر وہ ڈائری کے ورق نوچ نوچ کر جلانے لگا۔ لیمپ کی زبان کاغذ کو چاٹتی۔ کاغذ بھڑک اٹھتا اور کئی زبانیں لہرانے لگتیں۔ ان کے تیز عکس سے جاوید کی آنکھوں اور چہرے میں ایک عجیب آتشیں چمک پیدا ہو جاتی۔ وہ آخری ورق کو دیر تک گھورتا رہا اس کی آنکھوں سے دھواں سا اٹھنے لگا اور ہونٹ کانپنے لگے۔
"پھوارو اور روشنیو تمہارے سوا اور کوئی بھی اس اجڑی ہوئی قبر پر آنسو بہانے نہ آئے گا....

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔"لو آخری تار بھی ٹوٹ گیا!"

اس نے دونوں ہاتھوں کو عجیب بے بسی سے ہوا میں جھٹکے دیئے پھر چاروں طرف دیکھا۔ آنگن میں نکلا اور رُک کر خاموش کھڑا ہو گیا جیسے کسی کے قدموں کی آہٹ سُننے کی کوشش کر رہا ہو۔"ہونہہ اب کون آئے گا یہاں؟ کوئی نہیں!"

البتہ جنگلی کے خرّاٹوں کی آواز اندھیرے میں اُبھری رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔ گرم کوٹ پہنا۔ گلے میں مفلر لپیٹا اور چپکے سے دروازہ کھول کر نکل گیا۔

باہر کی بھیگی ہوئی فضا میں اسے کھانسی آئی لیکن اس نے منہ میں مفلر ٹھونس کر کھانسی کو دبا لیا اور آہستہ آہستہ اصطبل پہنچ گیا۔ گھوڑے پر زین کسی اور گھوڑا اس کے اشاروں پر برآمدے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

دھندلی دھندلی پُراسرار چاندنی میں ہر چیز جاوید کو گلے لگانے کو دوڑی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ رات کی رانی بکھر کے مہکی۔ پودے سرسرائے اور وہ گھوڑے کی زین پر بیٹھ گیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے خاموشی کا شیشہ چھلنی ہو گیا۔ زخمیوں کی کراہ گونج اٹھی۔ جاوید نے لگام کو جھٹکا دیا اور گھوڑا پتھریلے ڈھلان پر اُترنے لگا اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ سورج مکھی کے سائے میں کلیا کھڑا اس کے سائے کو غائب ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور بلک بلک کر رو رہا تھا۔

ندی کے کنارے بڑے سے پیپل کے بوڑھے گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر جاوید نے خود بخود لگام کھینچ لی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ وہاں بھی جہاں پچھلی رات آگ کے پھول کھل اٹھے تھے۔ جاوید کو کھانسی آئی۔ اور کھانسی کی جھنجھناتی ہوئی آواز شکری ندی کی خاموش لہروں میں چاندی کے سکون کی طرح ڈوب گئی۔ وہ سر جھکائے دیر تک لہروں میں چاندنی کو نکھرتے دیکھتا رہا۔ جنگل زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ دور اتھلی زمین پر اسٹیشن کے پاس جہاں شکر مل بن رہی تھی الاؤ جل رہا تھا اور ہوا میں گیت کی آخری تان تھرتھرا رہی تھی۔ ندی کی لہروں کی طرح۔۔۔۔اسے کچھ معلوم نہ تھا یہ ندی کہاں شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم؟ یکایک جاوید کی

آنکھوں میں چکا چوند سی مچ گئی۔ الاؤ بھڑکا اور سارا جنگل شعلوں میں غرق ہوگیا۔ درخت قہقہے لگانے لگے۔ اس قہقہے میں پرمیشر سنگھ کی آواز تلوار کی طرح شعلوں کو کاٹتی ہوئی ابھری اور ایک افق سے دوسرے افق تک تیرتی چلی گئی جب جنگل میں آگ پھیلتی ہے تو پھیلتی چلی جاتی ہے۔ جھلستے جنگل میں سب کچھ جل جاتا ہے ..... شیشم بھی جلتا ہے اور ببول بھی۔ کچھ بھی نہیں بچتا کچھ بھی نہیں،،

جاوید نے زور سے لگام کو جھٹکا دیا۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ دربار ہسپتال، شکر مل کا الاؤ، زخمیوں کی چیخ پکار، مسجد کے مینار، حویلی کی چھت پر منڈلاتے ہوئے آسیب، کلیا کی بانسری۔ بیلدارنیوں کا گیت ...... سب کچھ گرد کی طرح اڑتا ہوا چھوٹ رہا تھا۔ صرف چاند آگے آگے تیر رہا تھا۔ جاوید گھوڑے کی گردن پر جھک گیا۔

ٹاپوں کی آواز جنگلی وادی میں بھوتوں کی تالیوں کی طرح گونج اٹھی۔ پہاڑیاں دیر تک دھڑکتی رہیں اور چڑھائی پر دور چیختی ہواؤں میں الاؤ بھڑکتا رہا۔

○○

ناول کے بعد

ہوا کچھ یوں کہ میں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور، ایک اجنبی دیار میں، اچانک دل کا مریض بن بیٹھا۔ یہ دل کی بیماری تھی، عشق و عاشقی نہیں۔ جب ذرا جان میں جان آئی اور ڈاکٹروں سے اٹھنے بیٹھنے کی اجازت مل گئی تو میں سکون اور تنہائی سے بڑا اکتایا۔ میں صبح کو قفقاز کے برف پوش پہاڑوں سے جھانکتے ہوئے سورج کی کرنوں کو اپنے کمرے میں آتے اور پھر اسی طرح شام کی سنہری کرنوں کو سمندر کی نیلی لہروں میں جھلملاتے اور کھوتے دیکھتا رہا۔ بے بسی بہت جلاتی تو چپ چاپ جا کر خوبصورت بالکنی میں جا بیٹھتا، جہاں طرح طرح کی بیلیں سرسراتی رہتیں، اونچے اونچے سڈول سرو کے پیڑوں کو چھوتی ہوئی ہوائیں یوں گزرتیں جس طرح آنکھوں کو چھوتے ہوئے سپنے گزرتے ہیں۔ اپنی بالکنی سے دوسری بالکنیوں پر بیٹھے دوسرے دل کے مریض نظر آتے، مرد اور عورتیں، چاکلیٹ رنگ کے سینی ٹوریم یونیفارم میں۔ دائیں طرف ان بالکنیوں، ہری بیلوں، سرو کے پیڑوں، پھولوں کی بل کھاتی ہوئی کیاریوں سے آگے ہرے ڈھلان کے دامن پر بحیرہ اسود کی بیقرار موجیں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی آنکھوں میں چمکتیں، اور جب نگاہیں ان کا پیچھا کرتیں تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتیں۔ ان موجوں کا رنگ کبھی نیلا ہو جاتا، کبھی پگھلا پگھلا زمردیں۔ دوسری طرف پہاڑوں پر برف چمکا کرتی۔ گھنے پہاڑی جنگلوں سے ہوا کے نہ جانے کیسے جنوں خیز جھونکے آتے رہتے اور فضا میں اداس گنگناہٹ گھولتے رہتے۔ سمندر کے اوپر پگھلی ہوئی دھوپ افق تک تڑپتی رہتی۔ سمندر کا سانس اور منڈلاتے ہوئے سمندری بگلوں کی پرواز میری روح کو وہاں سے اڑا کر، ہزاروں میل دور، برسوں ادھر لے جاتے۔۔ یادیں، یادیں، یادیں ۔۔ وقت کے پیچ و خم اور حالات کے گرد و غبار میں کھوئے کھوئے رنگ، آوازیں،

خوشبو میں ...... چہرے، دھندلے دھندلے خطوط اُبھرتے۔ ہنستے ہوئے ہونٹ اور لہو روتی ہوئی آنکھیں ... یہ سارے خطوط جھلملاتے اور مجھے دور سے پکار کر ... صبح کے اُجالے میں گھل جاتے یا شام کے دھندلکے میں کھو جاتے اور میرا جی چاہتا، میں بھی ان ہی دھندلکوں اور روشنیوں میں کھو جاؤں۔

کبھی کبھی میرا دل کہتا ان یادوں میں کیا رکھا ہے؟ بہت جی تڑپا کہ ایسے سناٹے اور تنہائی میں اپنا ناول "خزاں کی موت" جو برسوں سے ادھورا پڑا تھا مکمل کر لوں۔ لیکن مسودہ کہاں تھا کہ اور چھور کا پتہ پاتا۔ ڈائری لکھنے لگا جو ایک بیمار اور مایوس انسان کی جذباتی اور رومانی خود کلامی بن گئی۔ اس دھندے سے بھی جی اکتا گیا۔ اس جنجال سے نکلا تو پھر یادوں کے سوتے پھوٹے اور میں یادوں کے منہ زور ریلوں میں بہہ گیا۔

گنے کے کھیتوں، دھان کی پکی ہوئی سنہری فصلوں، چھوٹے چھوٹے نالوں اور ندیوں، مسجد کے گنبدوں اور میناروں، کائی بھرے تالابوں، حویلیوں اور درباروں کی پرچھائیوں سے انسان ابھرنے لگے ...... دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے کے انسان، جن کو میں نے لڑکپن میں دیکھا تھا، جن کے درمیان پلا تھا، ایسے دیہاتوں، جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں، جہاں دور سے ریل کی پٹریاں تلوار کی طرح چمکتی نظر آتی تھیں اور ڈاک بابو بہت بڑا افسر معلوم ہوتا تھا، جہاں رات کو شیروں کی گرج اور گیدڑوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور کھڑکیوں سے دور، اندھیرے پہاڑوں پر جنگل جلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے ...... جہاں گاؤں کا زمیندار اڑتے ہوئے کبوتروں پر بندوق کا نشانہ آزمایا کرتا تھا، جہاں ایک امرود یا شریفہ چرانے کے جرم میں کمیروں کی کھال جوتوں سے ادھیڑ دی جاتی تھی، جہاں، جہاں ...... یہ پرچھائیاں زندہ ہو گئیں۔ پرچھائیاں جو لڑکپن میں محض پرچھائیاں تھیں۔ اب زندگی اور سماج کے بہت سے راز لے کر سامنے آ گئیں اور میں ان کی افسانوی دنیا میں کھو گیا۔ اس طرح میں نے یہ ناول لکھنا شروع کیا جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

جب میری نرس تاسیبا نے مجھے چھپ چھپ کر لکھتے دیکھا تو اس نے مجھے سمجھایا۔ جب میں نہ مانا تو اس نے ڈاکٹر سے جا کر کہا۔ ڈاکٹر نے چپ چاپ میرے کمرے سے ہر ممکن کاغذ

ہٹوا دیا۔ لیکن میں ناول لکھتا رہا کیونکہ میرے کمرے میں رائٹنگ پیڈس کی کمی نہ تھی جو میں نے اپنے مریض پڑوسیوں سے حاصل کئے تھے۔

جب ناول ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس ناول کے کردار میری زندگی کا حصہ ہیں، اس کی کہانی خود میری زندگی کی ان دیکھی کڑیاں ہیں۔ یہ کڑیاں اکثر تحت الشعور میں کھو جاتی ہیں۔ یہی کڑیاں، انسان کے سماجی اور نفسیاتی عمل اور ردِ عمل کی زنجیر بن جاتی ہیں، جن کی جھنکار شعور کے گنبد میں گونج اٹھتی ہے۔ یہ گونج مجھے اس وقت سنائی دی جب میں نے ناول کا مسودہ مکمل ہونے کے بعد دوبارہ پڑھا۔۔۔ اور "بے معنی" کردار اور واقعات، جن کو میں نے بچپن اور لڑکپن میں، کبھی حیرت سے اور کبھی ٹھنڈی بے نیازی سے دیکھا تھا، اب ایک نئی اور بھرپور معنویت کے ساتھ ابھر آئے تھے .... یہ تو ہے ایک ادبی، تخلیقی عمل کے محرکات کا پہلو... لیکن جہاں تک اس کی اپنی فنی سطح اور تکمیل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا فیصلہ پڑھنے والے کریں گے ..... وہ بھی جو اپنے تاثرات کا اظہار عالمانہ اصطلاحوں میں کرتے ہیں، اور وہ بھی جو سیدھے سادے الفاظ میں پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔

میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے کردار اور واقعات زندگی کے تجربوں سے لئے ہیں اور ایک خاص ماحول میں، ان کے آپسی رشتوں، ان کے باہمی عمل اور رد عمل کی مدد سے، ان کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انسان نہ تو بالکل "سفید" ہیں اور نہ بالکل "سیاہ" لیکن انسان کو پرکھنے میں، میرے اس رجحان کا اس ناول میں محض آغاز ہوا ہے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ ناول "پرچھائیوں کی وادی" اور "درد کا ساحل کوئی نہیں" جیسی کہانیوں میں یہ رجحان زیادہ واضح ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے ظاہر اور باطن کے تاریک اور روشن گوشوں کو سمجھے بغیر اس کی کہانی بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت زندگی کو اس طرح سمجھنے کی کوشش میری حقیر سی ادبی زندگی کی سب سے بڑی تلاش و جستجو اور جدوجہد ہے اور میری تحریر میں اسی جدوجہد کا اظہار۔ ○○○

عِلم اور عمَل

یاد رکھو کہ

عِلم کے ساتھ عمَل ضروری ھے

نہ عمَل کے بغیر عِلم نافع ھے اور نہ عِلم کے بغیر

عمَل نفع بخش ھے

جس عِلم کی پشت پر عمَل موجود نہ ھو

وہ عِلم جہل ھی کے زمرے میں شامل ھے

—— حضرت داتا گنج بخشؒ

کشفُ المحجوب سے

مونِس ودمساز

لکھو !
اور
اپنے علم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ
اور
جب وقتِ مرگ آئے تو اپنے
بچّوں کو
بطور میراث سپرد کرو
کیونکہ
جب فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ھے
تو بجُز کتاب
کوئی اور مونس و دمساز نہیں ھوتا.

امام جعفر صادق(رض)

ہماری اہم مطبوعات

افسانے:

کتاب	مصنف	قیمت
موسم عذابوں کا	علی امام نقوی	۸۰/=
غلام بخش اور دیگر کہانیاں	مشرف عالم ذوقی	۱۱۰/=
ونیس کا پھول	سہیل اعجاز صدیقی	۱۰۰/=
آئینے کی گرد	شکیل جاوید	۸۰/=
وہ دن	غیاث الرحمٰن	۸۰/=
ٹھہرے ہوئے لوگ	انجم عثمانی	۸۰/=
سوئی کی نوک پر رکا لمحہ	حسین الحق	۸۰/=
منڈی	مشرف عالم ذوقی	۱۱۰/=
ایک غیر مشروط معافی نامہ	خورشید اکرم	۶۰/=
کن فیکون	رضوان احمد	۹۰/=
جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب	جوگندر پال	۹۰/=
پوسٹر	قاسم خورشید	۶۰/=
سنگ اٹھانے کا حوصلہ	رضاء الجبار	۸۰/=
منڈیر پر بیٹھا پرندہ	احمد صغیر	۶۰/=
روتا ہوا آدمی	رئیس انجمی امروہوی	۸۰/=
راہ میں اجل ہے	زاہدہ حنا	۱۰۰/=
لیکن جزیرہ نہیں	تبسم فاطمہ	۶۰/=
دختر ابلیس	محمد شبیر علی محمودی	۶۰/=
ڈار سے بچھڑے	سید محمد اشرف	۱۲۵/=
پیاسا سمندر	عقیلہ تبسم	۶۰/=
ادھار کی زندگی	مہر چند کوشک	۵۰/=
کاغذ کی دیوار	محافظ حیدر	۸۰/=
دل کی بات	ڈاکٹر شبیر صدیقی	۶۰/=
بھوکا ایتھوپیا	مشرف عالم ذوقی	۱۱۰/=
گھٹتے بڑھتے سائے	علی امام نقوی	۸۰/=
برزخ	ہاجرہ شکور	۶۰/=
انتخاب افسانہ ۸۹ء	انیس امروہوی	۸۰/=
لمحوں کی قید	کشور سلطانہ	۸۰/=
یاد بسیرے	انور خان	۸۰/=

ناول:

کتاب	مصنف	قیمت
ذبح	مشرف عالم ذوقی	۹۰/=
بساط	علی امام نقوی	۹۰/=
یوں بھی کھلے پھول	اقبال دیپ	۸۰/=
بیان	مشرف عالم ذوقی	۱۰۰/=
شہر چپ ہے	مشرف عالم ذوقی	۸۰/=
آخری داستان گو	مظہر الزماں خاں	۸۰/=
نیلام گھر	مشرف عالم ذوقی	۹۰/=
فرات	حسین الحق	۱۰۰/=
پھول جیسے لوگ	انور خان	۶۰/=

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092